فہرست

باب سوم
جہاد کی کچھ اہم شرطیں اور قوانین

باب چہارم

اہل ذمہ یعنی اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری حقوق اور ذمہ داریاں

باب پنجم

جہاد کے نتائج

باب ششم

جہاد کی فضیلت اور دین میں اس کا مقام ومرتبہ

باب ہفتم

مجاہدین کے لئے اللہ کی غیبی مدد کا وعدہ اور اس سلسلے میں اللہ کی سنت اور قانون

باب ہشتم

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اسلامی شریعت کی روشنی میں

دیباچہ طبع سوم

اس حقیر راقم سطور کا دل اللہ کے حضور سجدہ ریز اور اس کے لئے تشکر و احسان مندی کے احساسات سے لبریز ہے کہ محض اس کے فضل و کرم سے اس کی تصنیفی کاوش ''الجہاد'' کو ایسی مقبولیت اور پذیرائی ملی جس کی اس کو توقع بھی نہیں تھی۔ دو سال کی مدت میں اس کے اردو کے دو ایڈیشن نکل گئے اور انگریزی میں بھی کتاب کا پہلا ایڈیشن یورپ کے لئے چھپا اور دوسرا دہلی کے ایک سیکولر مکتبہ سے چھپ کر ختم ہوا چاہتا ہے۔

اس دوران اہل علم نے کتاب کے متعلق زبانی طور پر جس قسم کی اطمینان بخش آراء ہی نہیں بلکہ استقبال و استحسان کے جن خیالات کا اظہار کیا اس کا سبب سوائے فضل خداوندی کے اور کچھ قرار دینا ناممکن ہے۔ ملک و بیرون ملک کے مجلات و جرائد نے کتاب پر جو تبصرے لکھے اس میں تقریباً اتفاق کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ ماضی قریب میں زمانے نے جو حیران کن کروٹ لی ہے اس نے اس موضوع پر ازسرنو ایسے اظہار خیال کی فوری ضرورت پیدا کردی تھی جو پروپیگنڈے اور اعتراضات کی مسموم فضا میں اسلامی جہاد کی ایسی وکالت کرے جو عقل و فطرت کے دلائل کی بنیاد پر بیک وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے اطمینان کا سامان بن سکے۔ اردو اور انگریزی ایڈیشنوں پر متعدد تبصرہ نگاروں نے یہ بات محسوس کی کہ اس کتاب کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ وہ پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ مسلمانوں کو

بھی مطمئن کرتی ہے اور غیر مسلموں کے لئے بھی اطمینان کا سامان رکھتی ہے۔

اس دوران بعض اہل علم نے توجہ دلائی کہ کتاب میں اہل ذمہ کے حقوق و ذمہ داریوں پر کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ خود مصنف کو بھی کتاب پر نظر ثانی کے دوران کئی ذیلی مباحث کے اضافے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس کے علاوہ اس کو ایک بات کا اور تجربہ ہوا (جو اس سے پہلے اپنی بھی اور دیگر اہل قلم کی تحریروں کے سلسلے میں بھی ہو چکا ہے)۔ اور وہ یہ کہ کسی نئے اور قابل فکر و توجہ پہلو کو اگر اختصار کے ساتھ بیان کر دیا جائے تو بسا اوقات ناظرین اس پر وہ فکر و توجہ نہیں کر پاتے جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں اصل کمی لکھنے والے کے اسلوب کی قرار دی جانی چاہئے کہ اس نے اپنی تحریر میں ایسا انداز کیوں نہیں اپنایا کہ قاری سبک خرامی کے دوران بھی متوجہ ہو کر رکے اور مسئلہ کے ان پہلوؤں پر ٹھہرے جو نئے غور کے متقاضی ہیں۔ اس تجربہ کی بنا پر کتاب کے نئی نوعیت کے مباحث میں (جو بفضلہٖ تعالیٰ کافی ہیں) کہیں اسلوب میں تبدیلی کرنی پڑی، کہیں اختصار کی تفصیل ضروری معلوم ہوئی اور کہیں احساس ہوا کہ دوسری آراء اور تعبیرات سے موازنہ کئے بغیر پوری وضاحت ممکن نہیں ہے۔

اس طرح کتاب میں اچھے خاصے اضافے ہو گئے۔ اور غور و فکر کے دوران کتاب کے مباحث کی ایک نئی ترتیب کی طرف بھی رہنمائی ہوئی جس سے ان شاء اللہ کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگا۔ اب جو کتاب پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ کتاب کچھ کی کچھ ہو گئی، صفحات کی تعداد بھی دوگنی ہو گئی، اور مباحث و مضامین میں بھی اتنا اضافہ ہو گیا کہ اس کو ''الجہاد'' کا اضافہ شدہ ایڈیشن قرار دینے کے بجائے اس کا نقش ثانی کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔ اسی لئے اب اس کا نام ''جہاد کیا ہے؟'' رکھنا تجویز ہوا ہے۔

کتاب کے اولین دو ایڈیشن المعہد العالی للدراسات الاسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئے۔ ایک مسئلہ یہ سامنے آیا کہ کتاب کی پذیرائی اور طلب کے مطابق

ادارہ کتاب کی رسد نہیں کر سکا۔ متعدد بڑے شہروں سے یہ اطلاعات ملیں کہ کتاب باوجود کوشش کے نہیں مل رہی۔ اس وجہ سے احساس ہوا کہ دیوبند دینی کتابوں کا سب سے بڑا مرکز ہے اگر کتاب وہاں سے شائع ہو تو وہ کم از کم پورے ملک میں اہل شوق تک بآسانی پہنچ سکے گی۔ کتب خانہ نعیمیہ جو ملک کا ایک موقر نشریاتی ادارہ ہے کے ذریعہ ان شاء اللہ کتاب کی زیادہ وسیع اشاعت ہوگی۔

راقم سطور شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہے استاذ گرامی ومخدومی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم کا کہ انہوں نے اپنی تقریظ سے کتاب کی قدر میں اضافہ فرمایا۔ اس عاجز نے عالم اسلام کے عظیم فقیہ جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سے اس ایڈیشن کے لئے پیش لفظ کی درخواست کی، آں محترم نے از راہ شفقت قبول فرمائی۔ اللہ تعالیٰ دونوں بزرگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس کتاب کی تاریخ یہ ہے کہ ۹/۱۱ کے بعد جب پروپیگنڈے کے طوفان نے اسلامی جہاد کے بارے میں اچھوں اچھوں کو ہلا ڈالا تھا، ایک دن خال معظم ومربی محترم حضرت مولانا عتیق الرحمن سنبھلی نے اس موضوع پر کچھ لکھنے کی غیر معمولی ترغیب دی۔ اور پھر بارہا میری کم ہمتی پر ان کی یاد دہانی اور ہمت افزائی غالب آتی رہی۔ ماموں صاحب آج کل بڑے کمزور اور علیل چل رہے ہیں۔ یہ کتاب دراصل ان کے حسنات میں داخل ہے۔ ناظرین کرام سے ان کے لئے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ زبان وقلم کو ہر لغزش سے محفوظ رکھے اور اس حقیر کاوش کو دین وملت کے کام آنے والی چیز اور اپنی رضا کا ذریعہ بنادے۔

وما توفیقی إلا باللہ، علیہ توکلت وإلیہ أنیب۔

ہیچمداں

یحییٰ نعمانی

۱۴/۷/۱۴۳۲ھ مطابق ۱۵/۶/۲۰۱۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم
ناظم اعلیٰ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

الحمد للہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی سید الانبیاء و المرسلین،
و علی آلہ و صحبہ اجمعین۔ اما بعد!

جہاد کا عمل دراصل انسان کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کی صورت کی طلب میں جو رکاوٹ سامنے آتی ہو اس کا مقابلہ کرنے کا عمل ہے، اس میں کا اولین مرحلہ اپنے نفس کی ترغیبات جو رضائے الٰہی کی طلب میں رکاوٹ بنتی ہوں ان سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے، پھر دوسروں کی طرف سے طاقت کے استعمال کے ساتھ رکاوٹ پیش آسکتی ہو اس کا مقابلہ کرنا اور اصلاح کی کوشش کرنا ہے، اس میں اولاً پر امن ذرائع اور حکمت و موعظت کو اختیار کرنا ہے، اور اس صورت میں جو تکلیف و زحمت پیش آسکتی ہے اس کو برداشت کرنا ہوتا ہے، جیسے کہ سورۃ النصر میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا اس راہ میں اور جو دشواریاں پیش آئیں ان کا حسب موقع اور حسب ضرورت مقابلہ کرنا ہے، یہ دشواریاں دوسروں کی طرف سے اگر طاقت کے استعمال کی صورت میں پیش آرہی ہوں تو ان کا مقابلہ طاقت کے استعمال سے کرنا ہے۔ لیکن مقصد یہ ہو کہ انسانوں کو شر

سے نجات حاصل ہو اور خیر عام ہو۔ اس کو قرآن مجید میں اس طرح واضح کیا گیا ﴿الذین ان مکناھم فی الارض أقاموا الصلاۃ و أتوا الزکاۃ و أمروا بالمعروف و نھوا عن المنکر﴾ لہٰذا اسلامی جہاد اپنے کو یا اپنی قوم کو محض دنیاوی برتری دلانا یا محض دنیاوی قوت و اقتدار کا حصول نہیں بلکہ وہ اللہ رب العزت کی نافرمانی اور شر و فساد بزور طاقت پھیلایا جا رہا ہو، اور اس کے دور کرنے کے لئے نصیحت و تلقین کام نہ دے رہی ہو اور مخالف کی طرف سے طاقت کا خطرہ ہو جس کو طاقت کے ذریعے ہی دور کیا جا سکتا ہو تو طاقت کے ذریعے سے اس کو دور کیا جائے گا، اور یہ صرف اللہ رب العزت کی خوشنودی کے حصول کے لئے کیا جائے گا، اور اس سلسلے کی جنگ اسلامی جہاد کہلائے گی، اور اگر یہ نیت و مقصد نہیں تو نام جو بھی رکھ لیا جائے تو وہ جہاد اسلامی نہیں ہو سکتا۔

اسلامی جہاد کی تاریخ دیکھی جائے تو صاف نظر آئے گا کہ اس میں بے خطا اور امن پسندوں کے ساتھ ذرہ بھر زیادتی کا کوئی واقعہ نہیں ملتا، لیکن اس جہاد کے اعلیٰ مقاصد اور طریقہ کار کے متعلق جب غلط باتیں کہی جانے لگیں اور اس کو بدنام کیا جانے لگا تو ضرورت ہوئی کہ جہاد کی حقیقت اور مقصد کو واضح کرنے کے لئے حسب ضرورت ایسی وضاحت کی جاتی رہے جن سے غیر مسلم بھی اس کی حقیقت سمجھیں اور مسلمانوں کو بھی جہاد کی خوبی اور مصلحت معلوم ہو۔ عزیز مکرم مولوی یحییٰ نعمانی نے اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس موضوع پر پوری کتاب تیار کی، اگرچہ ان سے پہلے یہ کام کیا گیا ہے لیکن موصوف نے اپنے عہد کے حالات کے لحاظ سے اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں یہ کام انجام دیا، اس میں انہوں نے قرآن کریم اور حدیث نبوی اور فقہی تشریحات کو مدنظر رکھتے ہوئے جہاد کی حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی ہے، کتاب ساڑھے تین سو صفحات سے زیادہ ہے اور اس میں جہاد سے تعلق رکھنے والے مختلف امور اور

پہلوؤں کو بھی وہ زیر بحث لائے ہیں، بعض امور میں انہوں نے جہاد پر دیگر مصنفین سے اختلاف رائے بھی کیا ہے، کتاب متعدد ابواب پر مشتمل ہے جس کے اہم عنوانات حسب ذیل ہیں، جہاد کی حقیقت، جہاد کے مقاصد، جہاد کی کچھ اہم شرطیں اور قوانین، اہل ذمہ یعنی اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندے، حقوق و ذمہ داریاں، جہاد کے نتائج، جہاد کی فضیلت اور دین میں اس کا مقام، مجاہدین کے لئے اللہ کی غیبی مدد، غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات اسلامی شریعت کی روشنی میں۔ اس کتاب کی تیاری میں ان کے خال معظم برصغیر کے معروف عالم دین مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی سرپرستی اور رہنمائی بھی انہیں حاصل رہی ہے، جس سے اس کتاب کے مضامین کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہے۔ مصنف نے جہاد کے عمل کے نتیجہ میں مال غنیمت کا حصول اور غلاموں کا حصول جیسے معاملات کے سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ وہ زمانہ جہاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ائمہ کے اقوال کی روشنی میں دیکھے جائیں گے، امید ہے کہ یہ کتاب لوگوں کے لئے جہاد اسلامی کے صحیح مفہوم اور اس پر عمل کے صحیح مواقع کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں ہو رہی ہیں ان کے ازالہ میں مدد دے گی۔

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۰/۷/۱۴۳۲ھ
مطابق ۱۳/۶/۲۰۱۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مکلّف مخلوق بنایا ہے، "تکلیف" کا منشا یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے خالق و مالک کے احکام کے مطابق زندگی گذارے اور آخرت میں اس کے مطابق جزا و سزا پائے، اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام عدل و احسان پر رکھا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ﴾ (الأنفال:۹۰) عدل واجب ہے اور احسان بہتر ہے، عدل کے مقابلے میں ظلم ہے، اور ظلم سے منع کیا گیا ہے: ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (آل عمران:۵۷، ۱۴۰) البتہ آخرت کی جزا و سزا کا تعلق تقوی سے ہے: ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (الأعراف:۱۲۸، القصص:۸۳) آخرت میں ہر شخص کا درجہ اس کے تقوی کے لحاظ سے متعین ہوگا، تقوی کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی کفر سے بچا رہے، جو شخص اس درجہ کے تقوی سے بھی محروم ہو، وہ ہمیشہ کے لئے دوزخ کا ایندھن بنے گا۔

عدل و احسان کا بنیادی مقصد امن و امان کا قائم رکھنا اور 'فساد فی الارض' کو روکنا ہے، انسان سے پہلے جو مخلوق دنیا میں بسائی گئی تھی، اس کو اسی لئے اس کائنات کی بستیوں سے بے دخل کیا گیا کہ وہ زمین میں فساد مچا رہے تھے؛ اس لئے فرشتوں نے بارگاہ ربانی میں عرض کیا کہ کیا آپ پھر ایسی مخلوق کو زمین میں بسانا چاہتے ہیں جو

وہاں فساد مچائے گی اور خون ریزی کرے گی: ﴿قَالُوٓا أَتَجۡعَلُ فِيهَا مَن يُفۡسِدُ فِيهَا وَيَسۡفِكُ ٱلدِّمَآءَ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ (البقرۃ: ۳۰)۔

عدل کے قائم کرنے اور امن وامان کی فضاء کو برقرار رکھنے کے لئے بعض اوقات زبان وقلم کا استعمال کافی ہوتا ہے اور انذار وتبشیر کے ذریعہ کام چل جاتا ہے، جس کو قرآن مجید میں ''نہی عن المنکر'' سے تعبیر کیا گیا ہے (التوبہ: ۱۱۲) اور ''جہاد باللسان'' بھی کہا گیا ہے، (النحل: ۱۲۵) کبھی مال کے ذریعہ اس ضرورت کو پورا کیا جاسکتا ہے، جس کو ''جہاد بالاموال'' کہا گیا ہے، (التوبۃ: ۴۱) اسی لئے زکوۃ کے مصرف 'غارمین' سے مراد بعض فقہاء کے یہاں وہ لوگ ہیں جو صلح کرانے کے لئے کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لیں؛ لیکن بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے لئے اخلاقی نصیحتیں اور ترغیبات کافی نہیں ہوتیں؛ بلکہ ان کے ساتھ سختی سے نمٹنا ضروری ہوتا ہے، ایسے لوگ اگر افراد ہوں تو ان کے لئے حدود وقصاص احکام رکھے گئے ہے، جن کو اسلامی حکومت نافذ کرتی ہے، یہ لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اگر امن وامان کو درہم برہم کرنے والے لوگ گروہوں کی شکل میں ہوں تو ان کے خلاف فوجی طاقت کا استعمال کرنا ضروری ہے، جس کو قرآن وحدیث میں 'جہاد بالسیف' یا 'قتال' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں ''جہاد'' ایک منفرد لفظ ہے، جو فوج کشی کے لئے استعمال کیا گیا ہے؛ تاکہ مسلمان اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ یہ زر وزمین اور جاہ واقتدار کے حصول کی جنگ نہیں ہے، جو عام طور پر کی جاتی ہے؛ بلکہ یہ عدل وانصاف قائم کرنے اور ظلم وفساد کو دفع کرنے کے لئے کی جانے والی ایک منظم کوشش ہے، جس میں قتل وقتال کی نوبت بھی آسکتی ہے، خواہ مسلمانوں کو عدل فراہم کرنے کے لئے ایسی کاروائی کرنی پڑے، یا غیر مسلموں کو انصاف دلانے کے لئے؛ چنانچہ عہد نبوی میں جو

سب سے بڑی مہم جوئی کی گئی ، وہ ہے فتح مکہ ، یہ مہم اصل میں قبیلۂ بنی خزاعہ کے مشرکین کو انصاف دلانے کے لئے تھی ، جس کے مقابلہ میں مکہ کے مشرکین اور بنو بکر کے لوگوں نے عہد شکنی اور زیادتی سے کام لیا تھا ، آپ ﷺ نے پہلے اہل مکہ سے ان کی دیت طلب فرمائی ؛ لیکن جب وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے اور معاہدہ کے ختم کردینے کا اعلان کیا ، تب آپ ﷺ نے مکہ پر فوج کشی فرمائی ، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جہاد صرف مسلمانوں کو انصاف دلانے کے لئے نہیں ہے ؛ بلکہ پوری انسانیت کو انصاف دلانے کے لئے ہے ۔

انصاف کا تعلق انسان کی جان سے بھی ہے ، مال سے بھی ، اور عقیدۂ و ضمیر کی آزادی سے بھی ، اسلام نے جیسے ہر شخص کے لئے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا حق تسلیم کیا ہے ، اسی طرح مذہبی آزادی بھی سبھوں کو عطا کی ہے ، قرآن مجید نے آپ ﷺ کے ذریعہ اہل مکہ کو کہلایا : ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ (الکافرون : ۶) اور جیسا کہ قرآن نے اعلان کیا ہے : ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرۃ : ۲۵۶) اسی بناء پر آپ ﷺ نے مختلف مشرک اور اہل کتاب قبائل سے معاہدۂ امن کئے ہیں ، ان مشرکین سے جہاد کا حکم دیا گیا جو ” صد عن سبیل الله “ کا ارتکاب کر رہے تھے ، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر قرآن بھی شاہد ہے ، حدیث بھی اور سیرت کے واقعات بھی ۔

غرض کہ اسلام کی نظر میں اصل امن و صلح ہے ، قتال اس وقت ہے جب وہ امن و امان کو قائم رکھنے اور ظلم و فساد کو روکنے کے لئے مجبوری بن جائے ، محض کفر کی بناء پر دنیا میں نہ صرف جہاد کا حکم نہیں دیا گیا ؛ بلکہ عذاب الٰہی بھی کسی کافر گروہ پر اسی وقت نازل ہوا ، جب وہ کفر کے علاوہ اللہ کے راستہ سے روکنے کے بھی مرتکب ہوئے ، مگر افسوس کہ موجودہ دور میں جہاد کے لفظ کو دہشت گردی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے اور ا

سے اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کے مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

کچھ غلط فہمی اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ فقہاء نے اپنے اجتہاد سے جو احکام بیان کئے ہیں، وہ زیادہ تر اس عہد کے حالات پر مبنی ہیں، جس دور میں ہماری فقہی کتابیں مرتب کی گئیں، اس دور میں کوئی ایسا عالمی ادارہ نہیں تھا، جو تمام ملکوں کو کسی معاہدہ کا حصہ بناتا اور سبھوں سے اس بات کی ضمانت لیتا کہ وہ ایک دوسرے کی سرحدوں میں مداخلت نہیں کریں گے اور ہر ملک دوسرے ملک کے اقتدار اعلیٰ کا احترام کرے گا؛ اس لئے اس وقت ہر ملک ایک طرح سے جنگ کی حالت میں ہوتا تھا اور اس کے پڑوسی کبھی بھی اس پر یلغار کر سکتے تھے، انسانی حقوق اور جنگی قیدیوں سے متعلق نہ کوئی قانون تھا نہ کوئی معاہدہ، ان ہی حالات کے پس منظر میں فقہاء نے فتاوی دئے، جو یقیناً اُس وقت کے لئے مناسب تھے، آج کی دنیا عالمی سطح پر ایک معاہدہ کی ڈوری میں بندھی ہوئی ہے، اگرچہ بڑی طاقتیں بہت سی دفعہ عالمی قوانین کا پاس و لحاظ نہیں رکھتیں؛ لیکن بہرحال ان کی ایک اہمیت محسوس کی جاتی ہے، یہاں تک کہ اکثر اوقات دنیا کی بڑی طاقتوں کو بھی اقوام متحدہ سے اپنے اقدامات کی حمایت حاصل کرنی پڑتی ہے؛ اس لئے آج قریب قریب تمام ہی غیر مسلم ممالک اور ان کے شہری عالم اسلام کے لئے معاہدین کا درجہ رکھتے ہیں نہ کہ حربیوں کا، اور حربی اور معاہد کے احکام ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہیں، یہاں تک کہ اگر غیر مسلموں کے کسی گروہ کے ساتھ امن کا معاہدہ ہو اور اس ملک میں اندرونی طور پر مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی جائے تب بھی قرآن مجید کہتا ہے کہ ہمیں اپنے معاہدہ پر قائم رہنا چاہئے (التوبہ:۴)۔

اس وقت اس حقیر کے سامنے نوجوان اور بلند ہمت فاضل اور ایک علمی

خاندان کے چشم و چراغ مولانا یحییٰ نعمانی کی قلمی کاوش ہے، جس میں اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے، جہاد کی حقیقت کیا ہے؟ جہاد کے مقاصد کیا ہیں؟ قتال کی علت کیا ہے؟ جہاد سے متعلق شرطیں اور جنگی قوانین اور موجودہ دور میں ان کی تطبیق، غیر مسلم رعایا کے حقوق، جزیہ اور ذمی کی اصطلاحات، جہاد کے فضائل اور اس کی قسمیں، جہاد کے نتائج اور اس سلسلہ میں پائی جانے والی بعض غلط فہمیاں، ان تمام پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور کسی بھی مسئلہ پر گفتگو قرآن و حدیث کو اصل مان کر فقہاء کے اجتہادات سے استفادہ کرتے ہوئے کی گئی ہے، اور عصر حاضر کے احوال کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کتاب کے متعدد مباحث نئی نوعیت کے ہیں، ممکن ہے کہ مؤلف کے بعض نقاط نظر کے سلسلہ میں فقہی جہت سے اختلاف کیا جائے؛ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ وقت کے اہم ترین موضوع پر ایک قابل قدر اور نہایت لائق تحسین علمی کاوش ہے جو مصنف کے احوالِ زمانہ کے شعور اور اپنے عصر کے تقاضوں سے آگہی کی دلیل ہے، انشاء اللہ یہ کتاب برادران انسانیت کے دلوں میں پائے جانے والے شکوک و شبہات کے کانٹوں کو نکالنے میں مفید و معاون ہوگی اور خود مسلمانوں کے ایک گروہ کے ذہن میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور ان غلط فہمیوں کی وجہ سے جو بے اعتدالی جنم لیتی ہے، ان کا ازالہ بھی ہو سکے گا، میں اس اہم اور مفید کام پر مؤلف کو مبارکباد دیتا ہوں، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور ان کی یہ محنت امت کے لئے مفید ثابت ہو۔

۱۱ر جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ	خالد سیف اللہ رحمانی
۱۵ر مئی ۲۰۱۱ء	(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

بقلم: حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مدظلہم

مغرب کو جہاد اور قرآن سے جو پریشانی ازل سے رہی ہے وہ ہمیشہ ایک کھلا راز رہی۔ کوئی بہانہ بنا اور بس ''ہولی وار'' شروع۔ ۹/۱۱ کا المیہ واقعہ میں جہاد اور قرآن والوں ہی کا کام تھا یا بات کچھ اور تھی؟ یہ ابھی تک ایک متنازعہ معاملہ ہے۔ لیکن اِدھر یہ ہوا اور اُدھر افغانستان کے طالبانِ قرآن نشانہ پر رکھ لئے گئے۔ اور وہ دن ہے اور آج کا دن، کہ یہ طالبان ہی نہیں، قرآن اور بالخصوص جہاد بھی پیہم نشانے پر ہیں، اور ان دونوں کے حوالہ سے اسلام۔ اسی پہ بس ہو جاتی۔ مگر نہیں، عراق پہلے سے کچھ سیاسی اور معاشی ''ضرورتوں'' کے تحت نشانہ پر تھا۔ طالبان کے بارے میں جو گمان ہوا کہ ان کا قصہ تمام شد، تو عراق کی مہم سے بھی لگے ہاتھوں فراغت کی ایسی چڑھی کہ اقوامِ متحدہ راستہ میں حائل ہوئی تو آبرو کھو بیٹھی۔ یہ سامراجانہ دراز دستی کا وہ مظاہرہ تھا کہ اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آیا۔ دنیا بھر میں احتجاج ہوا۔ خود یورپ سب سے آگے رہا۔ حتیٰ کہ برطانیہ جو خود پچھ لگّوے کی حیثیت میں شریکِ جرم تھا اس کا عوامی مظاہرہ تاریخِ انسانی کا شاید سب سے بڑا احتجاجی مظاہرہ تھا۔ مگر مجرمین کے کان بہرے بنے رہے۔ دوسرا المناک منظر اسی کے ساتھ یہ تھا کہ مسلم ملکوں کے حکمراں اگر کھلے یا چھپے حامی اس بربریت کے نہ تھے تو خاموش بہر حال تھے۔

اس صورتِ حال میں مسلم دنیا کے "مردے" بھی کفن پھاڑ "قبروں" سے نکل پڑتے تو تعجب کی جانہ تھی۔ جوانوں کا تو پوچھنا ہی کیا؟ ایک آگ ان کے دل ودماغ میں لگ گئی۔ اور پھر جو کچھ ایسے میں ہوتا ہے وہ ہونے لگا۔ اور جب اُدھر طالبان پر بزن بولتے وقت زبان نے نعرہ کروسیڈ کا اُگلا تھا تو یہ نوجوان اس کے جواب میں اپنی ترکتازیوں کو جہاد کیسے نہ سمجھتے؟ جب کہ جہادی ترکتازیوں کے لئے جو آداب وضوابط شرط تھے ان سے وہ ناآشنا! اعداء تو جان بوجھ کر جہاد کو بدنام کر رہے تھے، اپنے ناواقفی سے انھیں موقع فراہم کرنے لگے کہ جہاد کا ترجمہ "دہشت گردی" کریں۔ (ویسے ناواقف ہی نہیں، بعض اعلیٰ درجہ کے واقف کاروں کے قلم سے ایسی تحریریں، شدتِ احساس سے نکلی ہوئی، دیکھنے میں آئیں جو ناوقف نوجوانوں کی نافہمی کو سند دیتی تھیں۔) الغرض دوہری آزمائش اسلام کے مقدس ادارہ جہاد پر آگئی۔

دوسال کے قریب ہوتے ہیں کہ ان حالات نے تقاضہ پیدا کیا کہ جہاد اور اس کی حقیقت پر کچھ تفصیل سے لکھا جائے۔ مرتبِ الفرقان ومدیر المعہد العالی للدراساتِ الاسلامیہ عزیزم مولوی یحیٰ نعمانی سلمٗہ سے کہا کہ میاں یہ کام کرنے کا ہے۔ اسی تحریک وتجویز کی عملی نمود یہ کتاب ہے جس کی تقدیم ورونمائی کے لئے یہ سطریں لکھنی میرے حصہ میں آئی ہیں، اور مسرت، کہ کتاب میری بہتر سے بہتر توقعات سے بھی فائق! اتنی فائق کہ بے اختیار وہ الفاظ اس موقع پر یاد آرہے ہیں جو عزیز سلمہٗ کے نانا جان (حضرت والدِ ماجد مولانا محمد منظور نعمانی) کی اولین تصنیف "سیفِ یمانی" پر تقریظ میں وقت کے بڑے فاضل، جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور کے ناظمِ تعلیمات، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب علیہ الرحمہ (م ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء) نے تحریر فرمائے تھے:

"...........محترم کو میں ایک سال قبل مولوی منظور صاحب کی حیثیت سے

جانتا تھا۔ اب سے چھ ماہ قبل میں اپنی ذہنیت بدلنے پر مجبور ہوا اور مولانا مولوی محمد منظور صاحب کہنے لگا۔ لیکن اس تصنیفِ لطیف کے غیر فانی نقوش نے میرے قلب کو علامہ محترم حضرت مولانا مولوی محمد منظور صاحب مد فیوضہم کہنے پر مجبور کردیا۔"

مجھے یقیناً بہت اچھی توقع عزیز موصوف سے تھی۔ مگر تحریک و تجویز کے وقت خود میرے بھی ذہن میں موضوع اپنی ایسی وسعتوں کے ساتھ نہ تھا جیسی اس کی وسعتوں کا احاطہ عزیز مصنف نے کیا ہے۔ اور پھر ہر ہر پہلو کا حق ادا کرنے کی ایسی جامع و مانع کوشش کہ اہلِ علم نے اگر نظر ڈالنے کا وقت پایا تو امید ہے کہ یہ کتاب الجہاد وقت کی ایک اہم اور معتبر علمی و دینی خدمت قرار پائے گی۔ اسی امید پر راقم السطور دینی جامعات کے نئے فضلاء سے خاص طور پر خواہش کرے گا کہ وہ ضرور اسے مطالعہ میں لائیں۔ اس سے وہ اس موضوع جہاد پر ہی ان شاء اللہ بہت کچھ نہ سیکھیں گے جس کی فی زمانہ انھیں ضرورت ہے، بلکہ تحریر و تقریر میں وقت کے تقاضوں کو برتنے کے سلیقہ کا ایک نقش بھی ان شاء اللہ یہ چھوڑ جائے گی۔

کتاب "جہاد کی حقیقت" کے بیان سے شروع ہوتی ہے جس سے جنگ اور جہاد کا فرق واضح ہو، کہ بظاہر تو جہاد بھی جنگ ہی ہے مگر "Holy war" (مقدس جنگ) نہ کہلانے کے باوجود اس میں آداب و شرائط کی وہ مقدار اور وہ معیار ہے کہ پھر یہ جنگ "جنگ" نہیں رہتی وہ شئی بن جاتی ہے جو "جہاد فی سبیل اللہ" کہلائے۔ اور بڑا حوصلہ چاہیے کہ کوئی خود کو "مجاہد" گردانے۔ یہ اسلامی تعلیمات کا وہ گوشہ ہے کہ اس کے اصلی چہرہ سے نقاب اگر اُٹھادی جائے تو بقولِ مصنف:

"............ یوں تو اسلامی تعلیمات کا ہر شعبہ اس کی حقانیت کی دل چھو لینے والی دلیل ہوتی ہے، مگر اس معاملہ میں جہاد کی تعلیم بڑا اونچا مقام رکھتی ہے۔ اسلام کی "جہادی تعلیمات" کو اپنے صحیح سیاق و سباق میں، داخلی محرکات، اور خارجی

اصول وضوابط کے ساتھ جب بھی کسی سلیم الفطرت انسان کے سامنے رکھا جائے گا تو یقیناً وہ (قرآن کی طرح) ان تعلیمات کے بارے میں یہی تبصرہ کرے گا کہ ان کا دینے والا ساری دنیا پر بڑا احسان کرنے والا (ذو فضل علی العالمین) ہے۔ صحیح طور پر ان تعلیمات پر عمل پیرا جماعت انسانیت کے لئے (آسمان سے برسنے والی بارش کی طرح) ایسی خدائی رحمت ہے کہ مسلم وغیر مسلم سے قطع نظر سارے انسان اس رحمت کی تمنائیں کریں اور خدا کے دربار میں اس کے ظہور کے سوالی بنیں۔" (صفحہ ۱۶)

جہاد کی حقیقت اور اس کے آداب وشرائط پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد موضوع کے جو بدیہی متعلقات ہیں اور جہاد کے موضوع پر ایک تحریر سے جن کی توقع عام طور پر کی جاسکتی ہے وہ تو شرح وبسط کے ساتھ بیان میں آئے ہی ہیں، پر جو چیز خصوصیت اس کتاب کی ہے وہ اِس فی سبیل اللہ "جنگ" کا مطالعہ اپنے اِس زمانہ کے تناظر میں ہے، جس میں وہ نئے نئے مسائل حل طلب ہوگئے ہیں جن کا کوئی تصور اس وقت نہ تھا جب اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا دارالحرب (یا دارالکفر) اور دارالاسلام کے دو خانوں میں تقسیم تھی۔ اب ہر ملک کی رکنیتِ اقوامِ متحدہ کے بعد کوئی ملک نہیں رہ جاتا جسے دارالحرب کہا جاسکے۔ سارے ملک اب ایک عالمی برادری ہیں (جن میں بلاشبہ وہ بھی ہیں جن پر صادق کہ "بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی!") مگر عالمی برادری کے نظام نے خواہی نہ خواہی سب کو اس نظام کے اصولوں کا پابند بنالیا ہے۔ اور ملک کی حکومت پابند ہوئی تو ہر فرد اصولاً پابند۔ اور اسی کے نتیجہ میں اب کوئی جگہ ایسی نہیں رہ گئی ہے جہاں مسلمان باقاعدہ بس نہ گئے ہوں۔ یہ صورتِ حال جہاد کے مسئلہ کو ایسا سادہ نہیں چھوڑتی جیسا وہ کبھی رہا ہوگا۔ لیکن کتاب وسنت ہر عہد اور ہر حالت کے لئے "ھدیً وَّ نور" ہیں، مصنف کی محنت اور دقتِ نظر نے اس روشنی سے اس موجودہ حالت کے بھی سامنے کے پہلوؤں پر رہنمائی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ خود

لکھتے ہیں:

"........... جہاد کے قوانین اور اس کے اخلاقی اور دینی ضوابط پر غور کرتے وقت تمدن کے ارتقا اور بین الاقوامی صورتحال کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس بنا پر مختلف زمانوں کی صورت حال تقاضہ کرے گی کہ زمانہ بدلنے کے بعد قانون جہاد کی از سرنو تدوین کی جائے۔ قرآن نے اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس سلسلے میں ہم کو کچھ ابدی اصول دیے ہیں، وہ دراصل اس باب کے کلی اصول ہیں جو کبھی نہیں بدلیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ابدی خیر اور صدق وعدل کا قانون قرار دیا ہے۔ ائمۂ اسلام نے اپنے زمانے اور حالات کے لحاظ سے اسی دائمی قانون کی روشنی میں مفصل ضابطے تشکیل دیے ہیں۔ وہ اس دور کی صورت حال اور بین الاقوامی عرف کے لحاظ سے مکمل ضابطے تھے۔ اس ماحول میں ان کے مبنی بر عدل وحق ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا کی قوموں نے اسلام کے ان قوانین پر کبھی تنقید کی انگلی نہیں اٹھائی۔ یہ پورا سرمایہ ہمارے لیے فقہی بصیرت پیدا کرنے والا سامان ہے۔ لیکن جیسا کہ سارے دیگر فقہی احکام کے بارے میں ہوتا ہے، یہ ممکن ہے کہ عرف اور ماحول بدلنے سے اور کسی اور قسم کے بین الاقوامی حالات میں ہمارے قانون جہاد سے متعلق تفصیلی اجتہادی ضابطے عدل اور حکمت کے تقاضوں کے تحت کتاب وسنت کی روشنی میں نئے ضابطوں سے بدلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور آں حضرت کی سنت میں یہ معجزانہ شان رکھی ہے کہ ان میں غور کرنے والے کو اپنے زمانے کے لحاظ سے انسانی معاملات کے لیے ایسی اصولی رہنمائی مل جاتی ہے جس سے ہر قسم کے حالات کے لیے ٹھیک حق وعدل پر مبنی ضابطوں اور قوانین کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ اس رسالے میں دراصل انھی اصولی تعلیمات کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے۔" (ص ۶-۷)

لیکن مصنف کی اس وضاحت سے بھی ذہن کتاب کی کئی ان بحثوں کی طرف شاید ہی کسی کا جائے جو اسے علمی حیثیت سے خصوصی اعتنا کا مستحق بناتی ہیں۔ ضرورت

ہے کہ ان بحثوں کی طرف اشارہ کردیا جائے۔ جہاد کے ساتھ غلامی کا مسئلہ آتا ہے اور یہ اسلام پر اعتراضات کی یورش میں سے ایک ہے اور بہت کچھ اس پر لکھا گیا ہے، پھر بھی کتاب کی یہ بحث بہت کچھ ایک یگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ مالِ غنیمت کی تقسیم والی بحث اگرچہ ملت کے موجودہ حالات میں کوئی عملی افادیت نہ رکھتی نظر آئے مگر علمی تحقیق کے اعتبار سے قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اور ہمارے دینی علم والے حلقہ میں اس طرح کا تحقیقی مذاق پیدا ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمارے زمانہ کی زندگی کا ایک نہایت اہم عملی سوال غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات ہیں، اور یہ مسئلہ جیسا جہاد کے حوالہ سے سامنے آنا چاہیے اُس سے بڑھ کر کوئی دوسرا حوالہ اس کی طرف توجہ دلانے والا نہیں ہوسکتا۔ مصنف نے اس بحث پر غور و فکر کا بہت قابلِ توجہ مواد جمع کردیا ہے۔ اور ان کی اپنی جو رائے اس مطالعہ میں بنی ہے جس کا اظہار جرأت طلب تھا، اسے پورے اعتماد اور جرأت سے ظاہر بھی کیا ہے۔ ایک اور سوال بھی جہاد کے حوالہ سے قابلِ توجہ تھا۔ مغربی سامراجیت کے آغاز سے مسلم ملکوں میں جہاد کی جو جوابی تحریکیں اٹھیں اور کسی نہ کسی شکل میں ان کا سلسلہ آج بھی کہیں کہیں جاری ہے مگر نصرتِ الٰہی کہیں ساتھ دیتی نہیں پائی جاتی۔ جبکہ قرآن میں اہلِ جہاد سے اللہ کا وعدۂ نصرت ملتا ہے اور ابتدائی تاریخِ اسلام سے اس وعدہ کی صداقت کا ثبوت بھی؟ کتاب میں براہ راست اور بالواسطہ بہت کچھ اس سوال کے جواب میں ملتا ہے۔ اور ایک لحاظ سے تو اسے کتاب کی جان کہنا چاہیے۔

دعا ہے کہ کتاب لائق و عزیز مصنف کے نیک مقصد و نیت کو پورا کرنے والی ثابت ہو۔ و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ رسولہ النبیّ الاُمی و علیٰ آلہٖ وسلم

دعا گو: عتیق سنبھلی

دن۔ جمعہ، ۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ، یکم مئی ۲۰۰۹ء

پیش لفظ

دنیا کی اعجوبگیاں اور فطرت کی نیرنگیاں اس کے خالق کی نشانیاں ہیں۔ یہ حسین آبشار، یہ ہولناک سمندر، آسمان سے باتیں کرتی چوٹیاں، رنگارنگ نباتات، اور حسین پرند وچرند سب قدرت کے حیران کن تماشے ہیں۔ مگر قدرت کی یہ ظرفگیاں کچھ مشاہد فطرت تک ہی محدود نہیں۔ انسانی تاریخ عجائب روزگار اور حیرت انگیز انہونیوں ہی کی داستان ہے۔ ایسی ہی ظرفگی کا سین تاریخ کے اسٹیج پر یہ قائم ہے کہ اسلام پر "خونریز وخونچکاں جہادی نظریات وعقائد" کے الزامات سے دشت وجبل گونج رہے ہیں۔ قرآن وسنت کی جہاد کی تعلیم پر اعتراضات کا شور ہے۔ اور ہر دل میں یہ بٹھادیا گیا ہے کہ کچھ تو ہے جو دنیا اس قدر معترض ہے۔

پروپیگنڈائی مکر وفریب کی ساحری پر تعجب کیجئے کہ ستمہائے روزگار پر روئیے!

جن قوموں نے گذشتہ تین صدیوں سے زمین کو لالہ زار کر رکھا ہے، جنہوں نے ایشیا وافریقہ اور امریکہ وآسٹریلیا کی انسانی شکارگاہوں میں غارت گری کی لاسابق ولافانی تاریخ رقم کی، انہوں نے اس الزام کے لیے ان مسلمانوں کا انتخاب کیا جن کے خون سے خود ان قوموں کے ہاتھ سب سے زیادہ رنگین تھے۔

اگر ظلم کے ان اماموں نے دنیا کی عقل پر میڈیا کے ذریعہ سحر نہ کر دیا ہوتا تو دنیا ان سے پوچھتی کہ تین صدیوں کی خونریزیوں کا حساب دینے سے پہلے تم کو یہ حق کس نے دیا کہ

تم امن وسلامتی کے بارے میں گفتگو کرسکو؟ امریکہ کے اصل باسیوں کی پوری نسل تم نے قتل کردی۔ آسٹریلیا کے اصل رہنے والوں کو تم نے صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا، افریقیوں کا تم نے ایسا شکار کھیلا جیسا کسی نے جنگل کے جانوروں کا نہیں کھیلا۔ اب تم دنیا سے انسانی حقوق کا حساب لینے آئے ہو؟ دنیا کیوں بھول گئی؟ مشرق کی قومیں کیوں بھول گئیں؟ ہندوستانی کیوں بھول گئے، اور پھر جاپانی کیوں بھول گئے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ ہندوستان کا چپہ چپہ آج بھی شہیدوں کے خون سے مہک رہا ہے۔ اگر دنیا کے پاس عقل ہوتی تو وہ اس جھوٹ کو یہ کہہ کر سننے سے انکار کردیتی کہ یہ سب اپنے عالمگیر جرائم پر پردہ ڈالنے کی مکارانہ کوشش ہے اور کچھ نہیں......۔

ظلم وستم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سفاکیاں اور چیرہ دستیاں اگر مظلوم قوم کے کچھ افراد میں ردِّعمل کی نفسیات اور حدود سے تجاوز پیدا کر کے ان کو برخود غلط قسم کے اقدامات پر آمادہ کردیں تو یہ چیز صرف ظلم کی شدت کی دلیل ہوتی ہے۔ مگر ہمارے ساتھ چرخ ستم گر نے یہ ظلم بھی کیا، کہ طویل مظلومیت کی بنا پر، ہم میں سے ہی کچھ لوگ اس طرح بے چین ہوئے کہ ان کے ہاتھ سے علم ودانش اور ہوش مندی دونوں کے دامن چھوٹ گئے۔ انہوں نے ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی بالکل غلط اور خلاف شریعت تشریح کی، جس میں شریعت کے مقرر کردہ حدود کی رعایت نہیں کی گئی تھی۔ انہوں نے علماء دین کی رائے کے بالکل خلاف ایسا انتہا پسندی کا راستہ اپنایا جس سے اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی بھی ہوئی اور وقت کے شیطانوں کو مسلمانوں پر ظلم اور اپنی ہوسناکیوں کی پیاس بجھانے کے لیے بہانے بھی ملے۔

ایسے لوگوں کی تعداد اگرچہ کم تھی مگر تھی۔ اور ان سے کچھ غلط حرکتیں بھی سرزد ہوئیں۔ دنیا کے تمام بڑے ملکوں میں اس وقت جو سیاسی نظام قائم ہے اس کے بارے

میں باخبر لوگ بخوبی اور یقینی طور پر جانتے ہیں کہ چاہے جمہوریت کے ذریعہ حکمرانوں کے چہرے بدلتے رہیں، مگر اصلاً حکومت کچھ خاص عناصر پر مشتمل Establishment کی ہوتی ہے۔ یہ طبقہ عوام کو اپنی داخلی وخارجی پالیسیوں اور کارروائیوں پر راضی ومطمئن یا کم ازکم خاموش رکھنے کے لیے عجیب وغریب طریقے پر مختلف ڈرامے کرتا رہتا ہے۔ خود مغربی حکومتوں کے اعترافات کے مطابق مغرب کی سرزمین پر توڑ پھوڑ کی بعض خونی کارروائیوں کے پیچھے خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ رہا ہے[1]

اس چیز نے صورتحال میں بڑی پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں۔

ایک طرف ''اسلامی جہاد'' کو بدنام کرنے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دلوں میں قرآن اور اسلامی تعلیمات سے بدظنی پیدا کرنے کی ہر سو پھیلی ہوئی مہم ہے۔ دوسری طرف حالات کے جبر اور ردِّعمل کی نفسیات کے مارے ہوئے یا انتہا پسندانہ سوچ کے شکار وہ نا سمجھ ہیں، جن کو عالمی ایجنسیاں استعمال کررہی ہیں یا جو اسلامی جہاد کی بدنامی اور مسلمانوں کے مسائل کو بری طرح الجھانے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے جہاد کے شرعی قوانین کو کھلے طور پر نظرانداز کرکے اندھادھند قتل و خونریزی کو جہاد سمجھ رکھا ہے۔ وہ نہ علماء کی بات سننے کو تیار ہیں اور نہ ٹھنڈے دماغ سے قرآن وسنت کی تصریحات اور موجودہ حالات کی نزاکتوں اور اپنے عاقبت نااندیش اقدامات کے نتائج بد پر نگاہ کرنے کو تیار ہیں۔ ان لوگوں نے جن کو اپنا فکری راہ نما اور

---

[1] اس میں خاص طور پر ماسکو کے دھماکوں، اور ایک تھیٹر میں یرغمال بنائے گئے اور پھر ہلاک کیے گئے لوگوں کا واقعہ مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے، جس کا ذمہ دار چیچن تحریک کو قرار دیا گیا، بعد میں انکشاف ہوا کہ خود روسی ایجنسیوں کی کارستانی تھی، تاکہ چیچنیا میں جاری اس فوجی کارروائی کے لیے عوامی ناراضگی کو ختم کرکے ہمدردی حاصل کی جاسکے۔ اسی طرح 1993 کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دھماکوں میں FBI کے عماد سالم نامی ایک مصری نژاد ایجنٹ کا رول ثابت ہوچکا ہے۔

(Washington Post Aug 26 1993, from Gilles Kepel, Jihad: p302)

قائد بنایا ہوا ہے وہ عام طور پر گہرے شرعی علم اور اسلام کے اصل مآخذ کے وسیع مطالعہ سے محروم ہیں۔

مگر ہم ایک حد تک ان لوگوں کو معذور قرار دینے پر مجبور ہیں۔ اس لئے کہ مغرب کی حالیہ چیرہ دستیوں اور مظالم سے تنگ آئے ہوئے لوگ جب انصاف کے ہر دروازے کو بند پاتے ہیں اور دنیا کی ساری بڑی طاقتیں اپنے مفادات کے لئے اس ننگے ظلم کا ساتھ دیتی ہی رہتی ہیں تو ہمارے پاس ان مشتعل لوگوں کے جذبات کو سرد کرنے اور ان کو حکمت وتدبر کی راہ دکھانے والی کوئی دلیل اور منطق نہیں ہوتی۔

مگر ہم ان کو صرف ایک حد تک ہی معذور قرار دے سکتے ہیں، اس لئے کہ اب یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو چکی ہے کہ ان کی ان حکمت وتدبر سے بعید حرکتوں نے مسلمانوں کے ملکوں میں امریکہ کے عمل دخل کے لیے اور خود اپنی ان حکومتوں کے لیے (جن کو وہ مغرب کی ایجنٹ کہتے ہیں) دینی کوششوں کو کچل دینے کے سب سے زیادہ اسباب اور راستے فراہم کیے ہوئے ہیں۔ ان احمقانہ کاروائیوں کی شکل میں جن کو دہشت گردی کا ملعون نام دیا گیا ہے، دوہرا گیم جاری ہے۔ جس کے ذریعہ غیر مسلموں کے ذہنوں میں مسلمانوں اور اسلام کا ایک دہشت ناک ہوا کھڑا کیا جاتا ہے تاکہ اس کی آڑ میں مسلم ملکوں کے خلاف ہر استعماری حملہ جائز ٹھیرایا جاسکے، اسرائیل کے جرائم پر پردہ ڈالا جاسکے، مظلوم مسلمانوں کے لئے ہمدردی کی ہر لہر کو دبایا جاسکے اور مسلم اقلیتوں کے دلوں میں دہشت، خوف، مایوسی اور بے ہمتی پیدا کی جاسکے۔

تیسری جانب دانشوروں کے وہ حلقے ہیں جو حالات کے دباؤ اور الزامات کی بارش سے گھبرا کر خود بخود ملزم کے کٹھرے میں جا کھڑے ہوئے ہیں، اور اسلام کے ایک اہم رکن "جہاد" کی نفی تک کر رہے ہیں، یا اس کی ایسی تشریح کر رہے ہیں جس سے مغرب اور اس کی ہمنوا حکومتیں راضی رہیں۔ اس صورت حال نے ایک عجب

کنفیوژن اور انتشار پیدا کر دیا ہے۔

اس چیلنج کا تقاضہ ہے کہ اسلامی جہاد کی سنہری تعلیم کو کھول کر اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ خود اس کی حقانیت کی ایک شہادت بن جائے۔ اسلامی تعلیمات عام طور پر سراپا حکمت وعدل ہوتی ہیں، یوں تو اسلامی تعلیمات کا ہر شعبہ اس کی حقانیت کی دل چھو لینے والی دلیل ہوتی ہے، مگر اس معاملہ میں جہاد کی تعلیم بڑا اونچا مقام رکھتی ہے۔ اسلام کی "جہادی تعلیمات" کو اپنے صحیح سیاق وسباق میں، داخلی محرکات، اور خارجی اصول وضوابط کے ساتھ جب بھی کسی سلیم الفطرت انسان کے سامنے رکھا جائے گا تو یقیناً وہ (قرآن کی طرح) ان تعلیمات کے بارے میں یہی تبصرہ کرے گا کہ ان کا دینے والا ساری دنیا پر بڑا احسان کرنے والا ہے۔ صحیح طور پر ان تعلیمات پر عمل پیرا جماعت انسانیت کے لئے (آسمان سے برسنے والی بارش کی طرح) ایسی خدائی رحمت ہے کہ مسلم وغیر مسلم سے قطع نظر سارے انسان اس رحمت کی تمنائیں کریں اور خدا کے دربار میں اس کے ظہور کے سوالی بنیں۔

جہادی تعلیمات کے بارے میں یہ طریقہ بالکل غلط ہے کہ پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر نرا مدافعانہ اور صفائی دینے والا اسلوب اختیار کیا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ حق کے داعی بدنامی وخوش نامی سے بے پروا اللہ کے پیغامات سنائے جاتے ہیں، اور اس کی تعلیمات کو بے کم وکاست لوگوں تک پہنچاتے رہتے ہیں:

الذین یبلغون رسالات اللہ	وہ جو اللہ کے پیغامات انسانوں تک
ویخشونہ ولا یخشون احداً الا	پہنچاتے ہیں، اور اس سے ڈرتے ہیں۔
اللہ. (الأحزاب ۳۹)	اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

اس تحریر کے ذریعے اسی ذمہ داری کی ادائیگی مقصود ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جہاد کی حقیقت، اس کے اصول وضوابط، اس کے

مقاصد، دنیا کو اس کی ضرورت، اس کے قائم کرنے والوں کی صفات اور اس کے لیے ضروری شرائط اور بنیادی قوانین کی اس طرح بھرپور ضروری وضاحت کر دی جائے کہ کسی سلیم عقل وفطرت رکھنے والے کے لیے، اگر اس کی نیت صحیح ہو تو، کسی شک شبہے کی گنجائش نہ رہ سکے۔ اسلام کی یہ تعلیمات کسی غیر مسلم کو بھی، چاہے وہ اسلام کو اپنا دین بنائے یا نہ بنائے، جہاد ومجاہدین کا گرویدہ ضرور بنا دیں گی۔ اور تاریخ میں ان تعلیمات نے ایسا کیا ہے۔

اس کتاب میں قرآن وسنت کی روشنی اور حالات حاضرہ کے تناظر میں (یعنی الزامات واعتراضات اور غلو آمیز نظریات دونوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے) اسلامی جہاد کی حقیقت، اس کے اساسی تصورات اور قوانین بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بحمد اللہ اپنی حد تک پورا اطمینان ہے کہ ان شاء اللہ ہر سلیم الفطرت پڑھنے والے کو قلبی اذعان حاصل ہو جائے گا کہ اسلامی جہاد کا ہر قانون اور ہر ضابطہ حق وعدل کے میزان پر پورا اترتا ہے۔ اور اس کی تعلیم سراپا انسانیت نوازی کی تعلیم ہے۔ محض بیان واقعہ اور تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق سے تمام ہی اہم اور نازک موضوعات جن میں اشکال پیدا ہوتا ہے یا جو خصوصا الزامات کا نشانہ بنتے ہیں، ان کے بارے میں خالص کتاب وسنت اور سیرت رسول کی روشنی میں، اور اپنے نزدیک ان سے سرمو انحراف کیے بغیر، جو کچھ لکھا گیا ہے ان شاء اللہ وہ پورے طور پر اطمینان بخش ہے۔ خصوصا جنگ کا جواز کب اور کیوں ہے؟ غلامی کی حقیقت، مال غنیمت کا مسئلہ، بین الاقوامی معاہدات، موجودہ زمانے میں بین الاقوامی معاہدات کی حیثیت اور ان کی نئی شکلیں، بغیر حکومت کے جہاد، آزاد جہادی تنظیموں کا قیام، جنگ میں حصہ نہ لینے والے عوام کے جان ومال کی حرمت، کس درجے کی طاقت اور تیاری کے بعد جہاد کی اجازت ہے؟ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات، وغیرہ اہم اور نازک

مسائل پر اس کتاب میں اللہ کی توفیق و مدد سے جو لکھا گیا ہے وہ ان شاء اللہ سارے اشکالات کو حل کرنے والا اور بہت سی عام غلط فہمیوں کو دور کرنے والا ثابت ہوگا۔

یہ کتاب گرچہ حجم میں مختصر ہے مگر راقم سطور کے بیش از ایک سال کے مطالعے اور غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ ایک ایک مسئلے پر اس نے ڈیرے ڈالے ہیں۔ اور ہر بات اپنے نزدیک پورے اطمینان کے بعد اور جانچ پرکھ کر لکھی ہے۔ موضوع کی نزاکت اور ذہنوں کے اشکالات نے رہگذر کو دشوار بنایا ہوا تھا۔ اگر اہل علم کو، خصوصاً مدارس کے اہل درس کو، اس میں زمانے کے اشکالات کو حل کرنے والا سامان نظر آئے اور اس کی تعبیرات سے اتفاق ہو تو یہ مصنف کے لیے بڑی سعادت کی بات ہوگی۔

دراصل جہاد کے قوانین اور اس کے اخلاقی اور دینی ضوابط پر غور کرتے وقت تمدن کے ارتقا اور بین الاقوامی صورتحال کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس بنا پر مختلف زمانوں کی صورت حال تقاضہ کرے گی کہ زمانہ بدلنے کے بعد قانون جہاد کی از سر نو تدوین کی جائے۔ قرآن نے اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس سلسلے میں ہم کو کچھ ابدی اصول دیے ہیں، وہ دراصل اس باب کے کلی اصول ہیں جو کبھی نہیں بدلیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ابدی خیر اور صدق وعدل کا قانون قرار دیا ہے۔ ائمۂ اسلام نے اپنے زمانے اور حالات کے لحاظ سے اسی دائمی قانون کی روشنی میں مفصل ضابطے تشکیل دیے ہیں۔ وہ اس دور کی صورت حال اور بین الاقوامی عرف کے لحاظ سے مکمل ضابطے تھے۔ اس ماحول میں ان کے مبنی بر عدل وحق ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا کی قوموں نے اسلام کے ان قوانین پر کبھی تنقید کی انگلی نہیں اٹھائی۔ یہ پورا سرمایہ ہمارے لیے فقہی بصیرت پیدا کرنے والا سامان ہے۔ لیکن جیسا کہ سارے دیگر فقہی احکام کے بارے میں ہوتا ہے، یہ ممکن ہے کہ عرف اور ماحول بدلنے سے اور کسی اور قسم کے بین الاقوامی حالات میں ہمارے

قانون جہاد سے متعلق تفصیلی اجتہادی ضابطے عدل اور حکمت کے تقاضوں کے تحت کتاب وسنت کی روشنی میں نئے ضابطوں سے بدلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور آں حضرتؐ کی سنت میں یہ معجزانہ شان رکھی ہے کہ ان میں غور کرنے والے کو اپنے زمانے کے لحاظ سے انسانی معاملات کے لیے ایسی اصولی رہنمائی مل جاتی ہے جس سے ہر قسم کے حالات کے لیے ٹھیک حق وعدل پر مبنی ضابطوں اور قوانین کا استنباط کیا جاسکتا ہے۔ اس رسالے میں دراصل انہی اصولی تعلیمات کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے۔

یوں تو عام طور پر ہر جدید زمانے میں اور زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تفصیلی ضابطوں کی تشکیل کے وقت یہ بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام اپنے زمانے میں سب سے برتر اور متوازن اخلاقی معیار کا حامل ہو۔ اس میدان میں کسی اور کا اس پر فوقیت کا دعویٰ پہلی نظر میں ہی غلط نظر آئے، بالکل اسی طرح جس طرح قرون اولیٰ میں ساری انسانیت کے سامنے اِس میدان میں اس کی فوقیت کھل کر عیاں ہوئی تھی۔ مگر خاص طور پر جہاد وقتال کا موضوع اور ہمارا یہ زمانہ دونوں اس کا شدید تقاضہ کرتے ہیں کہ دنیا کے سامنے قرآن وسنت کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں ایسے ضابطے تشکیل دیے جائیں جو اسلام کے اس دعوے کی دلیل ہوں کہ شریعت اسلامی اخلاقیات اور حق وعدل کے اعلیٰ ترین معیار کی پاسبان ہے۔ اور اس سے زیادہ حق وعدل پر مبنی ضابطوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں بڑا فخر اور پورا شرحِ صدر ہے کہ اسلامی شریعت کی اصولی تعلیمات اور قرآن وسنت کے نصوص کا گہرا اور جامع مطالعہ ہمارے اس دور کے لیے بین الاقوامی قوانین اور جنگ کے جن ضابطوں کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں وہ سراپا عدل وفضیلت اور صدق وشرافت ہیں۔ وتمت کلمة ربک صدقاً وعدلاً۔

آیات اور احادیث حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔ حدیث کے حوالوں میں معتمد نسخوں کے مطابق حدیث نمبر دیے گئے ہیں، جن کی تصریح مآخذ کی فہرست میں کر دی گئی ہے۔ ایک خاص بات یہ لائق ذکر ہے کہ ہر ہر روایت اپنے نزدیک فن حدیث کے معیار کے مطابق جانچ کر لکھی گئی ہے یا کسی قابل اعتماد عالم یا محقق کی توثیق پر اعتماد کیا گیا ہے۔ لہذا ناظرین اعتماد کر سکتے ہیں کہ ہر روایت قابل اعتماد ہے۔

آخری بات اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر ہے اور اس سے دعا کہ وہ اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے۔

یحییٰ نعمانی

لکھنو، ۱۵ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ

باب اول

جہاد کی حقیقت

فصل اول

جہاد کا مفہوم و معنیٰ

جہاد عربی زبان میں جہد سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ مشقت کے ہیں۔ لفظ جہاد کے اصل معنیٰ کسی بڑے مقصد کی خاطر بھرپور مشقت اٹھانا اور محنت کرنا آتے ہیں۔

اسلامی تصور میں جہاد کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک اللہ کا بندہ اور غلام مان کر اس کی عبادت کو اپنی زندگی کا خاص مشغلہ بنا لے اور اس کے رسولوں کے ذریعے ملے ہوئے اس کے احکام کی اطاعت کر کے اس کی بندگی بجا لائے۔ اور پھر اسی مذہب اور طریقے کو وہ دنیا میں عام کرنے اور فروغ دینے کی کوشش کرے۔ یہی اس کی زندگی کا اصول ہو اور یہی اس کا مشن۔ اس راہ میں اگر اس کو دنیا کے باطل پرستوں اور ظالموں کی طرف سے رکاوٹوں اور زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑے تو مردانہ ہمت کے ساتھ صبر کرے اور اگر اس کے پاس قوت اور سکت ہو تو قوت کے ساتھ ایسی ظالم طاقتوں کا زور توڑنے کے لیے راہ حق میں جان بازی کرے۔ اور وہ یہ سب کچھ کام بس اپنے رب کی رضا کے لیے کرے دنیا کی کوئی چیز اس کا مقصود و مطلوب نہ ہو۔

ابتدائی زمانے میں قرآن نے مسلمانوں کے اس پر امن اور صابرانہ رویے

کو جہاد قرار دیا تھا کہ وہ اپنے دین و مذہب پر اسلام کے دشمنوں اور مخالفین کے مظالم اور ایذا رسانیوں کے باوجود ثابت قدمی اور صبر کے ساتھ اس راستے (یعنی اپنے دین پر عمل اور اس کی طرف دعوت) پر جمے رہیں۔ قرآن نے ایسے مخلص مسلمانوں کے اس رویہ کو جہاد قرار دیا۔ سورہ عنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ . وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ..... وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ. (۳---٦)

یعنی کیا لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ ایمان کا زبان سے اقرار کر لینے کے بعد کام پورا ہو جائے گا۔ اور اللہ ان کو پرکھے بغیر جنت میں داخل کر دے گا؟ ہرگز نہیں، سنت اللہ یہ قائم ہے کہ اللہ نے پچھلی امتوں کے ایمان والوں کی بھی آزمائش کی ہے اور حالات کی کسوٹی پر ان کو پرکھا ہے۔ اب تم کو بھی پرکھا جا رہا ہے۔ اس طرح اللہ دیکھتا ہے کہ کون ایمان کے دعوے میں سچا اور اللہ کا اور اس کے دین کا وفادار ہے اور کون جھوٹا۔ آگے اسی صورت حال کے حوالے سے ان مشکلات کے باوجود دین پر جمنے اور استقامت اختیار کرنے والوں کے طرز عمل کو "جہاد" قرار دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ جو اس زمانے میں جہاد کرتا ہے اور راہ حق پر ثابت قدم رہتا ہے وہ اپنے ہی لیے ایسا کرتا ہے، اللہ پر اس کا کوئی احسان نہیں۔

اسی زمانے میں سورہ فرقان میں ایک آیت اتری: وجاھدھم بہ جھادا کبیرا۔ اس آیت میں رسول اللہ کو حکم دیا گیا کہ قرآن اور اس میں بیان کیے گئے حقائق اور دلائل کے ذریعہ اسلام کے مخالفوں سے بھرپور جہاد کیا جائے۔

اس مختصری تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر میں مخصوص

حالات میں غیر مسلح عمل بھی جہاد ہے۔ یہ تصور تو صحیح نہیں ہے کہ ہر کار خیر جہاد ہے۔ احادیث میں جو بعض اعمال کو جہاد کہا گیا ہے تو ان کا مطلب ان کے سیاق کی روشنی میں علمائے اسلام کے نزدیک یہ ہے کہ ان اعمال میں جہاد کا سا ثواب ہے۔ ہاں البتہ قرآن کے ان استعمالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ اللہ کے دین کے سامنے اس کے مخالف جو چیلنج رکھیں اس کے مقابلہ کے لئے قربانی دے کر اور مشقتیں برداشت کر کے دین کی مدد کی جو کوشش اس زمانے اور حالات کے لحاظ سے مناسب ہوگی وہ ضرور جہاد قرار پائے گی۔

آگے ہم ایک مناسب موقع پر تفصیل سے بیان کریں گے کہ اگر کسی جگہ اور کسی دور کے مسلمان اپنے آپ کو اس درجہ مغلوب اور کمزور پاتے ہوں کہ وہ مسلح جہاد وقتال کے ذریعہ ظالموں سے پنجہ آزمائی نہیں کر سکتے تو ان کا جہاد یہی ہوگا کہ وہ دین کی نصرت و مدد اور اہل ایمان کے استحکام کی ممکن حد تک پرامن جدوجہد کریں اور اس راستے میں اپنے جان و مال کے ذریعے متوکلانہ مجاہدہ کریں۔ یہی ان کا جہاد ہے اور اسی پر ان کو بشرط اخلاص (انشاء اللہ یقیناً) مجاہدین کا ثواب اور مرتبہ ملے گا۔

پھر بعد میں رسول اللہ کی زندگی ہی میں ایک دور وہ آیا کہ اسلامی معاشرہ نے ایک منظم ریاست کی شکل اختیار کر لی۔ اب اس کے خلاف ان دشمنوں نے مسلح حملوں اور یورشوں کا سلسلہ شروع کیا، جو اسلامی دعوت کو اپنے مذہب، تہذیب اور سیاسی نظام کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ اس صورت حال میں مسلمانوں نے اپنے اور اپنے دین کے ان دشمنوں سے اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے تحت جو جنگیں کیں ان کو قرآن نے اور اللہ کے رسولؐ نے جہاد کا اصطلاحی نام دیا۔ اس طرح: جہاد: مخصوص مقاصد کے لئے، مخصوص شرائط اور قوانین کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے ایک اسلامی اصطلاح قرار پائی۔

فصل دوم

انسانی جان کا احترام:

اسلامی جہاد وقتال کے سلسلے میں سب سے پہلے اجمالی طور پر یہ بات قابل غور ہے کہ کہ قرآن وسنت میں جہاد کی تعلیم امن وسلامتی، انسانی جانوں کے تحفظ اور آزادی کی حفاظت کے لیے دی گئی ہے۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ جو قرآن جہاد کے لئے اپنے متبعین کو نہایت سرگرمی کے ساتھ آمادہ ومہمیز کرتا ہے، وہ ان کے دلوں میں انسانی جان کے احترام کی کیسی تعلیم جاگزیں کرتا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ اس کے رسول نے کسی بھی انسان کی جان ہی نہیں مال کو بھی کس درجہ کے تقدس کا مقام دیا تھا:

مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً (المائدة: ٣٢)	جو کسی کو قتل کرے بغیر اس کے کہ اس (مقتول) نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد و بدامنی پھیلائی ہو تو گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا۔

ناحق قتل کرنے کو دنیا کے سارے قانون جرم قرار دیتے ہیں، مگر دین حق جانوں کو صرف قانونی تحفظ فراہم نہیں کرتا کہ بس قانون کے ڈر سے ناحق خون سے پرہیز کیا جائے، بلکہ وہ انسانی جان کے تقدس واحترام کو قلبی شعور کی گہرائیوں میں اتار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کوئی کسی انسان کو ناحق قتل کرتا ہے وہ عظیم گناہ کا مرتکب اور خداوندی سزا کا مستحق ہوگا۔ یہاں قرآن اس کو شرک جیسے ناقابل معافی گناہ کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهاً آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِيْ

حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً

يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَاناً

(الفرقان: ٦٨۔۔٦٩)

رسول اللہؐ نے قتل کو شرک کے ساتھ سب سے بڑا گناہ قرار دیا[1]۔ اور صاف خبردار کیا ہے کہ قیامت میں خداوند قہار کی عدالت سب سے پہلے انسانوں کے خون کے مقدمے نپٹائے گی[2]۔

جان کا یہ احترام ہر مسلم و غیر مسلم کی جان کو حاصل ہے۔ رسول اللہؐ نے واضح طور پر فرمایا کہ اگر کسی نے کسی ایسے غیر مسلم کو قتل کیا جس کے ساتھ علانیہ جنگ نہیں تھی یا اس کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کا معاہدۂ امن تھا تو اس پر جنت کی خوشبو تک حرام ہے، من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة[3]۔

جنگ کی اجازت کیوں؟

جنگ ایک تباہ کن چیز ہے۔ انسانی خون بہائے بغیر جنگ کا تصور نہیں۔ اور انسان کی جان کا کیسا احترام اسلام نے سکھایا ہے اس کو آپ دیکھ چکے۔ اسی لیے قرآن نے جہاں جنگ کی تعلیم دی وہاں اس غیر معمولی حد تک تباہ کن چیز کے جواز کے اسباب بھی بتادیے ہیں۔

قرآن نے مسلمانوں کے لیے جس وقت جنگ کرنے کی اجازت دی ہے اسی وقت جنگ کے جواز (Justification) کے سبب کے طور پر یہ بات بیان کی ہے کہ:

---

[1] صحیح بخاری ۶۸۷۱

[2] صحیح مسلم ۱۶۷۸

[3] صحیح بخاری ۳۱۶۶

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا	جن لوگوں پر جنگ مسلط کی جا رہی ہے ان کو (اب) اجازت دی جا رہی ہے اس لیے کہ وہ مظلوم ہیں۔

یعنی مکہ کے ظالموں نے لوگوں کے لیے آزادی کے ساتھ اللہ کے دین پر قائم رہنا مشکل کر رکھا ہے، پہلے انہوں نے مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں پر دائرۂ حیات ایسا تنگ کیا کہ انہیں اپنی متاعِ جان و ایمان بچا کر بھاگنا پڑا، اور اب وہ مدینے میں بھی ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دے رہے ہیں اور یہاں بھی ان کے خلاف مستقل جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف سے اس مذہبی جبر ''الفتنة'' کو ختم کرنے کے لیے قتل و قتال کی اجازت دی گئی ہے۔

اصل میں کسی نے یہ سوال کیا تھا کہ نبوت کی پارسائیوں کے ساتھ یہ جنگ وخونریزی کا کیا جوڑ؟ تو بتایا گیا کہ:

وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (البقرۃ: ۲۱۷)	''فتنہ'' (یعنی مذہب کی بنیاد پر ظلم) قتل سے بڑا جرم ہے۔

اسی سورت بقرہ میں اس سے پہلے جب پہلی مرتبہ قتال کا حکم مسلمانوں کو دیا جا رہا تھا، کہا گیا ہے کہ ان مسلمانوں کی جنگ پر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں، اس لیے کہ ان کے خلاف ان مکہ والوں نے خود جنگ چھیڑ رکھی ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ. وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَأَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ	اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو خود تم سے جنگ کر رہے ہیں، اور کوئی زیادتی مت کرنا۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اور ان کو جہاں پاؤ قتل کرو، اور انکو وہاں سے

مِنَ الْقَتْلِ (البقرة ۱۹۱-۲۹۱) سے (یعنی مکہ سے) بے دخل کرو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور ''فتنہ'' قتل سے بڑی برائی ہے۔

قرآن کی ان آیات میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ اپنی اصل میں ایک بری چیز ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت نمبر ۲۱۷ کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: **اي ان القتل وان كان فيه شر وفساد ففي فتنة الكفار من الشر والفساد ماهو اكبر منه**" (آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قتل و جنگ میں اگرچہ شر و فساد ہے مگر کفار کے ''فتنہ'' میں جو شر و فساد ہے وہ اس سے بڑا ہے)[1]۔

اسی لیے قرآن اخلاقی اعتبار سے اس کے جواز (Justification) کی وجوہات بتاتا ہے۔ مگر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس سے کہیں زیادہ بری بات اور انسانیت کے لیے خطرہ ''فتنہ'' ہے۔ اس لئے اس کو ختم کرنے کے لئے جنگ ناگزیر ہے۔ اور پھر قرآن اس جہاد کو ایک ناگزیر مجبوری کے طور پر بے دلی سے کرنے کا حکم ہی نہیں دیتا، بلکہ وہ اس کو اہل ایمان کا ایک مقدس فرض بتاتا ہے، اور اس پر جنت کے حور و قصور کا وعدہ کرتا ہے۔

قرآن تسلیم کرتا ہے کہ جنگ "البأس" ہوتی ہے (البقرہ ۱۷۷) جس کے معنی ہی خرابی اور نقصان کے ہوتے ہیں۔ مگر انسانی جان کے احترام پر مبنی ان تعلیمات کے ساتھ اسلام اس حقیقت کو (بعض دیگر مذاہب کی طرح) نظر انداز نہیں کرتا کہ کبھی کبھی قومیں شوریدہ سر ہو جاتی ہیں، اس وقت ان کو ظلم و فساد سے روکنے کے لیے جنگ ضروری ہو جاتی ہے۔ جب حکومتوں پر شیطان سوار ہو جاتا ہے، حکمرانوں کے منہ کو لوٹ اور خون کی چاٹ لگ جاتی ہے تو انسانیت کا وجود خطرے میں پڑ جاتا

---

[1] مجموع الفتاوی ۲۸/۳۵۵۔

ہے۔ ہوسناکیوں نے کتنے علاقے تاراج کیے؟ کتنی بستیاں اجاڑیں؟ کس قدر بچے یتیم کیے؟ کتنی بیواؤں کے سر سے آنچل کھینچے؟ اور اب تو زمانے کی ترقی نے وہ دلدوز منظر ہم کو دکھائے کہ الامان الحفیظ...... جسموں کے پرانچے اڑ رہے ہیں، بچوں کے چیتھڑے ہو رہے ہیں۔ اجتماعی قبروں اور اپاہجوں کی کھیپ کی کھیپ روز تیار ہے۔ کتنے آباد شہر برباد اور ویران کیے گئے؟ کتنی چہچہاتی بستیاں اور پر رونق محلے آج سسک رہے ہیں۔ زخمیوں کے لیے مسکن دواؤں تک پر پابندی ہے اور اوپر سے "بم پاشی" اور Carpet bombing۔ کیسے ظالم اور عقل کے دیوالیے ہیں وہ لوگ جو اب بھی ہم سے جہاد پر جواب طلبی کر رہے ہیں؟؟

یہ انسانی دنیا کی حقیقت ہے، اور اسلام دین حقیقت۔ وہ کسی طرح "پہاڑی کے واعظ" یا "صفا کے منادی" کی زبان سے یہ نہیں کہلا سکتا کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم بکمال نیازمندی اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ وہ کہتا ہے کہ ظالموں اور چیرہ دستوں کو لگام دینا انسانیت کی خدمت اور خداوند قدوس کو راضی کرنے والا کام ہے۔ انسانی خون کے احترام کی زبردست تعلیم کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ ایسے مظلوموں کو جن کی جان کے درپے کوئی ہو گیا ہو، اجازت ہے کہ وہ اپنی جان، مال، گھر اور آبرو بچانے کے لیے جنگ کریں۔ بلکہ صرف یہی نہیں جس ملک پر اس طرح کا ظالمانہ حملہ ہو گیا ہو اس کی حکومت پر جنگ کرنا فرض قرار دیا جاتا ہے۔

ساری دنیا کے قانونوں بلکہ انسانی ضمیر نے ہر مظلوم ملک کا حق اور ہر غیرت مند قوم کا فرض قرار دیا ہے کہ وہ حملہ آور کو جواب دے، جنگ تھوپے جانے پر نبرد آزما ہو، اور آسانی سے غلامی کی زنجیریں نہ پہنے۔ قرآن اس اجازت کا اعلان کرتا ہے کہ:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۔ (الحج ۳۹)	اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے (کہ وہ بھی

جنگ کریں) اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا

ہے۔

اور صرف اجازت نہیں، بلکہ جن اہل ایمان سے جنگ کی جارہی ہے، ان کو حکم ہے کہ وہ اپنے جسم و جان، دین و ایمان، اور حریت و آزادی کے تحفظ کے لئے، اگر مقدور ہو، تو ضرور جنگ کریں۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ. (البقرة ۱۹۰)	اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی ہے (کہ وہ بھی جنگ کریں) اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا ہے۔

یہ غیرت مندی اور حریت پسندی وہ جوہر ہے کہ اگر کسی قوم کے خمیر سے ختم ہو جائے تو اس کی زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ وہ قوم اخلاقی لحاظ سے بھی ہر طرح کے فساد اور ذلیل نفسیات کی شکار ہو جاتی ہے۔ اسلام جس کا اصل مقصد ساری انسانیت کو پاکیزہ کردار و اخلاق عطا کرنا ہے، اور جو اپنے ماننے والوں پر یہ بھاری ذمہ داری ڈالتا ہے کہ وہ ہر قسم کی بھلائی اور فضیلت کردار کا ایک حسین نمونہ بن کر سارے عالم کو اچھائیوں سے آراستہ کریں، وہ ان کے اندر کیسے غیرت وحمیت کی روح نہ پھونکتا؟ اور کیوں ان کو ہر طرح یہ تاکید نہ کرتا کہ وہ ظلم وتعدی کے خلاف ہر قربانی دیں؟

فصل سوم

جہاد کی خاص روح

وہ کون سے مقاصد ہیں جو جنگ کو جائز یا ضروری قرار دیتے ہیں، ہم آئندہ اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ لیکن یہاں ایک نہایت بنیادی حقیقت جان لینا ضروری ہے۔ اسلام کی نگاہ میں صرف جائز مقصد جنگ ہی جنگ کو جہاد فی سبیل اللہ نہیں بنا دیتا۔ بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے روحانی واخلاقی اصول اور قانونی پابندیاں ہیں جن کی پابندی جنگ کے "جہاد فی سبیل اللہ" قرار پانے کے لیے ضروری ہے۔

قومی جنگ ہرگز جہاد نہیں، چاہے جنگ کرنے والے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں:

جہاد کی ایک خاص روح ہے۔ کوئی قوم کتنے ہی جائز مقصد کے لیے جنگ کرے مگر ان مقاصد اور اصولوں کے علاوہ اس خاص روح کے بغیر اس کی جنگ جہاد نہیں ہو سکتی۔ جہاد کے بارے میں سب سے بڑی اور سب سے عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی قومی جنگ ہے۔ قومی جنگ یعنی وہ جنگ جو کوئی قوم اپنی طاقت بڑھانے اور دیگر قومی مقاصد کے لیے لڑتی ہے۔ اسلام ایسی جنگ کو فساد فی الارض قرار دیتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات پر گہری اور منصفانہ نظر ڈالنے سے

یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جائے گا۔ مزید توضیح کے لیے ہم یہاں یہ اصولی بات عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاد کی یہ ساری تعلیم مسلمان نامی کسی قوم کے لیے نہیں اتری تھیں۔ جہاد کے سلسلے میں ساری غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ "امت مسلمہ" کو دیگر قوموں اور حکومتوں کی طرح کوئی قوم یا وطنی یا نسلی گروہ سمجھا جاتا ہے، جو دنیا میں عیش و آرام والی زندگی اور عزت و افتخار کے ساتھ رہنے کو اپنا مقصد بناتی ہیں۔ امت مسلمہ کے بارے میں یہ بالکل غلط تصور ہے جو افسوس ہے کہ دوسروں کی طرح خود ہم میں سے اکثر کے دلوں میں بھی بیٹھ گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی پرچھائیاں اہل علم کی تحریر و گفتگو میں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ بحیثیت ایک انسانی گروہ کے اس امت کا اصل مقصدِ وجود آخرت کے عیش و سکون کو مطمحِ نظر بنا کر اللہ کی عبادت اور انسانوں کی خدمت اور ہدایت کے لیے بھرپور جدوجہد کرنا اور قربانیاں دینا ہے۔

امت مسلمہ کا خاص مقام و کردار:

یہ امت جب سیدنا محمد رسول اللہؐ کی زیر نگرانی قائم ہوئی تھی تو اس اعلان کے ساتھ قائم ہوئی تھی کہ:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران ۱۱۰)	تم (دنیا کی) سب سے بہتر امت ہو جو (انسانوں میں سے) نکالی گئی ہے اس لیے کہ تم لوگوں کی خدمت کرو (اور وہ اس طرح کہ تم) نیکیوں اور بھلائیوں کا حکم کرتے (اور ان کو عام کرتے) ہو اور برائیوں سے روکتے ہو، اور خود اللہ پر ایمان لاتے (اور ایمانی زندگی گذارتے) ہو۔

یعنی ایسی جماعت اور امت جو رنگ و نسل اور علاقہ و وطنیت کے بجائے فلاحِ انسانیت کے مقصد کے تحت خدا پرستی کے اصول پر قائم ہو اور ساری انسانیت کو خیر بانٹنا چاہے۔ پھر یہ جو امت قائم کی گئی تھی یہ صرف اس لیے "خیر امت" (سب سے بہتر امت) نہیں تھی کہ اس کے ہاتھ میں قرآن تھا، اور وہ وعظ و ارشاد اور دعوت و جہاد کے ذریعہ دنیا کو بھلائیوں کی طرف لاتی تھی اور برائیوں سے روکتی تھی، بلکہ اس کے ساتھ قرآن یہ بھی بتلاتا ہے کہ وہ جماعت ایمانی کردار کی بھی حامل تھی، اور اس کی زندگی مومنانہ زندگی تھی "وتومنون باللّٰہ"[1]۔

یہاں تک کہ قرآن نے بتایا کہ یہ امت "گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان" بن گئی۔ اور اس کو وہ عظیم مقام دیا گیا اور اس سے وہ غیر معمولی کام لیا گیا جو رسولوں سے لیا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ کے رسولوں کی دعوت ایسے واضح دلائل پر مبنی ہوتی ہے جو حق کو بالکل واضح کر دیتے ہیں پھر ان کی سیرت و کردار، ان کی بے نیازی و بے لوثی اور خلوص و خیر خواہی کسی ایسے سلیم الفطرت کے لیے جو حق پرستی کا کچھ بھی جوہر رکھتا ہو شبہ اور شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی، اس طرح ان کے ذریعہ اُن کے مخاطب

---

[1] "وتومنون باللّٰہ" کے معنی صرف اللہ و رسول پر یقین رکھنا نہیں ہیں۔ قرآن میں "ایمان باللّٰہ" کی اصطلاح کے معنی اکثر و بیشتر یہ ہوتے ہیں کہ ایمان جس حقیقت کا نام ہے وہ دل میں اتر جائے اور زندگی میں ایسی رچ بس جائے کہ ایک مومنانہ زندگی وجود میں آ جائے۔ اور اس کا حامل کچے مسلمانوں اور منافقین سے بالکل الگ اور ممتاز نظر آنے لگے۔ ایک مثال سے قرآن کے اس مفہوم کو سمجھنا آسان ہوگا۔ سورۂ حجرات میں ارشاد ہوتا ہے کہ "قالت الأعراب آمنّا، قل لم تومنوا ولکن قولوا أسلمنا، ولمّا یدخل الایمان فی قلوبکم" (بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے، کہہ دو نہیں، تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں۔ اس لیے کہ ابھی تک ایمان جس حقیقت کا نام ہے وہ تمہارے دلوں کے اندر نہیں اتری ہے)۔ اس کے علاوہ سورۂ نساء کی آیت ۳۸، ۳۹ اور ۶۵ سے بھی یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔

انسانوں پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے، (لئلایکون للناس علی اللہ حجة بعد الرسل. النساء ۱۶۵) اسی طرح امت مسلمہ کی پوزیشن یہ ہو گئی کہ اس کو پوری دنیا کے انسانوں پر اللہ کی حجت تمام کرنے اور حق کی گواہی دینے والا بنا دیا گیا۔ امت مسلمہ اس معاملہ میں کسی حد تک رسولوں کا سا مقام رکھتی تھی۔ ذیل کی آیت سے اس کی پوری تائید ہوتی ہے:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا	اور اس طرح ہم نے تم کو بہترامت بنایا
لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ	ہے، تاکہ تم گواہ بن جاؤ لوگوں پر اور
وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا	رسول گواہ ہو تم پر۔

(البقرة ۱۴۳)

یعنی امت مسلمہ کا منصب و مقام یہ ہے کہ وہ سراپا حق کی گواہی بن جائے اور خیر و صلاح کی منادی کر دے۔ جس طرح گواہوں کے سامنے آجانے اور گواہی دے دینے کے بعد کسی معاملہ میں اختلاف اور اشتباہ کی کوئی گنجائش نہیں بچتی اسی طرح یہ امت ایسی ہے کہ اس کے وجود میں آنے کے بعد دنیا کی جو قومیں اور جو علاقے اس کے مخاطب بنیں گے اُن کے لیے اللہ کے دین کی گواہی قائم ہو جائے گی اور اس میں کوئی شک شبہ نہیں بچے گا۔ پھر گواہی اور شہادت کی اس حقیقت کو مزید سمجھانے کے لیے ارشاد ہوا کہ تمہاری یہ گواہی قوموں کے حق میں ایسی ہی ہے جیسی گواہی رسول اللہؐ کی آمد کے بعد تمہارے سامنے قائم ہو گئی تھی اور اس نے تمہارے لیے کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

سورۂ حج کی آیت (۷۸) میں بھی یہی بات کہی گئی ہے، اور اس گواہی کی ادائیگی کو ہی جہاد کا اصل مقصد قرار دیا گیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے نبوت و رسالت کا عظیم ترین درجہ یہ بتایا ہے کہ کسی نبی

کی امت "خیر امۃ أخرجت للناس" قرار دے دی جائے،" اس طرح اس رسول کی بعثت کے ذیل میں ایک امت کی بھی بعثت ہو' شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کی بعثت ایسی ہی بعثت تھی، اور آپ کی بعثت کے تحت آپ کی امت بھی اقوام عالم کی طرف مبعوث ہوئی تھی۔ اور اسی لیے آپؐ نے اپنی امت کے لیے بعض احادیث میں بعثت کی اصطلاح تک استعمال فرمائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا "انما بُعِثتم مُیَسِّرِیْن، ولم تُبعَثوا مُعَسِّرِین"[1]

صحابۂ کرام نے بھی ایرانیوں سے کہا تھا کہ اللہ نے ہم کو مبعوث فرمایا ہے تاکہ ہم اللہ کے بندوں کو انسانوں کی بندگی سے اللہ کی بندگی کی طرف نکالیں، اور ایک تنگ و تاریک دنیا سے اور تمہارے ظلم واستبداد کے دین سے اسلام کے انصاف کی روشنی میں لا کر ان کی زندگی خوش گوار بنا دیں[2]۔

قرآن نے جس وقت امت مسلمہ کے اِس منصب شہادت و امامت پر قائم ہونے کا اعلان کیا تھا اُس وقت واقعۃً اس کا یہی حال تھا کہ وہ سراپا گواہی اور سراپا اللہ کی حجت بن چکی تھی۔ جو قوم بھی اُس کی مخاطب بنی وہ اس کے کردار و گفتار سے مسحور ہوئے بنا نہیں رہ سکی۔ اس کے افراد جدھر جاتے زمین پر نہیں، دلوں پر اپنا نقش چھوڑتے۔ سوائے کسی معاند و سرکش اور بد باطن کے کسی کے لیے ان کی دعوت کو جھٹلانا اور ان کے ہادیٔ برحق اور انسانوں کے خیر خواہ ہونے کے دعوے کو رد کرنا ممکن نہیں

---

1. صحیح بخاری ۲۲۰ و صحیح مسلم، ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ۔ ۲۴۶/۱ مطبوعہ مکتبہ حجاز، دیو بند۔

2. البدایہ والنہایہ ۳۹/۷۔ اصل میں اس زمانے میں ایران کے بادشاہوں کا دعویٰ تھا کہ وہ خدا کی نسل سے ہیں اور ان میں سورج دیوتا کا بروز ہے۔ پھر ان خداؤں کے لیے یہ ہر قسم کے استحصال کے لیے جواز بنتا تھا، اور اس طرح پوری قوم کو بری طرح کی غلامی اور استبداد کے شکنجے میں جکڑ لیا گیا تھا۔ یہ دراصل اسی طرف اشارہ تھا۔

ہوتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہ اس وقت جدھر گئے لوگوں نے اُن کے اِن دعووں کی تصدیق ہی کی۔ ایران سے جنگ کے موقع پر مسلمانوں کے دو سفیروں مغیرہ بن شعبہؓ اور ربعی بن عامرؓ نے رستم کے دربار میں الگ الگ وقتوں میں اعلان کیا کہ ہم کو اللہ نے مبعوث فرمایا ہے۔ ہمارا مشن سچی خدا پرستی عام کرنا، انسانوں کی فلاح و بہبود اور مظلوموں کی دادرسی ہے۔ دونوں مرتبہ رستم نے ان کے دعوے کی تصدیق کی اور ان سفیروں کی شخصیت سے اپنے تاثر اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور اپنے مشیروں سے خلوت میں بھی یہ شبہ ظاہر نہیں کیا کہ یہ سب صرف زبان کی مشق ہے۔ صرف رستم ہی نہیں مشرق و مغرب میں جدھر بھی عرب گئے تاریخ شاہد ہے کسی جگہ ان کے مفتوحوں نے ان کی نیت پر یہ شبہ نہیں کیا کہ یہ ملک گیری اور کشور کشائی کے لیے اٹھے ہیں۔

اس لیے مسلمانوں کی ہر جنگ جہاد نہیں ہو سکتی، قرآن و سنت نے جنگ کے جہاد کا درجہ پانے کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ متعین مقاصد کے لیے اور متعین اصولوں اور ضابطوں کے ساتھ لڑی جائے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے جنگ کے جہاد قرار پانے کے لئے اخلاقی ضوابط کی پابندی کس قدر ضروری ہے اور معمولی سی غلطیوں سے، ناانصافی اور زیادتی سے کس طرح ایک جنگ جہاد کے معیار سے گر جاتی ہے اس کا اندازہ رسول اللہؐ کے عہد کے اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ سفر جہاد میں لوگوں نے راستے پر اس طرح پڑاؤ ڈالا کہ راستے تنگ ہو گئے۔ آپؐ نے اعلان کروایا کہ جو راستے کاٹ کر بیٹھ جائے یا لوگوں کے لیے تنگی کا باعث ہو اس کا جہاد نہیں[1]۔

ان مقاصد اور قوانین کے خلاف جو بھی جنگ ہو گی قرآن اور اسلام کی نظر میں وہ فساد ہی ہو گی۔ اور قطعاً اللہ کو سخت غضبناک کرنے والی ہو گی۔

---

1. سنن ابوداود ۲۶۲۹

جنگ ہرگز نہیں، جہاد فی سبیل اللہ:

ظلم و تعدّی سے دفاع اور تھوپی ہوئی جنگ کا مقابلہ ایک مسلّم حق اور قومی فریضہ تو ہے ہی، مگر یہاں ایک اور پہلو کہیں زیادہ اہم اور قابلِ غور ہے۔

مدینہ میں جب قرآن اتر رہا تھا، اور رسولِ اسلام امتِ اسلامیہ کی تربیت ورہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا تھا، اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ دشمنوں کی لگاتار یلغار اور پے بہ پے حملوں نے مدینہ پر ایک طرح کا لرزہ طاری کر رکھا تھا، سب رات دن خوف میں رہتے[1]۔ قرآن میں جہاد کی یہ آیتیں ان ظالمانہ حملوں سے دفاع کی تیاری کا حکم لے کر جب آتی ہیں، تو یہ بھی بتاتی ہیں کہ تمہاری یہ جنگ اور مال وجان کی قربانی صرف قومی وسیاسی دفاع اور عزت وغیرت کے تحفظ کے لیے نہیں ہے، نہ تم اپنی آزادی وخود مختاری کی حفاظت کے لیے لڑ رہے ہو، بلکہ قرآن اُن کو بار بار یاد دلا رہا تھا کہ تم اپنی اس پوزیشن کو یاد رکھو کہ تم انسانوں کا کوئی عام گروہ نہیں ہو، تمہاری اٹھان دنیا کی لذتوں میں سے اپنا حصہ لینے کے لیے نہیں ہے۔ تم دنیا سے منہ موڑنے والے گروہ ہو۔ تم عبادت خداوندی اور ساری انسانیت کو نفع پہنچانے کے لیے ہمارے رسول کے گرد جمع ہوئے ہو۔ تم نے خدا سے عہد باندھا ہے کہ فقیرانہ زندگی کی ضرورت پڑی تو اس کو اختیار کر کے دوسروں کی ہدایت اور نفع رسانی کے لئے قربانیاں دوگے۔ اس لیے تم کو اپنے دفاع کے لیے جس جنگ کا حکم دیا جا رہا ہے یہ صرف دنیا کی عام جائز قسم کی بلکہ عام ضروری قسم کی جنگ نہیں ہے، بلکہ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یہ یقیناً ایک مقدس جنگ ہے، جو خدا کے لیے اور اس کے دین کے لیے لڑی جا رہی ہے۔

دنیا کی ہر قوم کو اپنے دفاع کے لیے ضرورت پڑنے پر معلوم ومسلّم اخلاقی حدود وقیود کے ساتھ جنگ کرنے کا حق حاصل ہے۔ مگر رسول اللہؐ نے صحابۂ کرام کو اس

---

[1] صحیح مسلم، ۴۴۱۰

جنگ کی جو فضیلتیں بتلائیں اس کا سبب یہ قطعاً نہیں تھا کہ ان کو آزادی اور قومی حقوق اور جان و مال کے تحفظ کے لئے جنگ کا حکم دیا جارہا تھا۔ بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ وہ زمین کا نمک بن گئے تھے۔ دنیا میں کوئی جماعت نہیں تھی (جس طرح پورے طور پر آج بھی نہیں ہے) جو خالص خدا کی عبادت و بندگی کے اصول پر قائم ہو۔ جس نے واقعۃً صرف الفاظ کی حد تک نہیں کردار سے یہ ثابت کر دیا ہو کہ وہ دنیا کی لذتوں کی حریص نہیں ہے، اس نے غربت اختیار کر کے دنیا کو ہدایت و انصاف بانٹنے کو مقصد بنایا ہوا ہے۔ تاریخ کی پوری روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ وہ دنیا سے بے رغبت تھے، اور اللہ کی بندگی اور اس کو راضی کرنے والی زندگی گذارنا چاہتے تھے۔ اب جب ظلم پیشہ اور زیادتیوں کی خوگر متعصب طاقتیں ان کے در پے ہوئیں تو ان سے کہا گیا کہ تم صرف اپنا تحفظ نہیں کر رہے ہو، بلکہ تم زمین پر اللہ کے دین کے محافظ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اِن جنگوں پر "جہاد فی سبیل اللہ" کا طغرا رکھا گیا۔ ہم قرآن و حدیث میں جہاد کی جو ترغیب پاتے ہیں اور اس پر جس عظیم ثواب کی بشارت سنتے ہیں اس کا یہی سبب ہے۔ اور وہ اسی ایمانی ماحول اور پس منظر کی آیات و احادیث ہیں۔

اس حقیقت کی گواہ وہ تاریخ ہے جس نے محمد رسول اللہؐ کے گھر کے ٹھنڈے چولھے دیکھے ہیں، جس نے ریکارڈ کیا ہے کہ آپؐ کے پیٹ پر پتھر بندھے ہیں۔ وہ روشن تاریخ جو بتاتی ہے کہ جب مدینہ میں خوش حالی آنے لگی تو بھی آپؐ کا گھر سُونا اور خالی ہی رہا۔ جو ہمیں دکھا رہی ہے کہ اس امت کے اکابر اور قائدین نے غربت و سادگی کے ساتھ ہی آخرت کا سفر کیا، جب کہ ملک میں خوش حالی کی ریل پیل شروع ہو چکی تھی۔ اور یہ بھی دیکھا ہے کہ: فاطمہؓ آتی ہیں کہ ابا جان! دیکھئے، چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے۔ جسم کمزور ہو گیا۔ علی بھی دمے کے مریض چل رہے ہیں۔ سنا ہے کچھ مال آپ کے پاس ہے۔ آپ بانٹیں گے ہی۔ کچھ ہمیں بھی مل جاتا!!۔ آپؐ

نے فرمایا: مدینہ کے یتیم باقی ہیں۔ تم ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ، ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو، یہ ساری دنیا سے بڑی دولت ہے۔

کیسا تابناک کردار ہے۔ سچ نور الٰہی سے روشن اور ضیا پاش۔

اور یہ بھی تاریخ کی پوری روشنی میں ثابت اور مسلم واقعہ ہے، اور جہاد پر غور وفکر کرنے والے ہر شخص کو اس پر پوری توجہ دینی چاہیے، کہ ابتدائی اسلامی فتوحات کے بعد قیصر و کسریٰ کے مفتوح علاقے عرب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خوش حال تھے۔ جب کہ اس سے پہلے ان میں سے کئی علاقوں (مثلاً عراق) میں شدید غربت تھی۔ کیا دنیا میں جنگوں کی تاریخ اس کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کی لوٹ کے اصول پر قائم حکومتوں نے دنیا میں کیا کیا، اس سے دنیا واقف ہے۔ پھر یہی مغرب کہاں سے یہ حوصلہ لاتا ہے کہ مسلمانوں سے جہاد کے بارے میں سوال کرے۔ پھر اسلام کے اس ہراول دستے نے ان قوموں کو ایسا گلے لگایا اور یہ قومیں بھی اسلام کی چوکھٹ پہ ایسی نثار ہوئیں کہ ان میں ہی مسلمانوں کے شاندار دینی وثقافتی اور تہذیبی مراکز بھی بنے، اور یہی قومیں اسلام کا ہراول دستہ بنیں۔

الغرض اسلام میں قتال کو جو ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا مقام اور درجہ دیا گیا، اور اس پر اس قدر اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا تو وہ اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ یہ مسلمانوں کے قومی دفاع کا ضروری ذریعہ ہے، اور یہ ایک باغیرت وخوددار قوم کے قومی، سیاسی اور اخلاقی وجود کے لیے ضروری ہے۔

بلکہ مسلمانوں کی جنگ کے جہاد بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اصل غرض وغایت قومی دفاع وتحفظ اور جان ومال کی حفاظت کے بجائے اللہ کی رضا وخدا پرستی اور اس کے دین کی حفاظت، انسانوں کی ہدایت وخیر خواہی اور ان کو شر وفساد اور ظلم وگمراہی سے بچانے کی سچی محبت ہو۔ اسی لیے آں حضرتؐ نے صاف طور پر سے

اعلان کر دیا کہ قومی جذبے سے لڑنے والے قطعاً مجاہد نہیں ہیں۔
حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے وہ بتاتے ہیں:

جاء رجل إلى النبيّ فقال: يا رسول الله ما القتال في سبيل الله؟ فان احدنا يقاتل غضباً ويقاتل حمية؟ فرفع اليه راسه فقال: من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله[1]

ایک آدمی رسول اللہؐ کے پاس حاضر ہوا اور دریافت کیا: اے اللہ کے رسول قتال فی سبیل اللہ ہے کیا؟ کوئی جوش غضب میں لڑتا ہے، کوئی حمیت قومی میں لڑتا ہے (تو کیا یہ بھی فی سبیل اللہ قتال ہوگا؟) آپؐ نے سر اٹھایا اور جواب دیا: جس کی جنگ کا مقصد (صرف) اللہ کا بول بالا کرنا ہوگا بس اسی کی جنگ اللہ کے راستے میں کہلائے گی۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد اور حدیث کے ہر مجموعے میں آپ کو رسول اللہؐ کے ایسے ارشادات بکثرت ملیں گے جن میں آپ نے پوری قطعیت اور وضاحت کے ساتھ اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ کا مقصد مسلمانوں کی قومی عزت وسربلندی ہرگز نہیں ہے۔

اوپر کے صفحات میں ہم نے جہاد کے جن مقاصد کا ذکر کیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے محض ظلم وتعدی سے دفاع اور انسانوں کو ظالموں کے جبر واستبداد سے بچانے کے مقاصد ہیں۔ دنیا کے سارے قوانین اور خیر وشر کے عام انسانی فہم کے لحاظ سے یقیناً یہ جنگ کے لیے معقول جواز (Reasonable Justification) فراہم کرنے والے اسباب ہیں۔ کسی بھی قوم کے حالات اگر اجازت دیں تو یہ اسباب

---

1 صحیح بخاری ۱۲۳، صحیح مسلم ۱۹۰۴

اگرچہ یقینی طور پر جنگ کو صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری اور غیرت مندانہ وخوددارانہ انسانی اوصاف کا لازمی تقاضہ قرار دیتے ہیں، مگر قرآن وسنت سے ہمیں یہ عظیم بات پتہ چلتی ہے کہ صرف اتنا ہی مسلمانوں کے لیے جنگ کو ”جہاد فی سبیل اللہ“ والی فضیلت کا درجہ دلانے کے لیے ہرگز ہرگز کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ مقام جب ہی اس کو حاصل ہوگا جب اس کا مقصد صرف وہی ہوگا جو اوپر بیان کیا گیا۔

جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی پہلی شرط یہی ہے کہ اس کام کے لیے انسانوں کا جو گروہ کھڑا ہو اس کی غالب جماعت کی ایسی تربیت کی جا چکی ہو، اور انبیاء علیہم السلام کے طریقے کے مطابق اس کے دلوں کا ایسا تزکیہ کیا جا چکا ہو کہ اس کے پیش نظر نہ اپنی اور اپنی قوم کی حکم رانی اور سیادت قائم کرنا ہو اور نہ کسی دوسری قوم کو زیر کرنا۔ اصل میں ان لوگوں کے علاوہ، جو واقعۃً حقیقی معنی میں اہل ایمان ہیں یا کم از کم ایمان کی حقیقت سے واقف ہیں، کسی اور کے لیے یہ تصور کرنا بھی نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ کوئی جنگ آزما گروہ جنگ کرے، اور جان و مال کی قربانی سے اس کا مقصد نہ مال غنیمت ہو نہ کشور کشائی، نہ قومی غلبہ نہ دشمن سے انتقام اور اس کو زیر کرنا، بلکہ صرف اللہ کی رضا وخوشنودی اور دنیا میں اللہ کے دین کی سربلندی اور انسانوں تک اس کے نور ہدایت کی روشنی پہنچانا، اور مظلوموں کی مدد اور انسانیت کی نجات ہی اس کی ساری قربانیوں کا مقصود ومطلوب ہو۔

ساری مشکل کی جڑ یہی ہے اور یہی جہاد پر ہونے والے شبہوں اور اعتراضوں کی اصل بنیاد ہے۔

مگر افسوس کہ اس زمانے میں مسلمانوں نے ہی ان مقاصد کو بھلا دیا۔ ہمارا عمومی حال قطعاً یہ امید نہیں دلاتا کہ اللہ کی نگاہ میں ہم کو اوپر ذکر کیے گئے مقاصد سے کوئی نسبت بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارا یہ حال ہماری ذلتوں اور مظلومیت کے علاوہ عام

انسانی دنیا کے لیے بھی بڑی بد قسمتی اور محرومیت کا سبب ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی حق پرست اور انصاف پرور امت نہیں ہے جو خدا کی بندگی کو اپنا مشن بنائے ہوئے ہو، اور اس مشن کی خاطر اپنی زندگی اور ساری لذتوں کو قربان کرنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ ولعل الله یحدث بعد ذلك امرا۔

جہاد کا تعلق ایمانی کردار سے:

مزید برآں مقاصد کی اس بلندی اور پاکیزگی اور اس قدر صاف نیتی اور خلوص کے ساتھ ساتھ قرآن نے یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ جن لوگوں کو مظلوم ہونے کی بنا پر اب جنگ آزما ہونے کی اجازت دی جا رہی ہے وہ عمل کی دنیا میں ایسے خدا پرست، صالح، عبادت گذار اور مخلوق خدا کے لیے نفع رساں جماعت ہیں کہ یہ طے ہے کہ اگر دنیا کی حکومت ان کے حوالے کی جائے گی تو وہ عام حکومتوں اور بادشاہتوں سے بالکل الگ طرزِ حکومت کی بنا ڈالیں گے۔ ان کی حکومت اپنے عمومی مقاصد اور پالیسی میں دنیا کی عام حکومتوں سے بالکل مختلف ہوگی۔ وہ حکومت واقتدار اور ملکی وسائل کو نیکی اور خدا پرستی عام کرنے اور نماز قائم کرنے میں صرف کریں گے۔ ریاست کی بنیاد خدا پرستی اور دولت کی منصفانہ اور فلاحی تقسیم پر رکھیں گے۔ زکوۃ کے اصول پر غریبوں کی خدمت کریں گے، اور بھلائیاں پھیلانے اور برائیوں سے روکنے کو اپنی حکومت کی پالیسی اور مقصد بنائیں گے۔

سورۂ حج میں صحابۂ کرام کو جہاد کی پہلی مرتبہ اجازت دینے کے فوراً بعد یہ بات بتلائی گئی ہے کہ اللہ کے یہ مظلوم بندے جن کو مسلح مقابلے اور جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے یہ ایسے ہیں کہ:

> ”اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے“۔

الَّذِيْنَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ
وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ .

مقاصد کی پاکیزگی، خلوص نیت اور جنگ کے دوران اسلامی قوانین وضوابط اورشرعی حدود کی پابندی کے علاوہ ایک ضروری ''بات اس آیت سے یہ معلوم ہوتی کہ مسلمانوں کا جو گروہ جہاد وقربانی کی اس مقدس راہ میں قدم اٹھائے، اس کو خدا پرستی میں ایسا مخلص اور اتنا پختہ وتربیت یافتہ ہونا چاہئے کہ جب اس جدوجہد کے نتیجے میں اس کو دنیا کے کسی حصے میں اقتدار وحکومت حاصل ہو جائے تو وہ حکومتی وسائل کو اپنی نفسانی خواہشات اور دنیاوی تمنائیں پوری کرنے کے بجائے خدا پرستی اور نیکی پھیلانے میں اور ہر قسم کی برائیوں اور خباثتوں سے دنیا کو پاک کرنے میں لگائے۔ اور حکومت اور اس کے خزانے ہاتھ آجانے کے بعد بھی خدا کی عبادت اور دنیا کی اصلاح ہی اس کا خاص مشغلہ اور نصب العین رہے''۔[1]

سورہ توبہ میں بھی مجاہدین کے ایمانی اوصاف کا تذکرہ اسی طرح کیا گیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی
أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ	جانیں اور ان کا مال جنت کے وعدے
يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ	پر خرید لیا ہے۔ ان کی شان یہ ہے کہ وہ
وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً فِي	(کسی دنیاوی مقصد کے لیے نہیں بلکہ)
التَّوْرَاةِ وَالإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ	اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں،
أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُواْ	پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی
بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَلِكَ	ہیں۔(جنت کا) وعدہ جو اللہ کے
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ(۱۱۱)	ذمہ واجب ہے، اور یہ بات (اللہ کی

---

[1] بین القوسین ماخوذ از دین وشریعت ص۱۹۹

الَتَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ
السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ
السَّاجِدونَ الآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ
وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللهِ وَبَشِّرِ
الْمُؤْمِنِيْنَ (التوبة ۱۱۱-۱۱۲)

مقدس کتابوں) تورات، انجیل اور قرآن میں لکھ دی گئی ہے۔ اور اللہ سے زیادہ وعدہ کو کون پورا کرنے والا ہو سکتا ہے۔ (تو اے ایمان والو!) اپنے اس سودے پر خوشیاں مناؤ جو تم نے (اپنے جان و مال کا) خدا سے کیا ہے۔ یہ تمہاری بڑی کامیابی ہے۔ (اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والے ان لوگوں کی نشانیاں یہ ہیں کہ یہ) گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں۔ اللہ کی حمد وثنا بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ کے دین کے لیے در بدر پھرنے والے اور سفر کرنے والے ہیں، رکوع و سجود کرنے والے ہیں۔ یہ نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ اور اللہ کی مقرر کردہ ساری حدوں کی حفاظت کرنے والے (یعنی شریعت کی پابندی کرنے والے ہیں) تو اے پیغمبر ایسے ایمان والوں کو (ہماری رضا و خوشنودی اور عظیم اجر وثواب کی) خوش خبری دے دو۔

یقیناً ایسی جماعت کا جہاد انسانیت کے لیے بڑی نعمت اور اللہ کا بڑا احسان

ہے۔اور اللہ نے جہاد کو اسی لیے انسانوں پر اپنا انعام اور فضل قرار دیا ہے۔ **ولـــو لا دفـع الـلـه الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض، ولكن الله ذو فضل علـى الـعـالمين**۔یعنی اگر اللہ لوگوں کے ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کیا کرتا تو زمین میں فساد پیدا ہو جاتا۔مگر اللہ سارے جہانوں پر بڑا کرم اور احسان کرتا ہے کہ ان جنگوں کے ذریعے وہ زمین کو فساد سے بچا لیتا ہے۔

اسی لئے قرآن اس جماعت کو مخاطب بنا کر کہتا ہے:

ان لاتفعلوا تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر (الانفال)

اگر تم یہ (جہاد) نہیں کروگے تو دنیا میں بڑا شر و فساد پیدا ہوگا۔

کیسی خوبصورت اور سراپا حسن و جمال و خیر و خوبی ہے وہ تعلیم جس میں ان پاک مقاصد کے لیے ایسی پاکیزہ جماعت کی تیاری کا حکم ہے، کہ اگر دنیا میں شر اور ظلم سے انسانوں کے بچاؤ کا کوئی راستہ سوائے جنگ کے نہ بچے تو یہ پاکیزہ و خدا پرست جماعت اس قربانی کے لیے خالص قربانی کے اصول پر تیاری کرے۔

باب دوم

جہاد کے مقاصد

فصل اول

مذہبی جبر اور ظلم کے خلاف جہاد

ا۔ آزادیٔ دین کی خاطر جہاد:

قرآن نے حکم دیا تھا کہ مذہبی جبر کو ختم کرنے کے لیے مکہ والوں کے خلاف جنگ کی جائے۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے بندوں کو محض اس لیے قید کر کے شدید مظالم کا شکار بنا رکھا تھا کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لے آئے تھے۔ جن کی آہ و کراہ کی بازگشت مدینہ تک میں سنائی دے رہی تھی (نساء ۷۵)۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ	اور ان (مشرکین مکہ) سے جنگ کرو،
وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ	یہاں تک کہ "فتنہ" ختم ہو جائے۔ اور
(الأنفال ۳۹)	سارا دین اللہ کیلئے خالص ہو جائے۔

"فتنہ" کیا ہے:

اس آیت میں جو لفظ "فتنة" استعمال ہوا ہے، اور جس کے ختم کرنے کو جنگ کا مقصد بیان کیا گیا ہے یہ عربی زبان میں اصلاً آزمائش اور امتحان کے معنی میں آتا ہے۔ مشہور امام لغت ازہری اور ابن منظور نے لکھا ہے کہ یہ جہاں اور جس شکل میں بھی استعمال ہوگا اس میں امتحان و آزمائش کے معنی ضرور ہوں گے۔ بنیادی طور پر یہ سونے اور چاندی کو آگ میں تپا کر خالص کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے **فتنت الفضة والذهب** یعنی میں نے پگھلا کر ان کی میل نکال دی[1]۔ فقہ اللغۃ کی

---

[1] لسان العرب ۳۱۷/۱۳

معروف و مستند کتاب معجم مقائیس اللغۃ میں اس کے اصل اور عام معنی یہی لکھے ہیں (الفاء والتاء والنون أصل صحیح یدل علیٰ ابتلاء واختبار) اور کہا ہے کہ صرف چند کلمے اس مادے کے کسی اور معنی میں آتے ہیں، جن میں ایسا کوئی معنی نہیں ہے جو اس آیت میں مراد لیا جاسکتا ہو۔

تاریخ کے کسی دور میں بھی کفار اہل ایمان کو جبر و ظلم کے ذریعہ ان کے دین و ایمان سے پھیرنے اور اس پر قائم رہنا مشکل بنانے کے لیے جو بھی حربے آزمائیں اور ان کو جن آزمائشوں اور مشکلات سے دوچار کریں قرآن اس کو جابجا ''فتنۃ'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ مثلاً فرعون حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والوں کو ان کے دین سے پھیرنے کے لیے اور اپنے دینِ کفر کی طرف واپس لانے کے لیے جو سزائیں دیا کرتا تھا ان کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

فَمَآ آمَنَ لِمُوسَىٰٓ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن	موسیٰ پر فرعون کی قوم کے کچھ نوجوان ہی
قَوْمِهِۦ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ	ایمان لائے۔ (اور وہ بھی) ڈرتے ڈرتے
وَمَلَإِيْهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ.	کہیں فرعون اور سرداران قوم ان کو آزمائش
(یونس ۸۳)	میں نہ ڈالیں اور ایذائیں نہ دیں۔

سورہ بروج میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ	جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو
وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ	آزمائشوں میں ڈالتے ہیں اور ستاتے
عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ	ہیں ان کیلئے جہنم اور آگ کا عذاب ہے

ہمارے علماء سلف میں سے جن لوگوں نے ان آیات میں ''فتنۃ'' کے معنی شرک کے بتائے ہیں وہ دراصل ''تفسیر بلازم الشیٔ'' یعنی اس کے لازمی معنی سے تفسیر ہے۔ ورنہ فتنہ کے معنی عربی زبان میں جبر و امتحان سے خالی صرف شرک کے کبھی نہیں آسکتے۔

آپ اس کو آج کی زبان میں ''مذہبی جبر'' کہہ سکتے ہیں۔ آج کے زمانے میں توالحمدللہ دنیا میں شاید ہی ایسا مذہبی جبر کہیں موجود ہوگا جس کو اس طرح کا اصطلاحی ''فتنہ'' کہہ سکیں، جیسے فتنہ کا سامنا مسلمانوں کو مکہ میں تھا، یا جس کا سامنا فرعون کے ہاتھوں حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والے نوجوانوں کو کرنا پڑتا تھا۔ یورپ کی تاریخ میں Persecution کی اصطلاح تقریباً اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے۔

مذہبی جبر وظلم کے خاتمے تک جنگ جاری رکھنے کے حکم پر مبنی یہ آیت تقریباً انہی الفاظ میں سورۂ بقرہ میں بھی آئی ہے۔ سورۂ انفال اور سورۂ بقرہ دونوں جگہ آیت اپنے سیاق کے لحاظ سے بلاشبہ مکہ کے مشرکین کے سلسلے میں ہے۔ مگر کون شبہ کرسکتا ہے کہ کسی کو اپنے پسند کے مذہب وعقیدے سے جبر وظلم اور قتل وخونریزی کے ذریعے روکنا ایسا جرم ہے، کہ اگر اہل حق کے پاس استطاعت ہو تو وہ ضرور اس کے خاتمے کے لیے اٹھیں، اور اس راہ میں اپنی قربانیاں پیش کریں۔

۲۔ مظلوموں کو آزادی دلانے کے لیے جنگ:

مکہ کے جن اہل فتنہ یعنی مذہبی جبر کے مرتکبوں کا اوپر تذکرہ ہوا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو اس کے دین سے پھیرنے کے لیے ان پر ظلم وتعدی کرتے ہیں اور ان کو مبتلائے عذاب رکھتے ہیں، قرآن نے ان کے بارے میں جگہ جگہ بتایا ہے کہ یہ خدا کے دشمن اللہ کے کمزور بندوں کی جانوں کے درپے ہوگئے ہیں اور انہوں نے ان کی زندگی اجیرن کررکھی ہے۔ وہ ایک عرصے سے اپنی مظلومیت کی دہائیاں دے رہے تھے، اور سراپا دعا واستغاثہ تھے کہ کوئی نجات دہندہ آئے اور ان کو اس عذاب سے آزاد کرائے۔ مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو مکہ والوں سے خود ان کی چھیڑی ہوئی جنگ کا مقابلہ کرنے اور اپنی اور اپنے دین وایمان اور رسول اسلام وشہر اسلام کی حفاظت کرنے کا جب حکم دیا گیا کہ اب حالات ایسے آگئے ہیں کہ تم کو یک طرفہ صبر اور غیر

مشروط برداشت کا جو حکم دیا گیا تھا کہ "ہاتھ روکے رکھو" ("کفوا ایدیکم" سورۃ نساء ۷۷) اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اب تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان (مکہ والوں) سے جنگ کرو جنہوں نے تم پر جنگ مسلط کر رکھی ہے، تو جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ اس جنگ کی غایت اور اس کی انتہا کا ایک نشانہ یہ طے کیا گیا تھا کہ "فتنہ" یعنی مذہبی جبر اور دین وایمان سے روکنے کیلئے توڑے جانے والے مظالم کا سلسلہ بند ہو۔ ان مکہ والوں کے خلاف جب جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، تو اہل ایمان کو جنگ وقتال پر ابھارنے اور ان میں حمیت وغیرت پیدا کرنے کیلئے مکہ کے دبے کچلے مسلمانوں کی آہ وزاریوں اور عورتوں اور بچوں کے نالہ وشیون کا حوالہ دے کر کہا گیا کہ وہ بے چارے رات دن دعا کر رہے ہیں کہ اللہ کسی نجات دہندہ کو بھیجے جو انہیں ان ظالموں کے چنگل سے آزاد کرائے۔ کیا یہ دل فگار نالے بھی تم میں قتال کے لیے جوش پیدا نہیں کرتے؟

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ
الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ
لَدُنْكَ نَصِيرًا (النساء ۷۵)

ایسی زیادتیاں جن سے مظلوموں کے دلوں سے آہ وفغاں کے جگر خراش نالے نکلنے لگیں، کوئی قوم اگر اس کے خلاف متحرک نہ ہو، اس کی آرام وعشرت کی زندگیوں کی مٹھاس میں یہ آہ وکراہ کڑواہٹ نہ گھولے، تو کیا وہ انسانی احساسات سے بالکل محروم کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہوگی؟ کسی آسمانی دین میں اس کی گنجائش نہیں مانی جاسکتی کہ وہ انسانوں کو ایسا بے درد، بے رحم اور اس درجہ اپنے عیش وراحت میں مست رہنے کی اجازت دے سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے زمانہ نزول کے حالات میں ان آیتوں میں

جن مظلوموں کی مدد کے لیے مسلمانوں کو ابھارا گیا تھا، وہ مسلمان تھے، اور ان کو اسلامی برادری کے رشتے سے مزید حمایت ونصرت کا حق حاصل تھا۔ مگر اوپر آیت کے الفاظ گواہی دے رہے ہیں، اور آں حضرتؐ کے ارشادات نے مزید اس کو واضح کر دیا ہے کہ اگر مسلمانوں کی ریاست کے پاس استطاعت ہو تو وہ نسل کشی یا اجتماعی ظلم وتعذیب کی شکار ہر جماعت وقوم کو بچانے کے لیے حرکت میں آئے اور ظالموں سے مظلوموں کے لیے جہاد کرے۔ اسلامی مزاج اور دینی ذوق رکھنے والے کسی شخص کے لیے یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ اسلام مسلمانوں کی ایسی سراپا حسن وکمال تربیت کرنا چاہتا ہے کہ وہ دنیا کے سارے مظلوموں کے بے لوث و بے غرض پشت پناہ بنیں۔ آں حضرتؐ نے کس قدر تنبیہی انداز میں ارشاد فرمایا ہے:

> ”.........خبردار! تم کو اللہ کی قسم ہے، بھلائی کا حکم دیتے رہنا، برائیوں سے روکتے رہنا، ظلم کرنے والے کا ہاتھ پکڑ لینا اور اس کو حق دینے پر مجبور کرنا، اور اس کو راہ حق پر لانے کی کوشش کرتے رہنا۔ (جبھی تمہاری خیریت ہے) ورنہ اللہ تمہارے دلوں کو آپس میں ہی ٹکرا دے گا اور تم پر لعنت کرے گا جیسا کہ اس فریضے سے غفلت کی پاداش میں اس نے پچھلی قوموں پر لعنت کی[1]۔

ظلم کو مٹانے کی اس کوشش میں آں حضرتؐ نے اپنی متعدد احادیث میں صاف فرما دیا کہ اس میں اپنے اور غیر، اپنی قوم اور دوسری قوم کی کوئی تمیز اسلامی روح کے منافی ہے:

انصر اخاک ظالما او مظلوما۔	اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا
قلنا یا رسول اللہ، نصرتہ	مظلوم۔ ہم نے عرض کیا: مظلوم کی مدد

---

[1] ابوداؤد حدیث ۴۳۳۶ بسند صحیح

مظلوما فکیف انصرہ ظالما؟ قال: تکفہ عن الظلم فذلک نصرہ [1]

تو سمجھ میں آتی ہے، مگر ظالم کی کیسے مدد کریں؟ آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روک دو یہی اس کی مدد ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم قوم دنیا کے کسی خطہ میں شدید اور بے رحمانہ اجتماعی ظلم کی شکار ہو تو اسلامی جہادی تعلیم کا تقاضہ ہوگا کہ اللہ کے بندے بشرط امکان اس کو نجات دلانے کے لئے جنگ کریں۔

ایک نہایت اہم بات:

ظلم و تعدّی سے دفاع اور تھوپی ہوئی جنگ کا مقابلہ ایک مسلّم حق اور قومی فریضہ تو ہے ہی، مگر یہاں جہاد کا وہ پہلو جس کا ہم تفصیل سے ذکر بھی کر چکے ہیں، کہیں زیادہ اہم اور قابل غور ہے۔ اور وہ یہ کہ ظالم جارحیت سے دفاع کے لئے جنگ جائز ہونے کے باوجود اس وقت جہاد قرار پائے گی جب اس کا مقصد صرف اپنا تحفظ اور سلامتی نہ ہو بلکہ واقعہ یہ ہو کہ وہ جماعت دنیا میں خیر و فلاح پھیلانے کو اپنا مقصد زندگی اور انسانیت کی ہدایت و اصلاح کو اپنا مشن بنا چکی ہو۔ اس کی جنگ کا مقصد کسی قوم یا جماعت کی بقا و سلامتی نہیں بلکہ اس خاص مشن اور مقصد کی حفاظت ہو جس کے لئے وہ کمر بستہ ہے۔ جہاد میں جو "فی سبیل اللہ" کی قید لگی ہوئی ہے وہ اس پوری حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جہاد کرنے والی جماعت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایمانی اخلاقیات سے آراستہ اور مخصوص دینی جد و جہد اور ایمانی مشن کی حامل ہوں۔ اس نے زمین میں اللہ کی عبادت و اطاعت والی ایک خاص قسم کی زندگی کو اختیار کر رکھا ہو اور اسی کے فروغ کو اپنا اصل مشن بنا چکی ہو۔ جہاد کے اس خاص مقصد اور خاص روح کو نظر انداز کرنا یا اس کو کم اہمیت دینا سخت غلطی ہے۔

---

[1] سنن الترمذی ۲۱۶۷

فصل دوم

محاربہ علت القتال ہے
نہ کہ کفر یا شوکت کفر

تمہید: اس فصل میں قرآن وسنت اور سیرت نبوی کی شہادتوں کی بنیاد پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ (’فتنہ‘ اور ظلم کے علاوہ) محربہ علت القتال یعنی جنگ کا سبب ہے۔ جن لوگوں نے جہاد وقتال کو صرف دفاع کے ساتھ خاص کیا ہے ان سے غالبًا تعبیر کے انتخاب میں غلطی ہوئی ہے۔ اسلام نے (بشرط قدرت دفاعی جنگ کا بھی حکم دیا ہے اور اقدامی کا بھی۔ لیکن بامعنی صلح کی خواہش مند غیر مسلم ریاست سے جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ جہاد کی یہ تعبیر اور اسلامی احکام کی یہ تشریح کہ مسلمانوں کو مشرق ومغرب کے ہر کالے گورے غیر مسلم ملک پر، چاہے وہ جنگجو ہو یا صلح کرنا چاہے، جنگ مسلط کرنے کا حکم ہے اسلام دشمن لابیوں کی خدمت انجام دینا ہے کہ وہ مسلمانوں کی دشمنی پر ساری دنیا کو متحد کریں۔

اس فصل میں خاصی تفصیل اور دقیق علمی بحثیں کی گئی ہیں۔ اور اس کا ایک خاص محرک جدید حالات کا ایک نیا لیکن فوری تقاضہ بھی ہے، جس کی کسی قدر وضاحت فصل کے آخر میں کردی گئی ہے۔ اجمالاً وہ ضرورت یہ ہے کہ

> ہم ایک ایسے دور کی دہلیز پر ہیں جس میں دنیا کی قیادت مغرب خصوصاً امریکہ سے مشرق خصوصاً جنوبی ایشیا کے نئے ممالک کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ مستقبل میں یقیناً بین الاقوامی پالیسیوں کا محور ایشیائی مسائل و مصالح اور نئے افکار ہوں گے۔ لہٰذا فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے بارے میں "خطرہ" کے اس تاثر کو ختم کریں جو اس وقت موجود ہے اور مسلم دشمن لابیوں کے لیے پوری دنیا میں نہایت مفید حربہ اور ہتھ کنڈہ بنا ہوا ہے۔

اسلامی جہاد کے بارے میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اس کا مطلب مسلمانوں کو ہر غیر مسلم حکومت سے جنگ کی تعلیم و ترغیب ہے؟ یعنی کیا مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ان کے لئے ممکن ہو تو وہ ضرور غیر مسلموں سے جنگ کریں۔

اصولی طور پر سوال یہ ہے کہ کیا ظلم و جارحیت اور "فتنہ" یعنی مذہبی جبر کے خاتمہ کے علاوہ "کفر" علۃ القتال ہوسکتا ہے؟؟ یا اگر کفر نہیں تو کیا صرف غیر مسلم حکومت کے وجود کو جنگ کے لئے کافی جواز اور سبب قرار دیا جا سکتا ہے؟۔

ہمارے محدود مطالعے کی حد تک قدیم علمی و فقہی سرمایے میں اس طرح اصولی سوال قائم کر کے مسئلہ پر گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ لیکن اجمالی طور پر نصوص سے استنباط کر کے لوگوں نے تین رائیں قائم کی ہیں۔

۱) جنگ کا سبب علت القتال کفر ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے "وقاتلوهم حتىٰ لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله" سورۃ انفال: ۳۹۔ (ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ "فتنہ" نہ بچے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے خالص ہو جائے۔) واضح رہے کہ ہماری کتب تفسیر میں فتنہ کی تفسیر شرک سے بھی کیے جانے کی روایت موجود ہے۔ اور ویکون الدین للہ تو ظاہر ہے ہی۔

۲) جنگ کا سبب یعنی علت القتال کفر نہیں ہے بلکہ کفر کی حکومت ہے۔اس رائے کے حاملین کی اصل دلیل مندرجہ بالا آیت ہی ہے، یہ حضرات اس میں دین کو اطاعت اور قانون کے معنیٰ میں لیتے ہیں۔لہذا ان حضرات کے نزدیک اس آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ مسلمان غیر مسلموں سے اس مقصد کے تحت جنگ کریں تاکہ ان کے اوپر اللہ کا قانون نافذ ہو جائے۔

۳) علت القتال دفاع ہے، یہ حضرات قرآن کی آیت ﴿وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم﴾ البقرہ (اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو خود تم سے جنگ کر رہے ہیں)۔سے استدلال کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں ہی موقف اشکالات سے خالی نہیں ہیں۔البتہ یہ بات یقینی طور پر سامنے آتی ہے کہ سلف وخلف کے یہاں بڑی حد تک عام تصور یہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت غیر مسلموں سے صلح صرف مجبوری کی حالت میں (یعنی مقابلہ سے عاجزی، یا ایسی صورت میں جب کہ مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا ہو تو) ہی کر سکتی ہے۔مثلاً فقہ حنفی کی اہم کتاب ''بدائع الصنائع'' میں ہے کہ: صلح کے جائز ہونے کی شرط ضرورت ہے، یعنی یہ کہ مسلمان اس لئے صلح کریں کہ جنگ کی تیاری کریں گے، اور یہ ایسی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان کمزور ہوں اور کفار کو قوت حاصل ہو، لہذا بغیر اضطرار کے صلح جائز نہیں ہوگی۔اس لئے کہ صلح کا نتیجہ فریضۂ جنگ کا ترک ہے۔اس لئے یہ اس وقت ہی جائز ہوگی جب یہ جنگ کے وسیلہ کے طور پر ہو، اس لئے کہ ایسی صورت میں صلح درحقیقت جنگ ہی مانی جائے گی کہ وہ جنگ کی تیاری کے لئے ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فلا تهنوا وتدعوا إلى السلم وأنتم الأعلون والله معكم (یعنی کمزوری مت دکھاؤ کہ صلح کی دہائی دینے لگو، اور تم ہی برتر ہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے) ہاں مجبوری میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ اللہ

تعالیٰ کہتا ہے: وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی الله" یعنی، اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جانا، اور اللہ پر بھروسہ کرنا۔[1]

بعض فقہاء نے صلح کے جواز کے لئے اضطرار اور مجبوری کی سخت شرط نہ لگاتے ہوئے ذرا زم لفظ مصلحت یا مسلمانوں کے مفاد کا خیال (النظر للمسلمین) جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔[2]

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ:

فإذا لم یکن في الموادعة مصلحة فلا یجوز بالاجماع.[3]	اگر صلح میں مسلمانوں کی مصلحت نہ ہو تو بالاجماع ناجائز ہے

تقریباً تمام ہی مسالک کی کتابوں میں اس قسم کی تصریحات ملتی ہیں۔ بلکہ یہ مزید وضاحت بھی فقہاء کرتے ہیں کہ اگر دوسرے ملک صلح کی پیشکش بھی کرے تو حاکم دیکھے گا اگر مسلمانوں کی مصلحت ہوگی تو قبول کر سکتا ہے اور اگر مسلمانوں کا فائدہ نہ ہو تو قبول نہیں کرے گا۔[4]

بہر حال اس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ عموماً علماء و فقہاء کے نزدیک قتال کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مخالف کی طرف سے جارحیت و ظلم یا مذہبی جبر (جسے

---

[1] بدائع الصنائع: ۶/۱۰۷، نیز ملاحظہ ہو: الأم ، باب المهادنة ، شرح السیر الکبیر ، باب الموادعة

[2] ملاحظہ ہو: الأم للشافعي ، کتاب الجهاد ، باب المهادنة علی النظر للمسلمین، شرح السیر الکبیر للسرخسي)

[3] شرح فتح القدیر، کتاب السیر، باب الموادعة

[4] الأم : باب مهادنة من یقوی علی قتاله ، المبسوط باب صلح الملوک والموادعة)

قرآن نے فتنہ کہا ہے) پایا جائے۔ بلکہ مقدور ہو اور کوئی نقصان یا مضرت نہ ہو تو ہر غیر مسلم حکومت سے جنگ ہی کی جائے گی۔

اہم سوال:

اب اس پر سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ جنگ جو اصلاً خونریزی ہے اور قرآن اس کو شر ہی کہتا ہے، کہیں اس کو "البأساء" (خرابی) کا نام دیتا ہے اور کہیں اس کو شر مانتے ہوئے بڑے شر یعنی ظالمانہ مذہبی جبر کے لئے ایک ناگزیر اقدام بتاتا ہے، ایسی صورت میں اس جنگ کا سبب اور علت کیا ہے؟ کیا صرف کفر ہے؟؟ یا کفر تو نہیں بلکہ "شوکت کفر" یا غیر اسلامی حکومت ہے؟؟۔

اگرچہ فقہاء امت کی تصریحات کے تجزیے سے یہ بات تو غلط ہی ثابت ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک قتال کی علت کفر ہے۔ لیکن اس کے باوجود علماء کے یہاں استثنائی طور پر اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں کہ قتال کی علت کفر ہے۔ مثلاً امام قرطبی سورۃ بقرہ کی آیت ۱۹۳ ﴿وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

> یہ مطلقاً قتال کا حکم ہے۔ اس میں کفار کے حملہ میں ابتداء کرنے کی شرط نہیں ہے۔ اس کی دلیل ﴿ويكون الدين لله﴾ (یہاں تک کہ دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے) ہے، اور یہ حدیث بھی کہ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ "لا إله إلا الله" پڑھ لیں"۔ اس آیت اور حدیث میں اس کی دلیل ہے کہ قتال کا سبب کفر ہے۔[1]

البتہ یہ اصول جمہور علماء وفقہاء کے قول سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ ان

---

[1] الجامع لاحکام القرآن تفسیر آیت مذکورہ

کے نزدیک اگر غیر مسلم اپنے کفر پر باقی رہتے ہوئے مسلم حکومت کے تابع ہوکر جزیہ کی ادائیگی پر صلح کر لیں تو یہ معاہدہ قبول کرنا لازم ہوگا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ''کفر'' بطور ایک نظریہ و مذہب دنیا میں قابل برداشت چیز ہے، اور اس کا خاتمہ جنگ کی غایت نہیں۔ اگر قتال کی علت کفر ہوتی تو اس وقت تک جنگ جاری رہنی چاہئے جب تک تمام کفار مسلمان نہ ہوجائیں، اور یہ جائز نہ ہوتا کہ جزیہ پر صلح کر لی جائے۔ یہاں تک کہ ہتھیار ڈالنے والوں کے لئے بھی بس دو ہی راہیں ہوتیں: یا اسلام قبول کریں یا قتل کیے جائیں۔ اس طرح یہ نظریہ قرآن کے بیان کردہ بنیادی اصول لا إكراه في الدين (دین میں کوئی زبردستی نہیں) کے صریح منافی قرار پاتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ نفس کفر جنگ کا سبب یا علت قتال ہے تو کفر تو جنگ کے خاتمے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اس کا خاتمہ تو جنگ کے بعد بھی نہیں ہوتا۔

اس تجزیاتی غور و فکر کے بعد متقدمین فقہاء و علماء کے نقطۂ نظر کے اصول کے طور پر ہمارے سامنے دوسرا یہ نظریہ آتا ہے کہ قتال کی اصل علت اور سبب شوکت کفر یا غیر مسلم حکومت کا وجود ہے۔ اس نظریے کی رو سے کفر جنگ کا سبب نہیں ہے۔ غیر مسلم بطور مسلم ریاست کے شہری (ذمی) کے اپنے کفر پر باقی رہ سکتے ہیں ہاں اگر مسلمانوں کو قدرت ہوگی تو وہ جنگ کر کے غیر مسلموں کی حکومت کو بے دخل کر کے عوام پر اسلام اور مسلمانوں کی حکومت ضرور قائم کریں گے۔

(ہم آگے اس موقف کی مدلل حمایت کر کے اپنا یہ نقطۂ نظر ظاہر کریں گے کہ یہ (اپنے زمانے اور ماحول میں) ایک بالکل برحق اور منصفانہ موقف تھا)۔

سب سے اہم سوال:

مگر یہاں سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ کسی غیر مسلم قوم کو کس جواز کی بنا پر اپنے اس حق سے محروم کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے اوپر اپنے لوگوں کی اور اپنے پسندیدہ اصولوں اور

نظریات کے مطابق حکومت قائم کرے؟؟؟ اس سوال کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عام انسانی اخلاقی حس کے مطابق یہ موقف ایک اشکال کا باعث بنتا ہے کہ مسلم ریاست صلح صرف اپنی مصلحت اور ضرورت کے تحت ہی کر سکتی ہے قدرت وطاقت ہو تو اس کو ہر مملکت سے جنگ ہی کرنی ہے چاہے وہ کیسی ہی بے ضرر اور صلح جو ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا مودودی کا نظریہ:

اب سے دو صدیوں پہلے جب مغرب کی فوجی یورش کے ساتھ ساتھ مسلمان اور اسلامی عقائد و احکام بھی فکری یلغار کا نشانہ بنے تو جو دلیر اسلام کے دفاع کے لیے سب سے پہلے کھل کر سامنے آئے ان میں شبلیؒ و مودودیؒ کا نام نمایاں ہے۔ موخر الذکر کی کتاب الجہاد فی الاسلام اپنی شہرت اور اپنے پر اعتماد انداز کے اعتبار سے ممتاز ہے اور مصنف کی محنت اور ماخذ کی کثرت کی شاہد بھی۔ مگر کتاب میں آبشار کا جوش اور فکر وخیال کی روانی تو ہے مگر فاضل مصنف کیعمر اس وقت تیس بھی نہیں تھی اور اس کو کتاب ہفتہ وار اخبار (الجمعیۃ) کی متواتر قسطوں میں پیش کرنی تھی، اس لیے اس کے پاس غور وتدبر کے لیے وقت بھی کم تھا۔

موصوف کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ ایک طرف تو قرآن مذہب کے معاملے میں جبر واکراہ کی کھلی نفی کرتا ہے، تو پھر اس کی کیا توجیہ کی جائے کہ صدیوں پر مشتمل اسلامی فکر کا حاصل یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو مسلمان ریاست جنگ ہی کرے گی، صلح صرف مصلحۃً ہی کی جائے گی۔ موصوف کی عبقری ذہانت نے اس کا جو حل دریافت کیا وہ بہت سے لوگوں کے لیے اسلامی فلسفہ بن چکا ہے۔ مولانا مرحوم کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلام انفرادی طور پر ہر فرد بشر کو مذہبی آزادی تو دیتا ہے، لیکن وہ اسلام کے مخالف عقیدہ وفکر کو حکومتی طاقت اور شوکت رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، اس

لیے کہ (ان کے بیان کے مطابق) قرآن میں جن چیزوں کو فتنہ اور فساد کہا گیا اور جن کے خاتمے کو جہاد و قتال کا مقصد اور غرض و غایت بتلایا گیا ہے وہ "سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس اور بداصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں"۔[1]

عالم عرب میں مولانا کے ایک خاص خوشہ چیں انقلابی مفکر سید قطبؒ ہوئے، جو اپنے انقلابی فکر اور جوش تحریر میں مولانا مودودیؒ سے کہیں آگے تھے۔ مصر میں ناصر کے آمرانہ استبداد کے زمانے میں جب عموماً اسلام پسند حکومت کی مغرب پرستی سے سخت نالاں تھے اور دین دشمن حکومت کی مخالفت کی پاداش میں اخوان المسلمین پر سخت مظالم کا سلسلہ جاری تھا، سید قطب کا شعلہ بار قلم (جس کے جوش و زور کی کوئی نظیر معاصر عربی ادب میں نہیں پائی جاتی) اسلامی انقلاب کی ندا لگا رہا تھا۔ سید قطب نے مولانا مودودی کے دیگر تحریکی نظریات کی طرح اس فلسفے کو بھی اخذ کیا اور اپنی تفسیر میں اور (دیگر تصنیفات میں بھی) مولانا مودودی سے کہیں زیادہ قوت اور تفصیل و تکرار سے بیان کیا۔ یہاں تک کہ یہ ایک حد تک مقبول نظریہ بن گیا۔

مولانا نے بھی فقہاء کی بیان کردہ تفصیلات کا خلاصہ اور حاصل یہی اخذ کیا کہ مسلمانوں کے لئے یہ بات شرعی فریضہ کا درجہ رکھتی ہے کہ اگر حالات اجازت دیں تو وہ ہر غیر مسلم قوم سے حکومت چھین لیں اور ان پر مسلمانوں کی (بلکہ مولانا کے الفاظ میں اللہ کے صالح بندوں کی) حکومت قائم کریں۔

یہ کم علم اپنی کم علمی کے احساس کے باوجود پورے یقین کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ اس موقف کی کیسی ہی موثر ترجمانی کی جائے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ (کم سے کم اس زمانے میں) یہ اشکال کا باعث ہے۔ اگر کوئی حکومت نہ اپنے عوام پر کسی سخت ظلم کی مرتکب ہے اور نہ دوسری قوموں پر کسی جارحیت کی مجرم، ساتھ ہی وہ

---

[1] الجہاد فی الاسلام ص ۱۱۷

اپنے یہاں بسنے والے مسلمانوں کو اللہ کے دین پر چلنے کی مکمل اجازت دیتی ہے، اور اللہ کے دین کی دعوت کے سامنے رکاوٹ بھی نہیں بنتی اور مسلمانوں کی حکومت کی طرف صلح وآشتی کا ہاتھ بھی بڑھاتی ہے تو کس اخلاقی جواز کے تحت اس حکومت پر جنگ تھوپی جاسکتی ہے۔ اور کیسے کسی قوم کو اس حق سے محروم رکھا جاسکتا ہے کہ اس کا سیاسی نظام اس کے اپنے لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ کسی قوم سے خودمختاری سلب کرلینا انسانی عرف میں یقیناً ظلم ہے۔

مولانا مودودیؒ اس اشکال کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے انہوں نے وکیل کی حیثیت سے اپنے موقف کے دفاع میں یہ نظریہ پیش کیا کہ قرآن نے فتنہ کے خاتمہ کو قتال کا مقصد کہا ہے۔ اب ایک نظر ڈالی جائے کہ قرآن میں کن کن برائیوں کو ''فتنہ'' یا ''فساد'' کہا گیا ہے۔ ان برائیوں اور خرابیوں کو گنانے کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

''اب اگر ان تمام برائیوں پر ایک غائر نظر ڈالی جائے جن کو فتنہ وفساد سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخداترس، اور بداصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو کم از کم اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا تو یقیناً اسی حکومت کے باطل پرور اثرات کا رہین منت ہوتا ہے''[1]

اسی وجہ سے مولانا کے بقول اسلام نے بدی کے خاتمے کے لئے حکم دیا کہ ایک منظم جدوجہد (جہاد) کے ذریعہ اور اگر ضرورت پڑے اور ممکن ہو تو جنگ کر کے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے۔ اور اسکی جگہ وہ عادلانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جو خدا کے خوف اور اسی کے نازل کردہ ضابطوں پر مبنی ہو اور جو انسانوں کے مفاد کی

---

[1] الجهاد في الإسلام ص:۱۱۷

خدمت کرے[1]۔

اس نظریہ کے خلاف تین طاقتور دلائل:

اول۔ اس نظریہ کے خلاف سب سے پہلے جو چیز جاتی ہے وہ یہ کہ اسلام کی ایک بنیادی تعلیم دین کے معاملے میں آزادی اور انصاف ہے۔ کسی قوم کو اپنی حکومت سے بے سبب محروم کرنا اور اس پر دوسری قوم کی حکومت قائم کرنا فطری طور پر انصاف کے خلاف نظر آتا ہے۔ اسلامی دعوت کے لئے ضروری ہے کہ اسلام اپنے زمانے میں سب سے برتر اور متوازن اخلاقی معیار پر قائم نظر آئے۔ اگر ایسا نہیں ثابت ہوتا تو اسلام کا اکیلے محفوظ ہدایتِ ربانی اور قانونِ الٰہی ہونے کا دعویٰ مشتبہ ہوجائے گا۔ لہٰذا علماء اسلام کا اہم ترین فریضہ قرار پاتا ہے کہ وہ ہر زمانے میں پوری بیدار مغزی سے اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لیں اور بلا خوف لومۃ لائم قرآن وسنت پر مبنی اسلامی قوانین کا اظہار کریں۔ اس میں ان کو نہ باطل کی یورش کا خوف ہو نہ کسی قسم کی بدنامی کا اور نہ اپنوں یا غیروں کی ملامت کا۔

دوم۔ دوسری جو چیز اسی نظریہ کے خلاف جاتی ہے وہ یہ آیت قرآنی ہے:
﴿وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل﴾ یعنی اگر یہ خدا اور مسلمانوں کے دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح پر آمادہ ہوجانا۔

یہ آیت غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی۔ اس سے صلح کا کس درجہ مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کے لیے صرف اس کا سادہ سا مطلب جان لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کس درجہ اس کو اہمیت دیتا ہے کہ فریق مخالف اگر آمادۂ صلح ہو تو صلح کر ہی لی جائے۔ اس آیت میں غور سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا حکم مجبور و کمزور کی دبی کچلی صلح کا نہیں ہے، نہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ

---

[1] الجہاد فی الاسلام ص ۱۱۷۔۱۱۸ باختصار

دیکھا جائے کہ صلح میں ہمارا فائدہ ہے کہ نہیں۔ یہ سورت انفال کی آیت ہے۔ اس سورت میں مسلمانوں کو مکہ کے مشرکین سے جنگ کے احکام دیے گئے اور ایک طویل سلسلۂ آیات میں مسلمانوں کے اندر قتال کے لئے جوش وحمیت پیدا کی گئی ہے۔
آیات پر غور کی نگاہ ڈالیں:

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّهِ الَّذِينَ كَفَرُواْ فَهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ. الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لاَ يَتَّقُونَ. فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ. وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاء إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبُّ الخَائِنِينَ). وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ سَبَقُواْ إِنَّهُمْ لاَ يُعْجِزُونَ. وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدْوَّ اللّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لاَ تَعْلَمُونَهُمُ اللّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لاَ تُظْلَمُونَ. وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. وَإِن يُرِيدُواْ أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّهُ هُوَ الَّذِيَ أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ. وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً مَّا أَلَّفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَـكِنَّ اللّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ. يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُواْ مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ يَغْلِبُواْ أَلْفاً مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لاَّ يَفْقَهُونَ. الآنَ خَفَّفَ اللّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفاً فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُواْ مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُواْ أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللّهِ وَاللّهُ

مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ (الانفال: ٥٦۔٦٦)

یہی سلسلۂ بیان جب اپنے عروج پر یہاں پر پہنچا کہ:

اوران دشمنانِ خدا کے مقابلے کے لئے جو ہو سکے وہ اسلحہ تیار کرو (اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔) اور گھوڑے جنگ کے لئے تیار رکھو، جس سے تمہارا رعب اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن کے دل میں بیٹھے۔

اور اس کے بعد اس جہاد وقتال کی تیاری میں اپنا مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی۔ جہاد وقتال پر آمادہ کرتے ہوئے، اور جہاد وقتال کے لیے جوش دلانے والے اسی ولولہ خیز سلسلۂ کلام میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

”اگر یہ (خدا و مسلمانوں کے دشمن، اپنی دشمنی کے باوجود) مصالحت کی طرف جھکتے ہیں تو تم بھی اس کی طرف جھک جانا، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔۔ بے شک وہ (سب) سننے اور جاننے والا ہے۔ اگر ان کی نیت تم کو دھوکہ دینے کی ہوگی تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔

کلام کے سیاق وسباق پر غور کیجئے۔ یہ موقعہ مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے اور ان میں اس کی تیاری کے لئے جوش وحمیت پیدا کرنے کا ہے۔ مگر اس موقعے پر بھی کہا جاتا ہے کہ دشمن اگر صلح پر آمادہ ہوتا ہے تو صلح کرنے کا حکم ہے۔ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ دشمن صلح کے بہانے دھوکہ نہ دے دے۔ سو اس کی پیش بندی کے طور پر پہلے تو کہا کہ صلح کرنے میں توکل علی اللہ کا مظاہرہ کرو۔ پھر مزید صراحت کی کہ اگر ان کے دھوکہ دینے کا اندیشہ ہو تو جان لو کہ اللہ پر توکل ہی تمہارا سرمایہ ہے۔ یعنی اس سلسلے میں اندیشہائے دور دراز کا زیادہ خیال نہ کرو۔

ان آیات کے اس سیاق کی بنیاد پر ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ صلح کی گنجائش صرف اس وقت ہے جب مسلمانوں کی

پوزیشن اتنی کمزور ہو کہ وہ جنگ کرنے کے موقف میں نہ ہوں۔ جن آیات میں صلح کی پیشکش کو قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کا سیاق وسباق بانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ اس وقت ایسی مجبوری کی صورت حال نہیں ہے۔ ان آیات میں مسلمانوں کو جنگ کرنے کا حکم پورے زور اور تاکید کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔ انہی آیات میں جہاد پر ابھارنے والی وہ غیر معمولی آیات بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ:

> اے نبی! تمہارے لیے اللہ اور تمہارا اتباع کرنے والے اہل ایمان کافی ہیں۔ اے نبی! مسلمانوں کو جہاد پر ابھاریے۔ اگر تم میں کے بیس جمنے والے ہوں گے تو ان کے دو سو پر غالب آ جائیں گے۔ اور اگر تم میں کے سو ہوں گے تو ان کے ہزار پر غالب ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ بے بصیرت قوم ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جنگ کا حکم دینے والی نہایت تاکیدی اور جوش آور آیات کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ دشمن اگر صلح پر آمادہ ہو تو تم بھی آمادہ ہو جانا۔ اور زیادہ پس وپیش سے کام نہ لینا۔

مزید یہ بھی صاف ہے کہ یہ غزوۂ بدر کی عظیم الشان فتح کے فوراً بعد کا وقت ہے، تو جب ایسے موقع پر اور ایسے شدید دشمن سے صلح کے امکان پر صلح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہو جاتی ہے کہ یہ صرف مجبوری کے وقت کی اجازت ہے اور استطاعت اور قدرت کے موقع پر یہ اجازت نہیں رہے گی۔ یہ بالکل غیر عملی بات ہے، اس لئے کہ اس وقت مجبوری کی صورتحال خارج از بحث تھی۔ پھر مزید یہ کہ رسول اللہؐ نے مکہ کے لوگوں کے ساتھ جو صلح ۸ھ میں فرمائی تھی کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت مکہ کے مشرکین سے جنگ کرنے کی استطاعت مسلمانوں میں نہیں تھی۔ مسلمان اس سے پہلے اہل مکہ سے کئی مرتبہ دو دو ہاتھ کر چکے تھے۔ اور اسی وقت حدیبیہ میں بھی صلح سے ذرا پہلے، جب ان کو یہ افواہ خبر بن کر پہونچی تھی کہ رسول اللہؐ کے سفیر حضرت

عثمان بن عفانؓ کو مکہ میں قتل کر دیا گیا ہے، تو انہوں نے مرنے مارنے کی قسم کھائی تھی اور رسول اللہؐ کے ہاتھ پر آخری دم تک جنگ کرنے کی بیعت کی تھی۔ کیا پھر بھی یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ یہ آیت اسوقت کی ہے جب مسلمان کمزور تھے اور جنگ کی قوت نہیں رکھتے تھے۔

کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟

سید قطب مرحوم نے بڑے شد و مد کے ساتھ اس رائے کی تائید کی ہے کہ صلح کر لینے کا یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ ان حضرات کو جو اس آیت کو غیر منسوخ قرار دیتے ہیں سید قطب ان کو "المھزومون روحیا وعقلیا" (عقلی اور روحانی اعتبار سے شکست خوردہ) قرار دیتے ہیں، سادگی اور حماقت سے موصوف کرتے ہیں اور اسلام کے مزاج و منہاج سے بے خبر بتاتے ہیں۔

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے، مفسرین اور فقہاء کی ایک تعداد اگرچہ یہ کہتی ہے کہ سورۂ توبہ کی یہ آیت اس کی ناسخ ہے۔

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَد.

اور جب اشہر حرم گذر جائیں تو جہاں پاؤ ان مشرکین کو قتل کرو ان کو پکڑو، گھیرو، اور ہر جگہ ان کے (قتل کے لئے) گھات لگا کر بیٹھو

یقیناً سورۂ انفال کی وہ آیت جو دشمن کے آمادہ صلح ہونے پر صلح کا حکم دے رہی ہے وہ پہلے نازل ہوئی ہے اور سورۂ توبہ کی آیت بعد میں، مگر دونوں میں تضاد ہے کہاں جو ناسخ منسوخ کا سوال ہو۔ جنگ کا حکم دینے والی سورت توبہ کی ان آیات کے سیاق و سباق پر ذرا غور کرنے سے قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ احکام مشرکین عرب (جو

قریش کی قیادت میں ایک ملت اور سیاسی اتحاد کا درجہ رکھتے تھے) کے لئے نازل ہو رہے تھے۔ آپ اول سورت سے آیت نمبر ۲۸ تک پڑھ جائیے قطعی طور پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سورت عرب کے مشرکین سے متعلق ہی گفتگو کر رہی ہے۔ یہ گفتگو جن مشرکین کے متعلق کی جا رہی ہے دورانِ کلام ان کے جو حالات اور صفات بیان کی گئی ہیں اس سے کسی ذی شعور کے لئے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس سلسلۂ کلام میں صرف مشرکین عرب مراد ہیں۔ مثلاً کہیں کہا جا رہا ہے کہ "جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا" آیت نمبر (۱)، پھر آگے ان کی صفت یہ بھی بتائی جا رہی ہے کہ:

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ	کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں
وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ	کرو گے جنہوں نے عہد توڑ ڈالا،
بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ	رسول کو دربدر کرنے کا ارادہ کیا اور
(التوبۃ: ۱۳)	انہوں نے ہی تمہارے خلاف جنگ
	چھیڑی ہے

ظاہر ہے معاہدہ مشرکین عرب سے ہی ہوا تھا۔ المشرکین سے مراد مشرکین عرب ہی ہیں اسی کو مزید مؤکد کرنے والی آیات آگے اور ہیں جن میں ان کے مسجد حرام (کعبہ) سے رشتہ کا ذکر کر کے کہا جا رہا ہے کہ اب ان سے اس کی تولیت چھینے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ (۱۷-۲۲)

پھر آیت نمبر (۳۶) نے تو کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا	تمام مشرکین سے جنگ کرو جیسا کہ وہ
يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً	سب کے سب تم سے جنگ کر رہے ہیں

سورت انفال میں پہلے انہی مشرکین کے بارے میں حکم دیا گیا تھا کہ "اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جانا" مگر قرآن خود بتا رہا ہے کہ اب ان سے صلح

کا وقت نہیں رہا۔ اس حکم کی تبدیلی کا سبب ان کی لگاتار جارحیت، ظلم وعدوان، اور عہد شکنی کی تاریخ ہے، جیسا کہ ابھی ذکر کی گئی آیتوں میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ ان کے سینوں میں عداوت کی جہنم ہے، وہ کسی رشتہ وقرابت اور معاہدے تک کا لحاظ نہیں کر رہے لہذا اب بس، ان کو تہ تیغ کرو، یہاں قرآن ان کو ظلم واعتداء کا مرتکب بھی بتا رہا ہے، ﴿لا یرقبون فی مؤمن إلا ولا ذمة وأولئک هم المعتدون﴾۔ لہذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کو ہر حال میں تہِ تیغ کرنے کا حکم کا سبب ان کا یہ اعتداء تھا۔

قرآن کی کسی آیت کو اس معنی میں منسوخ قرار دینا کہ وہ معطل کر دی گئی ہے اور اب اس پر عمل نہیں کیا جائے گا ایک بڑی بھاری بات ہے۔ اتنی پر خطر بات کہنے کے لئے کوئی یقینی بنیاد ہونی چاہئے، جو یہاں ہرگز نہیں ہے۔ صلح کا حکم دینے والی آیت بالکل الگ قسم کے حالات اور الگ دشمن کے لئے ہے اور سورۂ توبہ کی آیات الگ صورت حال میں دشمن سے جنگ کرنے اور اس کے لئے زمین تنگ کر دینے کے حکم پر مشتمل ہے۔

صلح کا حکم قرآن نے اس صورت میں دیا ہے جب دشمن صلح جو ہو۔ کہا گیا اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی مائل بہ صلح ہو جانا اور اس پر یہ اضافہ کیا گیا کہ دشمن سے اگر عہد شکنی کا اندیشہ ہو تب بھی اللہ کے بھروسے پر صلح کر ہی لی جائے اور سورۂ توبہ کی آیت جو دشمن سے بھرپور جنگ کرنے کا حکم دے رہی ہے وہ بتا رہی ہے کہ جن "المشرکین" کے بارے میں یہ حکم ہے وہ یہی نہیں کہ صلح جو نہیں بلکہ تم سے جنگ کر رہے ہیں اور ایسے عہد شکن ہیں کہ اب ان کی صلح پر آمادگی کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سلسلۂ آیات میں آگے کہا گیا:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً

اور تمام مشرکین سے جنگ کرو جس طرح وہ سب کے سب تم سے جنگ
کرتے ہیں۔

سورۂ انفال کی یہ آیت (۶۱) دوسرے فریق کے صلح پر (یقیناً بامعنی اور منصفانہ صلح پر) راضی ہونے کی صورت میں اس کو نہ صرف قبول کرنے بلکہ کشادہ قلبی کے ساتھ قبول کرنے کی ترغیب دیتی ہے، اس لئے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اصلاتو گفتگو مسلمانوں کو آمادۂ جنگ کرنے کی چل رہی تھی مگر پھر بھی مسلمانوں میں صلح پر آمادگی پیدا کرنے کے لئے یہاں تک ارشاد ہوا:

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. وَإِن يُرِيدُوا أَن
يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ
وَبِالْمُؤْمِنِينَ. وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِم

اور (اس سلسلہ میں) اللہ پر بھروسے سے کام لو۔ وہ سب سننے جاننے والا
ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکہ دینا چاہیں گے تو اللہ کافی ہے تمہارے لئے۔
اسی نے تو اپنی مدد اور مومنین کی جماعت کے ذریعہ تمہاری تائید کی ہے۔

اس کی تشریح میں ابن کثیر کہتے ہیں کہ "مطلب یہ ہے کہ اگر وہ صلح کر کے دھوکہ دینا چاہیں تاکہ اسی مدت میں تیاریاں کرلیں تو جان لو کہ اللہ تمہارے لئے کافی ہے"۔

اس پوری تفصیل نے یہ بات واضح کر دی کہ سورۂ توبہ کی آیات صلح کی آیت کو منسوخ نہیں کر رہی ہیں۔ نسخ کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ دونوں آیات قطعی طور پر الگ حالات اور الگ دشمنوں سے متعلق ہیں۔ کوئی اگر خود قرآن میں غور کرے اور اگر اپنے ذہن میں قائم خیالات اور کسی مخصوص نظریے کے تاثرات سے آزاد ہو کر سوچے گا وہ اسی نتیجے تک پہنچے گا، اور کتاب اللہ کی آیات کو مصحف میں موجود ہوتے ہوئے اور تلاوت کرتے ہوئے بلا قطعی دلیل کے ہرگز یہ نہیں کہے گا کہ وہ منسوخ اور معطل ہیں۔

امام طبری نسخ کے قائل نہیں:

جیسا کہ امام طبری جو سرخیل مفسرین ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث وفقہ میں بھی امامت کے مقام پر فائز تھے اس آیت کے منسوخ ہونے کی بات بالکل بے بنیاد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "**لا دلالة علیه من کتاب ولا سنة ولا فطرة ولا عقل**" اس کی کتاب وسنت اور عقل وفطرت سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔

ہاں سورہ محمد کی آیت "**ولا تھنوا وتدعوا الی السلم**" میں کمزوری دکھاتے ہوئے دشمن سے صلح کی دہائی دینے کو منع کیا گیا ہے، لیکن یہ ایک بالکل دوسری بات ہے اور دشمن کے ساتھ باعزت صلح ایک دوسری چیز ہے۔

سوم۔ تیسری ایک بات اور ہے جو قطعی طور پر اس کا فیصلہ کردیتی ہے کہ خود ہمارے فقہاء کے نزدیک غیر مسلم حکومت خود اپنی ذات میں ایسی چیز نہیں ہے جس کو برداشت ہی نہیں کیا جاسکتا اور مسلمانوں پر اس کو ختم کرنا دینی فریضہ ہے۔ فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اگر غیر مسلم حکومت کی طرف سے کچھ مال دے کر صلح کی پیش کش کی جائے تو مسلمانوں کی حکومت کے لئے جائز ہے کہ وہ اس مال کو قبول کر کے غیر مسلم حکومت کو باقی رہنے دے اور صلح کرلے۔ فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ یہ "جزیہ" والی صورت نہیں ہوگی بلکہ غیر مسلم حکومت اپنی پوری آزادیوں اور کفر کے قوانین کے نفاذ کے ساتھ باقی رہے گی۔ (بدایۃ المجتہد: ۱/۳۱۷ بدائع الصنائع: ۶/۷)۔

اب اگر مولانا مودودیؒ کی بات کو تسلیم کرلیا جائے تو بات یہ ہوگی کہ یوں تو اگرچہ ایک غیر مسلم حکومت سارے فتنہ وفساد کی جڑ اور خرابیوں کا منبع ہے اس لئے اس کو اکھاڑ پھینکنا اور اس کی جگہ اہل حق کی حکومت قائم کرنا ضروری ہے، لیکن اگر مال ملے تو پھر سب قابل برداشت ہوسکتا ہے۔ ذرا غور فرمائیں! یہ تو کوئی اخلاقی پوزیشن نہیں ہوئی۔ اللہ کا دین یقیناً اس سے بری ہونا چاہیے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ائمہ اور فقہاء متقدمین کے موقف کی جو یہ توجیہ اور تشریح کی جاتی ہے کہ ''شوکت کفر علت قتال ہے'' یا یہ کہ غیر مسلم حکومت کا وجود فی نفسہ اس بات کا مکمل سبب ہے کہ اگر قدرت ہو تو اس کو ختم کرنے کے ہدف سے اس کے خلاف جنگ کی جائے اور مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہ غیر مسلم حکومت کا خاتمہ ضرور کریں، یہ صحیح توجیہ نہیں ہے اور اس میں متعدد اشکالات ہیں۔

فقہاء کا یہ متفقہ مسئلہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک نہ کفر قتال کا سبب ہے نہ نظام کفر نہ حکومت کفر، کیوں کہ وہ سب مال کے عوض غیر مسلم حکومت سے صلح کرنے کو جائز کہتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلم حکومت مال دینے پر اسی وقت راضی ہوگی جب مسلمانوں کی طاقت کا پلہ بھاری ہو۔ یعنی یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ ہمارے فقہاء نے اس کی اجازت اسی صورت میں دی ہے جب مسلمان کمزور ہوں یا خود ان کی مصلحت کا تقاضہ ہو کہ جنگ سے بچا جائے۔

بعض متقدم ائمہ کی صراحتیں
کہ جنگ کا سبب محاربہ ہے:

اگرچہ ہمارے قدیم فقہاء کے یہاں یہ تصور ناپید نہیں ہے کہ نفس کفر جنگ کا سبب نہیں ہوسکتا۔ جنگ کا سبب محاربہ یعنی جارحیت اور صلح نہ کرنا ہے۔

(۱) ابن تیمیہ:

امام ابن تیمیہ کا تو اس مسئلے پر مستقل رسالہ ''قاعدة مختصرة في قتال الكفار ومهادنتهم'' بھی ہے، جس میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جنگ صرف اسی سے کی جائے گی جو خود آمادۂ پیکار ہو[1]۔

---

[1] قاعدة مختصرة في قتال الكفار ص۱۲۱

بعض عرب علماء اس رسالہ کی ابن تیمیہ کی طرف نسبت مشکوک قرار دیتے ہیں۔ مگر نیل الأوطار میں ایک جگہ شوکانی کے قلم سے اس رسالہ کا تذکرہ دیکھا تو اندازہ ہوا کہ شوکانی کے پاس غالباً اس کا نسخہ تھا۔ علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ:

وكون قتال الكفار لكفرهم هو مذهب طائفة من أهل العلم ، وذهبت طائفة أخرى إلى أن قتالهم لدفع الضرر ... ومن القائلين بهذا شيخ الإسلام ابن تيمية وله في ذلك رسالة[1]

اور کفار سے قتال کا سبب ان کا کفر ہے، یہ بعض اہل علم کی رائے ہے، اور ایک دوسری جماعت کا موقف یہ ہے کہ قتال ان کے ضرر کو دفع کرنے کے لئے ہے... اس دوسری رائے کے حاملین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ بھی ہیں اور ان کا اس موضوع پر ایک رسالہ بھی ہے۔

اس رسالہ کا تذکرہ شوکانی سے پہلے علامہ امیر صنعانی کے یہاں بھی ملتا ہے، بلکہ انہوں نے اس کی تائید کرتے ہوئے اپنے ایک رسالہ میں اس کی تلخیص بھی کی ہے جو ذخائر علماء الیمن نامی کتاب میں شائع ہو چکی ہے۔

ابن تیمیہ نے اپنی دوسری کتاب النبوات میں بھی اس رائے کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے، بلکہ اس کو جمہور علماء کا مسلک قرار دیا ہے، کہتے ہیں:

الكفار إنما يقاتلون بشرط الحراب ، كما ذهب إليه جمهور العلماء ، وكما دل عليه الكتاب والسنة[2]

کفار سے جنگ اسی شرط پر کی جائے گی کہ وہ محاربہ کریں، جیسا کہ جمہور علماء کا مسلک ہے اور اسی پر کتاب وسنت کی دلیل قائم ہے۔

ابن تیمیہ اور شوکانی کی ان عبارتوں سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ان

---

[1] نیل الأوطار: ۲۷۲/۵

[2] النبوات ص: ۱۴۰

دونوں حضرات کے نزدیک ماضی میں بھی اہل علم کی ایک تعداد اسی کی قائل رہی ہے کہ قتال صرف ظلم وجارحیت کے خلاف ہی کیا جا سکتا ہے اور اس کی اصل علت محاربہ (یا فتنہ وغیرہ) ہی ہے۔

ابن تیمیہ اپنی کتاب الصارم المسلول میں آیت کریمہ: ''اور اللہ کے راستہ میں قتال کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی مت کرنا، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ (البقرۃ:119) کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

فأمر بقتال الذين يقاتلون ، فعلم أن شرط القتال كون المقاتَل مقاتِلا .[1]

اللہ نے جنگ کرنے والوں سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قتال کے لئے یہ شرط ہے کہ جس کے خلاف جنگ چھیڑی جائے وہ جنگ کر رہا ہو۔

(۲) ابن قیمؒ:

ابن قیمؒ اپنی کتاب ہدایۃ الحیاری میں کہتے ہیں:

إنما كان (صلى الله عليه وسلم) يقاتل من يحاربه ، وأما من سالمه وهادنه فلم يقاتله[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اسی سے جنگ کرتے تھے جو خود جنگ کرتا تھا۔ جو صلح کرتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے جنگ نہیں کرتے تھے۔

(۳) ابن جریر طبری:

سورۂ انفال کی یہ آیت گذر چکی ہے: وإن جنحوا للسلم فاجنح لها

---

[1] الصارم المسلول: ٩٦

[2] هداية الحيارى: ١٢١

"وتوکل علی اللہ" یعنی اگر یہ خدا اور مسلمانوں کے دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح پر آمادہ ہوجانا۔

ابن جریر طبری نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے پہلے تو یہ لکھا ہے کہ:

وان مالوا الى مسالمتك	یعنی اگر وہ (دشمن) تمہارے ساتھ
ومتاركتك الحرب، اما	صلح اور جنگ بندی پر آمادہ ہوجائے
بالدخول في الاسلام واما	چاہے اسلام قبول کرکے یا جزیہ
باعطاء الجزية واما بموادعة	دے کر یا صلح کرکے، چاہے وہ کسی
ونحو ذلك من اسباب السلام	قسم کی اور کسی انداز کی بھی صلح ہو تو تم
والصلح فاجنح لها، يقول فمل	بھی صلح پسندی کا ثبوت دینا، اور وہ
اليها وابذل لهم ما مالوا اليه من	جو چاہیں وہ کردینا اور دے دینا۔
ذلك وسالوك.	

آگے بڑھنے سے پہلے خط کشیدہ عبارت پر ایک مرتبہ نظر ڈال لیجیے۔ اس سے صلح کا کس درجے میں مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔

امام طبری آیت کی اس اجمالی وضاحت کے بعد قتادہؒ اور بعض دیگر حضرات کے اس قول پر کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی بعد میں اجازت نہیں رہی، وہ تبصرہ کرتے ہیں جو پیچھے گذر چکا کہ: اس کی کتاب وسنت اور عقل وفطرت سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔

امام طبری کی اس عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کا مفہوم یہی سمجھتے ہیں کہ اگر غیر مسلم ریاست اسلام اور جزیہ (یعنی مسلم حکومت کی تابعداری) پر راضی نہ ہو کر کسی اور شرائط پر صلح کرنا چاہے تو اس کو قبول ہی کیا جائے اور صلح کی جائے۔ واقعہ یہی ہے کہ آیت اپنے الفاظ اور اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے اس کے

علاوہ کسی اور مفہوم کی گنجائش نہیں چھوڑتی۔

دلائل پر ایک نظر:

جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ مسلمانوں کو بشرط قدرت ساری غیر مسلم حکومتوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے، ان سے بھی جو محاربہ یا ظلم کے مرتکب ہوں اور ان سے بھی جو کسی قسم کے محاربہ کے مرتکب نہ ہوں، ان حضرات کے اہم دلائل حسب ذیل ہیں، اب وقت آیا ہے کہ ہم ان کا جائزہ لیں۔

۱-وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰه (البقرة : ۱۹۳)

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ''فتنہ'' باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔

اس آیت میں قتال کا جو دوسرا مقصد ''اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے'' بتایا گیا ہے، اس میں بعض مفسرین نے ''دین'' کے معنی اطاعت کے بیان کیے ہیں۔ (طبری) یہیں سے یہ حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ آیت مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ تاحد مقدور اسلام کی حکومت کے قیام کے لئے قتال کریں۔

مولانا مودودیؒ اس استدلال کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> ''اس مقام پر ''فتنے'' سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لئے ہو، اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ ''فتنہ'' ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پھر جب ہم لفظ ''دین'' کی تحقیق کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنی ''اطاعت'' کے ہیں، اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اس کے احکام وقوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اس تشریح

> سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت جس
> میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرماں روائی قائم ہو، اور جس
> میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے
> کی حالت ہے، اور اسلامی جنگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی
> جگہ ایسی حالت قائم ہو، جس میں بندے صرف قانون الٰہی کے
> مطیع بن کر رہیں''[1]۔

غور کریں تو یہ استدلال کمزور نظر آئے گا۔ چاہے دین اپنے اصطلاحی معنوں میں ہو یا آیت کے معنی یہ ہوں کہ اطاعت خالصۃً اور کل کی کل اللہ کی جائے، اس سے یہ مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے؟ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے اور اسلامی احکام کا قانونی نفاذ ہو بھی جائے تو بھی کفار اپنے شرک وکفر اور اللہ کی نافرمانی اور غیر اللہ کی اطاعت وبندگی پر قائم رہیں گے، ان کے احبار ورہبان ان کے لیے ناحق قانون سازی کرتے رہیں گے اور اسلامی حکومت ان کے بہت سے معاصی وقبائح ومنکرات کا خاتمہ نہیں کرے گی۔ پھر اس آیت سے استدلال کے کیا معنی؟ جہاد وقتال کے نتیجے میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے اور اسلامی قانون کے نفاذ اور جزیہ کی تحصیل کے بعد بھی نہ دین اپنے معروف معنی میں اللہ کے لئے خالص ہوتا ہے اور نہ اطاعت اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ مشرکین کا شرک اور یہود ونصاریٰ کی اطاعت رہبان واحبار بھی باقی رہے گی اور کفار کے معاصی بھی، کوئی جہاد دنیا میں دین یا اطاعت کو اللہ کے لئے خالص نہیں کرتا، پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جنگ کی غایت ''دین کا یا اطاعت کا اللہ کے لئے خالص ہو جانا'' ہے۔ جہاد کے نتیجے میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوگی تب بھی دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہوگا نہ اطاعت

---

[1] تفہیم القرآن ۱/۱۵۱

اللہ کے لئے خالص ہوگی۔ سادہ سے لفظوں میں آپ اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جہاد کے نتیجے میں جو اسلامی حکومت قائم ہوگی وہ زمین پر کفر کو بھی باقی رہنے دے گی اور (غیر مسلموں کے ذریعے) اللہ کی نافرمانیوں اور گناہوں کو بھی۔ لہذا جنگ کا ہدف دین یا اطاعت کا اللہ کے لیے خالص ہو جانا نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بعض علماء نے اس آیت میں دین کے معنی قہر و غلبہ کے لئے ہیں، جو یقیناً غلط فہمی ہے، ہم بصد ادب وضاحت کرتے ہیں کہ دین کے معنی عربی زبان میں قانون، اطاعت بدلہ وغیرہ کے تو آ سکتے ہیں، قہر و غلبہ اور حکومت کے نہیں آتے۔

پھر اس کا مطلب کیا ہے کہ جنگ کرو تاکہ دین اللہ کے لیے خالص ہو جائے؟؟
اس مشکل کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ:

دراصل یہ آیت صرف مشرکین عرب کے سلسلہ کا حکم بیان کر رہی ہے۔ آپ ذرا اس کے سیاق پر غور کیجئے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا
يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۔ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ
حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ
كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ. فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ
.وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا
فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ. (البقرۃ: ۱۹۰۔۔۱۹۳)

اور اللہ کے راستے میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کر رہے ہیں۔ اور زیادتی مت کرنا اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اور ان کو قتل کرو جہاں پاؤ، اور وہاں سے ان کو نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور "فتنہ" قتل سے سنگین تر ہے، اور ان سے مسجد حرام کے پاس جنگ

مت کرنا جب تک وہ وہاں تم سے جنگ نہ کریں، اگر وہ مسجد حرام میں تم سے جنگ کریں تو تم ان کو قتل کرو۔ کافروں کا یہی بدلہ ہے۔ تو اگر وہ باز آجائیں (شرک سے) تو اللہ غفور ورحیم ہے۔ اور ان سے جنگ کرو اس وقت تک جب تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہوجائے۔ اگر وہ باز آجائیں (جنگ) سے تو کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی سوائے ظالموں کے (کسی پر)۔

آیات کا سیاق قطعی طور پر ان مشرکین مکہ کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی، جن کے خلاف مسلمانوں میں جوش حمیت پیدا کرنے کے لئے قرآن نے کہا تھا﴿ وهم بدؤوكم أول مرة﴾: (انہوں نے ہی لڑائی کی ابتدا کی تھی)۔ ان مشرکین کے سلسلے میں یہ سلسلۂ آیات شروع ہی یہاں سے ہوا ہے کہ: ''اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں''۔ اس سلسلۂ بیان میں حکم دیا گیا ہے کہ ان مشرکین سے تم کو جنگ شروع کرنے کا جو حکم دیا جارہا ہے اس کی عملی غایت اور انتہا یہ ہے کہ ان کا فتنہ ختم ہوجائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہوجائے۔ اس سیاق وپس منظر میں دین کے اللہ کے لئے اصل ہوجانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین جس علاقے یعنی جزیرۂ عرب کے باسی ہیں اس کے بارے میں یہ طے ہے کہ یہاں دین صرف اللہ کا ہی رہے گا۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں وصیت فرمائی کہ: ''مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دیا جائے''[1]۔ اور یہی محمل ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور ارشاد: " أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله ...... "۔ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔

اس معنی کو حتمی طور پر طے کرنے والی یہ بات ہے کہ متفقہ طور پر لوگوں سے زبردستی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب جوائز الوفد

اسلام قبول کروانا جنگ کی غایت ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حدیث کو (مذکورہ بالا آیت کی طرح) جزیرۃ العرب کے ساتھ خاص نہ مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے اور قتل و قتال کرنے کا حکم ہے الا یہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔

تقریباً یہی الفاظ سورۂ انفال آیت ۳۹ میں بھی آئے ہیں، وہاں بھی سیاق یقینی طور پر مشرکین مکہ کو متعین کرنے والا ہے۔

(۳،۲) اس موقف کے اہم دلائل میں سورۂ توبہ کی دو آیتیں بھی ہیں:

قَاتِلُواْ الَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّهُ وَرَسُولُهُ وَلاَ يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُواْ الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ. (آیت : ۲۹)

جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں رکھتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور دین حق کی اتباع نہیں کرتے، یعنی اہل کتاب سے، یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں ہاتھ سے اور تابع بن کر رہیں۔

دوسری آیت اسی سورت کی یہ آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ قَاتِلُواْ الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُواْ فِيكُمْ غِلْظَةً (آیت : ۱۲۳)

اے ایمان والو! اپنے پاس کے کفار سے جنگ کرو، اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔

ان دونوں آیتوں سے استدلال اس طور پر ہے کہ پہلی آیت میں قتال کے حکم کے ساتھ اس حکم کی غایت یہ بتا دی گئی کہ یہ اہل کتاب کفار مسلمانوں کے تابع ہو کر جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں، تاکہ ان کی بالادستی اور خودمختاری ختم ہو جائے، وہ زمین

میں صاحب امر اور حاکم بن کر نہ رہیں، بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور امامت وفرماں روائی کے اختیارات دین حق کی اتباع کرنے والوں کے ہاتھوں میں آجائیں۔ دوسری آیت بھی مطلقاً کفار سے جنگ کرنے کا حکم دیتی ہے، اور اس میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں ہے کہ وہ دعوت حق کا راستہ روکیں، یا اللہ کے بندوں پر ظلم کریں یا مسلم حکومت کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہوں۔

ان آیات کا پس منظر:

دراصل ان آیتوں کا مدعا اور ان میں دیے گئے حکم کی اصل نوعیت سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر اور ان حالات کو جاننا ضروری ہے جن کے درمیان وہ نازل ہوئیں۔ کسی کلام کو اگر اس کے پس منظر سے کاٹ دیا جائے یا ان حالات کو نظر انداز کردیا جائے جن میں وہ صادر ہوا ہے تو کچھ کا کچھ مطلب ہوجانا ممکن ہوجاتا ہے۔

قرآن مجید قانون کی کسی کتاب کی طرح دفعات کی زبان میں نازل نہیں ہورہا تھا۔ اس کے صحیح فہم کے لئے ضروری ہے کہ ان واقعات کی کھوج کی جائے جن میں کوئی خاص مجموعۂ آیات نازل ہوا تھا اور ذہن وتصور کو اس ماحول میں پہنچانے کی پوری کوشش کی جائے۔

یہ آیات غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی ہیں۔ یہ بیزنطینی روم کے خلاف ایک مہم تھی جو سن نو ہجری میں انجام دی گئی، اس وقت ہرقل عظیم رومن سلطنت کے فرماں روائے اعظم قیصر کی حیثیت سے سریرآرائے سلطنت ہوچکا تھا، اور اسی لئے اسلامی مآخذ اس کو کبھی قیصر اور کبھی ہرقل کہتے ہیں۔ رومن حکومت کی کچھ عمل داریاں عرب سرزمین میں حدود شام اور شام کے اندر قائم تھیں۔ شمال عرب میں غسانیوں کی مشہور حکومت تو مستقل طور پر ان کی تابع تھی ہی، اس کے علاوہ اسی علاقہ کی کچھ دیگر قبائلی طاقتیں بھی رومیوں کی عمل داری میں تھیں اور عیسائی ہوچکی تھیں، گویا یہ پورا خطہ

رومی سلطنت عظمیٰ کا حصہ تھا۔

رومی سلطنت سے کشمکش کا آغاز ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے ہو چکا تھا، روم جیسی توسیع پسند جابر طاقت کو جس نے جاگیرداری کے ظالم نظام میں غریب عوام کو جکڑ رکھا تھا، اپنے بالکل پڑوس میں ایک ایسی ابھرتی ہوئی طاقت کیسے برداشت ہو سکتی تھی جس کے جلو میں دلوں کو فتح کرنے والی ایک ایسی دعوت تھی جس کا اعلان تھا: ''اللہ کی بندگی میں داخلہ اور بندوں کی غلامی سے آزادی''۔ ابتداء ایسے ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۵ آدمیوں کی ایک جماعت ان رومی عیسائی علاقوں میں بھیجی انہوں نے وہاں دعوت اسلام دی، مگر ان سب کو ذات اطلاح نامی مقام پر قتل کر دیا گیا۔ ان کے امیر حضرت کعب بن عمیر نہایت زخمی حالت میں بچ کر مدینہ واپس آئے اور اس سنگین واقعہ کی اطلاع دی[1]۔

ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ رومی حکومت کی ایک اور اسلام دشمن حرکت سامنے آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال کے ان عرب علاقوں میں مستقل دعوتی مہمیں بھیجی تھیں۔ ان کے نتیجہ میں فروۃ بن عمرو (یا ابن نفاشہ) نامی ایک عرب حاکم نے جو رومیوں کی جانب سے عرب قبائل پر متعین تھا اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیر سگالی کے طور پر کچھ ہدایا بھی بھیجے۔ رومیوں نے اس کو مرکز طلب کیا اور قتل کر کے سولی پر چڑھا دیا[2]۔

اسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرماں روایان ممالک کو دعوت اسلام کے خطوط بھیجے تھے، ان میں ایک خط بصریٰ کے حاکم کے نام بھی تھا۔ راستے میں غسانی بادشاہ شرحبیل بن عمرو نے، جو رومی حکومت کا علاقے میں نائب تھا اور عیسائی

---

[1] البدایہ والنھایہ

[2] سیرت ابن ہشام

تھا، آپ کے سفیر حضرت حارث بن عمیر کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یہ پورا خطہ رومی سلطنت میں داخل اور عیسائی حکومتوں کے تابع تھا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان طاقتوں کی تادیب ضروری سمجھی۔ اس کے بعد موتہ کا معرکہ ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غالبا اندازہ تھا کہ روم کی تابع ان عرب ریاستوں کے لئے ایک مختصر فوج (۳ ہزار) کافی ہونی چاہئے۔ مگر ادھر براہ راست قیصر (ہرقل) حرکت میں آ چکا تھا۔ اسلامی لشکر علاقے میں پہنچا تو پتہ چلا کہ رومی زبردست لشکر کشی کرنے کی تیاری کر چکے ہیں، غسانی عیسائی عرب قبائل کی بڑی تعداد لے کر سامنے ہیں اور ایک بڑی کمک لے کر ہرقل کا بھائی تھیوڈور آ رہا ہے۔ خود قیصر روم حمص میں پڑاؤ ڈالے ہے، بہرحال اللہ کی نصرت اور مجاہدین کی جانبازیوں کی بدولت لشکر اسلام بحفاظت واپس آ گیا، اور رومیوں کو اندرون عرب لشکر کشی کی جرأت نہیں ہوئی۔

خود مدینے کے اندر سے ایک فتین شخص ابو عمرو راہب عیسائی ہو کر غسانیوں کے یہاں بھاگ گیا تھا، اور مستقل اس سازش میں مصروف تھا کہ وہاں سے ایک بڑی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کرے، مدینہ میں منافقین مستقل اسی کے رابطے میں تھے، آخر جب یہ سازش اپنے عروج کو پہنچی تو انہوں نے عین مدینہ میں مسجد کے نام پر اپنا ایک مستقل مرکز بھی بنا لیا جہاں بیرونی حملہ آور افواج کی مدد کے منصوبے تیار ہوتے تھے۔ قرآن نے اسی پوری سازش کا پردہ چاک کیا کہ یہ مرکز دراصل رومی حملہ کی سازشوں کا گڑھ ہے۔ (سورۂ توبہ: ۱۰۷)

اب سن ۹ ہجری آتا ہے۔ ان مذکورہ واقعات کے علاوہ بھی ان تین چار سالوں میں رومیوں کی طرف سے ایسی اور بھی کئی حرکتیں ہوئیں جن کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ رومیوں کے ارادے خطرناک ہیں۔ رومیوں کی حرکتیں اس درجہ بڑھ گئی تھیں کہ

صحابہ کرام کو ہر دم رومی حملے کا اندیشہ لاحق تھا۔ اور اس کی وجہ سے مدینہ پر ایک درجے کا خوف طاری تھا۔ ایلاء کے سلسلۂ واقعات میں آتا ہے کہ جب حضرت عمر کے ایک پڑوسی نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور نہایت بے چینی کے ساتھ کہا کہ: ارے! بڑا حادثہ ہو گیا" تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دفعۃً پوچھا: کیا ہوا؟ کیا غسانیوں (رومیوں) نے حملہ کر دیا؟ خود حضرت عمر بیان کرتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ خبریں آ رہی تھیں کہ غسانی حملے کی تیز رفتار تیاریاں کر رہے ہیں[1]۔ اب تاجروں اور مسافروں نے آ آ کر خبریں دیں کہ رومی اپنے تابع عیسائی عرب قبائل اور ریاستوں کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں، فوجوں کو ایک سال کی تنخواہیں پیشگی بانٹی گئی ہیں، اور کچھ دستے بلقاء تک پہنچ رہے ہیں[2]۔ روایات بتاتی ہیں کہ عیسائی قبائل نے اپنے آقا قیصر روم کو خط لکھ کر یہ خبر دی کہ عرب میں اس سال شدید قحط ہے، حملہ کرنے کے لئے یہ موقع اچھا ہے تو اس نے اپنی طرف سے ایک بڑی فوج بھیجی[3]۔

ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کا فوری حکم دیا اور باوجود اس کے کہ موسم سخت گرم تھا اور مسلمانوں کو سخت غربت اور تنگ حالی کا سامنا تھا کوئی تاخیر اس لئے ممکن نہیں تھی کہ خطرہ نہایت سنگین تھا اور فوری تھا۔ فتح مکہ کے بعد عرب قبائل کا اسلام ایسا مضبوط نہیں ہوا تھا کہ اگر رومی اندرون عرب گھس کر حملہ کرتے تو ان سے استقامت کی امید کی جاتی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان قبائل کی بڑی تعداد کے ارتداد اور بغاوت نے ثابت بھی کر دیا کہ اگر روم جیسی طاقت کا حملہ ہوتا تو یہ قبائل یقیناً بغاوت کر دیتے اور اسلامی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔

---

[1] صحیح بخاری: ۵۱۹۱

[2] المواھب اللدنیہ (مع شرح زرقانی) ۳/۶۳، ابن سعد ۲/۱۶۵

[3] المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۸/۲۳۱۔

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرحد پر جا کر ہی دشمن کو روکنا اور مسلمانوں کی قوت کا رعب قائم کرنا ہر حال میں ناگزیر جانا۔

ان حالات میں یہ دونوں آیتیں مسلمانوں کو رومی طاقتوں سے جنگ کے لئے حکم دینے اور اس پر ابھارنے کے لئے نازل ہوئیں۔

ایک اہم نکتہ جس پر ان آیات کا صحیح فہم موقوف ہے:

اس دراز تفصیل کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ یہ واضح کیا جاسکے کہ سطحی طور پر یہ سمجھنا کہ ان آیات میں آیات دراصل اہل کتاب سے جنگ کے فقہی مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے یا ابتداءً اس کا حکم دیا گیا ہے، بالکل غلط ہے۔ یہ آیات اس مقصد کے لیے نازل نہیں ہوئیں، اہل کتاب سے اور رومی عیسائی طاقتوں سے کشمکش پہلے سے جاری تھی، اور یہ جنگ پہلے سے فرض ہو چکی تھی، یہ آیات مسلمانوں میں اس جنگ کے لئے ہمت وجوش پیدا کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں۔ یہی ان کا اصل مقصود ومعنی ہے۔ اور رومیوں کی یہ صفات کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے دین حق کے منکر ہیں، اور اللہ ورسول کے محرمات کو حرام نہیں سمجھتے، فوجوں کے اندر جوش اور ان کے خلاف غیظ وغضب پیدا کرنے کے لئے بیان کی گئی ہیں۔ یہ رومیوں سے قتال کی علت نہیں ہیں۔ قتال کی علت رومیوں کا صدعن سبیل اللہ (اللہ کے راستے سے روکنا) ایک مسلمان کو اسلام قبول کرنے کی پاداش میں قتل کرنا (فتنہ) اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں (محاربہ) کرنا تھا۔

بہر حال اس سے پتہ چلتا ہے کہ شمال عرب کی ان ساری مہموں کی اصل علت ''محاربہ'' اور ''فتنہ'' تھی۔ رومیوں سے جنگ کا حکم دینے والی انہی آیات کے سلسلہ میں آگے جا کر ارشاد ہوتا ہے:

يَـا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ قَاتِلُواْ الَّذِيْنَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُواْ

فِيكُمْ غِلْظَةً۔

اے ایمان والو! ان کافروں سے، جو تمہارے قریب ہیں، جنگ کرو اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔

گذشتہ تفصیل کی روشنی میں آیات کا سیاق بالکل یقینی طور پر واضح کرتا ہے کہ آیت کے نزول کے وقت اصلا "الذین یلونکم من الکفار" سے مراد یہی رومی طاقتیں ہیں جو عرصے سے محاربہ کر رہی تھیں اور جن کے خلاف جنگ پہلے سے چلی آ رہی تھی۔ در منثور میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا تھا کہ اس سے مراد روم والے ہیں۔ مفسرین نے اس کے اصل معنی یہی لیے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ کوئی ایسا اصول نہیں بتایا جا رہا تھا جس کی رو سے مسلمانوں پر اپنے قریب کی غیر مسلم حکومتوں سے جنگ کرنا ہمیشہ اور بغیر کسی سبب کے ضروری قرار پائے۔ ہاں اگر کوئی اس سے اور ان دونوں آیتوں سے قیاس کے طور پر یہ استدلال کرے کہ جس علت وسبب کی بنا پر ان روم والوں سے جنگ واجب قرار پائی تھی وہ علت جن "کفار" میں بھی پائی جائے گی اور جب بھی پائی جائے گی ان سے جنگ مسلمانوں پر فرض ہوگی تو یہ قیاس بالکل صحیح ہوگا۔

پھر ان اسباب کی تحقیق میں تاریخی طور پر یہ طے ہے کہ روم کی حکومت اور اس کی تابع ریاستیں صرف محارب ہی نہیں تھیں بلکہ اسلامی ریاست کے لئے ایسا شدید خطرہ بنی ہوئی تھیں کہ اگر ان کو ذرا نظر انداز کیا جاتا تو اسلام اور اسلامی ریاست کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا۔

(۴) ان حضرات کی چوتھی دلیل:

اس موقف کے حامل حضرات کثیر تعداد میں ان نصوص کو بھی پیش کرتے ہیں جن میں کفار یا مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم آیا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان

نصوص پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ تاثر یقیناً قائم ہوتا ہے کہ سارے کفار و مشرکین سے جنگ کا حکم دیا جارہا ہے۔ مگر اگر قرآن مجید کے سیاق وسباق میں غور کیا جائے اور یہ اصول مدنظر رہے کہ قرآن مجید کی آیات جنگ کے حالات میں نازل ہوا کرتی تھیں جب کہ کفار و مشرکین کے مخصوص گروہوں یعنی مشرکین مکہ، دیگر عرب قبائل اور یہود مدینہ اور نصارائے شام وروم میں سے کسی کے خلاف جنگ قائم ہوتی تھی تو یہ سمجھ لینے میں دقت نہیں پیش آئے گی کہ ان نصوص کا مقصد لوگوں میں ان دشمنوں سے قتال کے لئے جوش و آمادگی پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اگر یہ اصول مدنظر رہے تو صاف واضح ہو جائے گا اس طرح کی آیات اور احادیث میں دنیا کے تمام کفار و مشرکین نہیں بلکہ وہی لوگ مراد ہوتے تھے جن سے اس وقت جنگ درپیش ہوتی تھی۔ ہاں باقی دیگر غیر مسلم ریاستوں کے سلسلے میں ان آیات واحادیث اور ان میں مذکور غیر مسلم ریاستوں کے معروضی حالات پر غور کر کے قیاس کے ذریعے سے شرعی حکم جانا جاسکتا ہے۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فوجوں کو روانہ کرتے تو جو ہدایات دیتے تو ان میں یہ بات بھی فرماتے:

اغزوا باسم الله قاتلوا من كفر بالله[1]	اللہ کے نام پر جنگ کو جاؤ، اللہ کا انکار کرنے والوں سے جنگ کرو۔

یا جیسے قرآن میں کہا گیا:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً (التوبة: ٣٦)	تمام مشرکوں سے جنگ کرو جیسا کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کرتے ہیں

اس آیت میں تمام مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا، مگر آگے اس کا سبب یہ بیان کیا گیا کہ "جیسا کہ وہ سب کے سب تم سے برسرپیکار و جنگ ہیں، اس لئے تم

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب تامیر الإمام الأمراء

بھی ان سب سے جنگ کرو"۔ اس سبب کے بیان سے خود بخود مراد طے ہو گئی کہ اس آیت سے صرف مشرکین عرب مراد ہیں۔

(۵) مولانا مودودیؒ کا خاص استدلال:

مولانا مودودیؒ نے اس نقطۂ نظر کو کہ مسلمانوں کو بشرط مقدور غیر مسلم حکومتوں سے ہر حال میں جنگ کرنی ہے، نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس کے دلائل مرتب کیے ہیں۔ مولانا اس کو مصلحانہ جنگ کا نام دیتے ہیں۔ موصوف نے ایک نہایت طویل بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا اصل مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، یہ امت اسی فریضہ کی انجام دہی کے لئے قائم کی گئی ہے۔

پھر مولانا فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف تو طاقت کے زور سے انجام دیے جانے والا فریضہ نہیں ہے، وہ تو وعظ ونصیحت کے ذریعہ انجام دیا جائے گا۔ البتہ منکر کی مولانا نے دو قسمیں قرار دی ہیں، (۱) قلب وذہن کی گندگی اور خیال ورائے کی ناپاکی۔ اس کو دور کرنے کے لئے وعظ وتلقین کا حکم دیا گیا ہے۔ اور (۲) فعل وعمل کی برائی (منکر) کو بزور طاقت مٹانے کو مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے لئے مولانا نے ان احادیث کا حوالہ دیا ہے جن میں منکر سے اگر قدرت ہو تو طاقت کے زور سے روکنے کا حکم آیا ہے "فلیغیرہ بیدہ" پھر مولانا فرماتے ہیں کہ ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ:

> اگر مسلمانوں میں اتنی قوت ہو کہ تمام دنیا کو منکر سے روک کر اسے قانون عدل کا مطیع بنا دیں تو ان کا فرض ہے کہ اس قوت کو استعمال کریں اور جب تک اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا نہ دیں چین نہ لیں۔[1]

مثلاً احادیث میں اس کا حکم آیا ہے کہ "تم میں سے جو کوئی برائی (منکر) دیکھے تو

---

[1] الجہاد فی الاسلام: ۱۱۲

اس کو اگر قدرت ہوتو ہاتھ سے مٹادے، مگر باتفاق علماء یہ حکم مسلم امت کے داخلی دائرے کے اندر کا ہے۔ کسی نے اس کا مطلب یہ نہیں سمجھا ہے کہ جو غیر مسلم ان منکرات کو منکر ہی نہیں جانتا مثلاً شراب خوری، کھانے پینے کے سلسلے کی حرام اشیاء، ہر مسلمان ان کو بھی بزور وطاقت مٹانے کا (بشرط قدرت) ذمہ دار ہے۔ یہیں سے مولانا کا استدلال بے محل ثابت ہوجاتا ہے۔ یہ بنیادی سوال اٹھتا ہے کہ منکر کی وہ بڑی قسم جس کو مولانا قلب وذہن کی گندگی کہتے ہیں اس کا طاقت کے زور سے مٹانا کیوں منع قرار پائے؟ حدیث میں تو تمام ہی منکرات کو بزور مٹانے کی سکت ہونے پر ایسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ ''منکراً'' کا نکرہ ہونا تمام ہی منکرات کے اس ذیل میں آنے کو بتاتا ہے۔ پھر یہ استثنا کیوں کر ممکن ہے؟ اس کا کیا سبب ہے کہ ہم اس سے صرف فعل وعمل کی برائی مراد لیں۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جہاد فعل وعمل کی بہت سی برائیوں کو جن کا تعلق اجتماعی ظلم سے نہیں ہوتا باقی رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ مثلاً اسلام کی فتح کے بعد بھی غیر مسلموں کے لیے شراب پینا، بنانا، اس کی خرید وفروخت وغیرہ جائز ہی رہتے ہیں۔ پھر جہاد کا مقصد فعل وعمل کی برائی کے خاتمہ کہاں رہا؟

آگے مولانا فرماتے ہیں کہ ''منکر کی اسی دوسری قسم کو...اللہ تعالیٰ نے فتنہ وفساد سے تعبیر فرمایا ہے، چنانچہ ان تمام آیات میں جن میں منکر کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی ہے یا جنگ کی ضرورت ظاہر فرمائی گئی ہے، یا اسے بزور شمشیر مٹانے کا حکم دیا گیا ہے، آپ کو منکر کے بجائے یہی فتنہ وفساد کے الفاظ ملیں گے''۔

پھر مولانا نے ''قاتلوهم حتى لا تكون فتنة'' والی آیت کے علاوہ کچھ اور آیات بھی پیش فرمائی ہیں جن کے بارے میں مولانا کا کہنا یہ ہے کہ ان میں ''بزور شمشیر'' جہاد کر کے ''فتنہ وفساد'' کو مٹانے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر مجھے سخت حیرت ہے کہ اس مقام پر مولانا ایسی آیات بھی کیسے اور کیوں کر ذکر کر گئے ہیں جن کا موضوع جہاد

وقتال سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ مثلا قرآن نے ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل پر واضح کر دیا گیا تھا کہ جس نے کسی جان کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد مچایا ہو تو گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا۔ (من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعا. المائدہ ۳۲) ایک جگہ قرآن نے منافقین کے بارے میں کہا کہ وہ پہلے بھی مسلمانوں میں افتراق وانتشار پیدا کرنا اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے رگو گرداں کرنا چاہتے تھے، ان کے اس عمل کو قرآن نے ''فتنہ پروری'' سے تعبیر کیا اور کہا ''لقد ابتغوا الفتنة من قبل ''مولانا رحمۃ اللہ نے یہاں یہ دونوں آتیں بھی نقل فرمائی ہیں جو بے محل ہیں، یقیناً دونوں مقامات پر جن اعمال اور کرداروں کو فساد یا فتنہ کہا گیا ہے وہ خطرناک قسم کے منکر ہیں۔ مگر قرآن نے ان کے خلاف جہاد کا حکم دیا ہے اور نہ ہی ایسے منکرات کا استیصال جہاد کے ذریعہ ممکن ہے۔

ایک عجیب بات:

آگے چل کر مولانا مرحوم نے ایک مرتبہ پھر تفصیل سے واضح کیا ہے کہ قرآن نے کن کن جرائم کو فساد قرار دیا ہے، تفصیل کا یہ موقع نہیں ورنہ ہم مولانا کی یہ پوری بحث نقل کرتے تاکہ قارئین کو اندازہ ہوتا کہ مولانا کی اس تشریح نے ساری ہی برائیوں اور خرابیوں کو اپنے دائرہ میں لے لیا ہے یہاں تک کہ "الإثم" (گناہ) کو بھی مولانا نے اس فساد کا مصداق قرار دیا ہے کہ جو کسی قوم میں اگر پایا جائے تو اس کے خلاف جنگ ضروری ہو جائے گی۔ بصد ادب ہم عرض کرتے ہیں کہ فتنہ کی اس قدر تعمیم بہت ہی محل نظر ہے۔

فتنہ کی تشریح:

مولاناؒ کے اس موقف کی شاید اہم ترین بنیاد ''فتنہ'' کی وہ خاص تشریح ہے جو

انہوں نے جنگ کی غایت اور انتہا بتانے والی آیت "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنة" (ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ باقی رہے) کے ذیل میں کی ہے۔ مولاناؒ نے منکر کی دو قسمیں: (قلب وذہن کی گندگی، (۲) فعل وعمل کی برائی بیان کرنے کے بعد کہا ہے:

> منکر کی اس دوسری قسم کو جس کے خلاف اسلام میں قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے پہلی قسم سے ممتاز کرنے اور اس کی نوعیت کو اور زیادہ واضح کر دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور فساد کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، چنانچہ ان تمام آیات میں جن میں منکر کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی ہے، یا جنگ کی ضرورت ظاہر فرمائی گئی ہے، یا اسے بزور شمشیر مٹانے کا حکم دیا گیا ہے، آپ کو منکر کے بجائے ہی فتنہ وفساد کے الفاظ ملیں گے[1]"

ہم پورے ادب سے عرض کرتے ہیں کہ قتال وجنگ کی علت کے طور پر جن دو مقامات پر قرآن نے "فتنہ" کا تذکرہ کیا ہے ان میں یہ "فعل وعمل کی برائی" کا مفہوم نہ کسی کوشش سے پیدا کیا جاسکتا ہے نہ آج تک کسی عالم نے پیدا کیا ہے۔ یہ سراسر ایک جدت ہے۔ حقیقۃً یہاں صرف ظلم وجبر اور تعذیب کے ذریعہ لوگوں کو اسلام سے روکنا ہی مراد ہے۔ اور خود مولانا بھی اسی کتاب میں ایک جگہ فتنہ کی یہی حقیقت بیان فرماتے ہیں۔

اب یہ لاینحل معمہ پھر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ پہلے تو مولانا نے یہ فرمایا کہ فعل وعمل کی برائی وہ منکر ہے جس کو قرآن فتنہ اور فساد کا نام دے کر اس کے خلاف جنگ کا حکم دیتا ہے۔ اور آگے صفحہ ۱۰۶ پر "فتنہ کی تحقیق" کے زیر عنوان رقم فرماتے ہیں کہ اس مؤخر الذکر مفہوم میں فتنہ کا لفظ تقریباً انگریزی لفظ (Persecution)[2] کے

---

[1] الجهاد في الإسلام، ص:۱۰۴
[2] حاشیہ: یعنی مذہبی جبر۔ یحییٰ

ہم معنی ہے۔ ان دونوں باتوں میں کیسے جوڑ پیدا کیا جائے۔

نیز مولانا نے ''فتنہ'' کے جو قرآنی استعمالات نقل کئے ہیں ان میں کہیں بھی فتنہ سے مراد فعل و عمل کی برائی والا منکر نہیں ہے جیسا کہ مولانا نے پہلے دعوی فرمایا تھا۔

فساد کی تشریح:

البتہ مولانا نے ''فساد'' کی جو تشریح فرمائی ہے اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کی منشا تمام مفسد اخلاق گناہوں کو قرآن میں ''فساد'' کا مصداق قرار دینا ہے، موصوف نے فساد کے علت قتال ہونے پر دو آیتیں پیش فرمائی ہیں:

(۱) **ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض** ۔اگر اللہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پیدا ہو جاتا۔

(۲) **من قتل نفساً بغير نفس أو فساد في الأرض فكانما قتل الناس جميعاً** ۔جس نے کسی کو قتل کیا بغیر کسی قتل یا فساد کی سزا کے تو گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس میں سے دوسری آیت تو کسی طرح جہاد و قتال سے متعلق ہے ہی نہیں۔ اس کو جو کچھ تعلق ہے وہ حدود و تعزیرات سے ہے۔ مولانا جیسے ذہین شخص نے اس کو کیسے یہاں ذکر کیا اس پر حیرت ہے۔

جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے یقیناً اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگوں کے ذریعہ اللہ تعالی دنیا کو بگاڑ سے بچاتا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ ہم آیات کا سیاق پورا ذکر کرتے کہ یہاں قرآن بنی اسرائیل کے ہاتھوں ایک ظالم دشمن دین طاقت کی شکست کا تذکرہ کر رہا ہے، اس کے بعد کہہ رہا ہے کہ اسی طرح جنگوں کے ذریعہ اللہ تعالی انسانوں کو ظلم سے باز رکھتا ہے ورنہ دنیا تباہ ہو جائے۔

ذرا سے غور و فکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں فساد سے مراد وقت

کے کفار کی وہ ظلم وسرکشی ہے جس کا سامنا بنی اسرائیل کرتے آرہے تھے، اور جس کا تذکرہ بنی اسرائیل کے قائدین کی زبانی ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ ہمارے دشمنوں نے عرصے سے ہم کو اپنے وطن سے نکال دیا ہے، اور ہمارے بچوں (اور عورتوں) کو قیدی بنالیا ہے" (وقد أخرجنا من ديارنا وأبنائنا) بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس واقعہ کے بیان سے پہلے جو آیات ۲۴۳ تا ۲۴۵) ہیں وہ مسلمانان مدینہ کو مکہ ظالم طاقت کے خلاف جنگ کرنے اور اس کی تیاری کے لئے مال خرچ کرنے کا حکم دینے والی آیات ہیں۔

اس سیاق میں بنی اسرائیل کی اسی حالت مظلومیت کا تذکرہ یقیناً مسلمانوں کو ان کی اپنی حالت یاد دلاتا تھا۔ اس ماحول اور سیاق کو ذہن میں رکھنے کے بعد بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں "فساد" سے کیا مراد ہے یقیناً "فعل وعمل کی برائی" جس کے دائرے میں مولانا آگے جاکر وہ تمام گناہ داخل بتاتے ہیں جو آدمی کے ذاتی اخلاق کو غارت کرتے ہیں، ہرگز یہاں مراد نہیں ہے۔

قرآن نے فساد کے خلاف کہیں قتال کا حکم نہیں دیا ہے:

بلکہ قرآن نے کسی جگہ بھی "فساد" کے خلاف جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا ہے، قرآن مجید میں مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنے جنگ کے لئے جوش اور حمیت پیدا کرنے والی آیات نہایت کثرت کے ساتھ ہیں لیکن کہیں بھی ان کو "فساد" کو مٹانے کے لئے جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

فساد فی الأرض کے معنی:

ہاں! اللہ تعالیٰ نے یہ ضرور کہا ہے کہ اگر زمین اہل حق کے جہاد سے خالی ہوگی تو "زمین میں فساد" رونما ہوگا، **ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض** "(البقرۃ:) فساد اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے تو بڑا عام لفظ ہے،

ہر بگاڑ اور صلاح کی ضد پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے اور مولانا مرحوم نے اس کو اسی معنی میں لیتے ہوئے قرآن کی بہت سی آیات میں ''فساد'' کے معانی و مصداقات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ ''الاثم'' یعنی بقول مولاناؒ ''ذاتی اخلاق بگاڑنے والے گناہ'' کو بھی فساد کا مصداق قرار دے دیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ ہر گناہ بگاڑ ہے، مگر جب فساد کے یہ معنی اس سیاق میں بتلائے جائیں کہ ہر فساد و فتنہ کی خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے اور ہر اخلاقی خرابی بگاڑ فساد ہے تو یہ تشریح بڑی محل نظر ہو جاتی ہے اور ''لا إكراه في الدين'' کے قرآنی اصول سے سیدھی جا ٹکراتی ہے۔

قرآن مجید میں فساد اور اس کے مشتقات Derivatives پچاس جگہ پر آئے ہیں، اور نہایت قلیل مواقع کے استثناء کے ساتھ عموماً ہر جگہ اس سے ناجائز خونریزی بدامنی اور ظلم و قہر کے معنی ہی مراد ہیں۔ جو حضرات اس کی تفصیل جاننا چاہیں وہ ایسے مواقع کو ان کے سیاق و سباق پر غور کے ساتھ دیکھ لیں، ان شاء اللہ اطمینان حاصل ہو جائے گا۔

مولانا مرحوم نے جو دو آیتیں اپنے خیال کے مطابق اس مقصد سے پیش کی ہیں کہ قتال کی ایک علت ''فساد'' کا خاتمہ ہے، ان میں ''فساد ارض'' یا فساد فی الأرض کے الفاظ ہیں۔ صرف فساد لغت کے اعتبار سے کسی بھی بگاڑ اور خرابی کے لئے آسکتا ہے۔ اگرچہ قرآن عموماً فساد کو اور خصوصاً باب افعال کے صیغے ''افساد'' کو خونریزی، ظلم اور بدامنی کے معنی میں ہی استعمال کرتا ہے۔ مگر ''فساد فی الأرض'' کے بارے میں عربیت کے ذوق اور اس تعبیر کے مواقع استعمال سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ صرف گناہ برائی یا مولانا کے الفاظ میں ذاتی اخلاق کو بگاڑنے والے گناہ ''الاثم'' پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ فساد فی الأرض کے معنی میں لازمی طور پر ظلم و زیادتی، خونریزی، اور طاقت کے زور پر لوگوں کو مقہور و مجبور بنانا ضرور داخل

ہے۔ قرآن کے استعمالات پر گہری نظر رکھنے والے مشہور امام عربیت علامہ جار اللہ زمخشری نے اس طرف اشارہ فرماتے ہوئے لکھا ہے: والفساد فی الأرض هيج الحروب والفتن "فساد فی الارض کے معنی جنگیں بھڑکانا اور فتنہ (قتل وخوزیزی) پھیلانا ہے[1]۔

بالکل یہی الفاظ اسی آیت کے ذیل میں ہمیں صاحب مدارک التنزیل علامہ نسفی اور ابوالسعود کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

مثلاً ڈاکہ اور بغاوت وخوں ریزی (محاربہ) کے لیے قرآن نے قتل اور سولی کی سزا متعین کی ہے۔ اس موقعے پر کہا گیا ہے کہ "فساد فی الارض" کے مجرمین کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے.........

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ. (المائدہ: ٣٣)

یہاں اگر مولانا کے بیان کردہ معنی لیے جائیں تو اس کا تقاضہ ہوگا کہ ذاتی اخلاق کو بگاڑنے والے گناہ 'الاثم' کے مرتکبین کی گردنیں اڑا دی جائیں!!

عجیب طریق استدلال:

مولانا کے استدلال کا یہ پہلو بڑا محل نظر ہے کہ قرآن نے اگر کسی جماعت کو ایک جگہ مفسد کہہ دیا تو اب پورے قرآن میں اس کے کردار وعمل کی جن خرابیوں کا بھی تذکرہ آیا ہے مولانا کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی اصطلاح میں فساد کا مصداق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی کسی کو کہے کہ وہ نہایت خائن ہے، پھر کسی دن کہے کہ وہ شراب پیتا ہے، اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کروں کہ متکلم کے نزدیک شراب پینا خیانت کا مصداق ہے۔

---

[1] تفسیر الکشاف سورۃ البقرۃ، آیت: ١١

مذکورہ طریقہ استدلال بعینہ اسی قسم کا ہے۔

خلاصہ بحث:

اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک ''مصلحانہ جنگ'' کا سبب قرآن کے بیان میں ''فتنہ اور فساد'' ہیں۔ اور ان دونوں کے دائرے میں مولانا کی تشریح کے مطابق تمام ہی خلاقی خرابیاں آجاتی ہیں۔ مگر اس پر کئی طاقت ور اشکالات وارد ہوتے ہیں:

(۱) جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا قرآن نے جس ''فتنہ'' کے خاتمے کے لیے جنگ کا حکم دیا ہے اس سے مراد فعل وعمل کی برائی' نہیں ہے۔ اسی طرح فساد فی الارض جس کا تذکرہ جنگ کے ذیل میں آیا ہے اس سے مراد قتل وخوں ریزی اور ظلم ہے۔ لہٰذا اس پر مبنی یہ استدلال کہ غیر مسلم حکومت چوں کہ سارے قول وعمل کی برائیوں کا ذریعہ ہوتی ہے صحیح نہیں محسوس ہوتا۔

(۲) پھر دوسری یہ بات کہ اگر ہر غیر مسلم حکومت لازماً ایسی ہی ہوگی اور بقول مولانا اس کا وجود خود فتنہ ہے اور وہ ضرور ساری برائیوں کا سرچشمہ ہے تو پھر اس کی کیا توجیہ کی جائے کہ تمام فقہاء اس کی اجازت دیتے ہیں کہ مسلمان چاہیں تو اس سے کچھ مال لے کر صلح کرلیں؟

(۳) تیسری بات یہ کہ اس نظریے کے حاملین سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ بالفرض اگر کہیں یہ صورت حال درپیش ہو کہ کوئی قوم اسلام نہ لائے لیکن اس کی حکومت ان تمدنی اور اخلاقی خرابیوں کی سرپرست اور حمایت نہ کرے جن کو مولانا مرحوم نے سبب جنگ بتایا ہے تو بھی یہ حضرات یہی کہتے ہیں کہ اس کے خلاف مسلمانوں کو قتال کرنا ہی ہوگا۔ اسکا واضح مطلب یہ ہے کہ خود یہ برائیاں جن کو مولانا ''فتنہ'' اور ''فساد'' کا مصداق قرار دے کر علت القتال یعنی سبب جنگ قرار

دیتے ہیں، فی الواقع سبب جنگ نہیں، سبب جنگ کچھ اور ہے۔ اور وہ جو ہے اس کی مدلل تفصیل گزشتہ صفحات میں آچکی ہے۔

مولانا مودودیؒ کی کتاب اس موضوع پر ایک کارنامہ تھا، اس کی اس تاریخی اہمیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں کہ وہ ایسے وقت سامنے آئی جب الزامات کے شور نے کانوں کے پردے پھاڑ دیے تھے۔ پورے ماحول میں ایک طرح کی سراسیمگی طاری تھی، بہت کسی سے بن پڑتا تھا تو وہ نہایت نحیف آواز اور سہمے سہمے انداز میں کچھ معذرت خواہانہ صفائیاں پیش کرلیا کرتا تھا۔ اس ذہین نوجوان نے پورے اعتماد کے ساتھ جہاد کی وکالت کی۔ اور دوسرے مذاہب اور مغرب کے مدعیان تہذیب کے کارناموں کی تصویر سامنے رکھ کر نہ صرف تصور جہاد کی عظمت ظاہر کی بلکہ بہت سوں کو شبہات کے دلدل سے نکال لیا۔

مولاناؒ کی کتاب کی اس افادیت اور اہمیت کے پورے اعتراف کے باوجود ایک غیر جانبدار قاری مولانا کے نظریۂ ''مصلحانہ جنگ'' سے مطمئن نہیں ہوسکتا۔ غیر مسلموں کو تو چھوڑیے، خود مسلمان اہل دین اس نظریہ سے (جو اصطلاحات اور تعبیرات کے فرق کے ساتھ مشہور عام نظریہ ہے) دلوں میں خلش پاتے ہیں، ہمارے برصغیر میں چونکہ مولانا نے ہی اس نظریہ کی جدید تفہیم کی ہے اور اس کے دلائل بڑی تفصیل سے پیش کئے ہیں اس لئے ہم نے ان کا مفصل جائزہ لینا ضروری سمجھا۔

رسول اللہؐ کی جنگوں کی نوعیت:

قرآن ہی نہیں رسول اللہؐ کی سیرت وسنت اور آپ کی دس سال مدنی زندگی کی جنگوں کا حال دیکھ لیجئے آپ نے کسی صلح پر آمادہ طاقت سے جنگ نہیں کی۔

(۱) مکہ والوں کے بارے میں قرآن نے بارہا صراحت کی کہ وہ انہوں نے جنگ چھیڑ رکھی ہے ''وهم بدءو كم أول مرة'' (انہوں نے ہی ابتداء جنگ کی

ہے) یہ بھی کہا کہ وہ زیادتی اور ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں "وأولئك هم المعتدون"۔ تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ مکہ میں مظالم اور مذہبی جبر کے اس دور کے بعد، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو گھر بار، مال اور اولاد چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی، وہ مدینہ پر حملے میں بھی ابتدا کر چکے تھے۔ ان کے حملہ آور مدینہ پر شب خون اور لوٹ کی کاروائیاں کرتے رہتے تھے۔ مزید انہوں نے، سنن ابوداؤد[1] کی صحیح روایت کے مطابق، مدینہ میں یہود کو اور غیر مسلم عربوں کو بھی مسلمانوں سے لڑانے اور ان کے اخراج پر آمادہ کرنے کے لئے دھمکی آمیز خطوط لکھے۔ انہوں نے عرب کی زمین مسلمانوں پر ایسی تنگ کر رکھی تھی کہ غریب مہاجرین تجارت کے لئے، جس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا، مدینہ سے نکل تک نہیں سکتے تھے۔ اس طرح مسلمان ایک طرح کی جیل میں اور معاشی حصار میں زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ (البقرۃ:۲۷۳)۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع فرمائیں۔

اس کے باوجود ان سے صلح پر آپ کی آمادگی کا یہ حال تھا کہ آپ نے ایک مرتبہ یہ تک فرمایا "لا يسألوني خطة يعظمون فيها حرمات الله إلا أعطيتهم إياها" یعنی قریش مجھ سے جو بھی صلح کی شرط رکھیں گے اگر اللہ کی حرمات کا خیال رکھا جائے گا تو میں اسی کو ضرور قبول کرلوں گا[2]۔

(۴) مدینہ کے یہودی قبائل کو رسول اللہؐ نے اسلامی ریاست کے معزز اور باحیثیت شہریوں کی طرح رکھا۔ ریاست کا جو دستور لکھا گیا اس میں یہود کے قانونی امتیازات اور حقوق وفرائض کا پورا تذکرہ کیا گیا تھا۔ یہود نے اس کو قبول کر کے اسلامی

---

[1] ۳۰۰۴

[2] (بخاری:۲۷۳۴)

ریاست اور اس کے حاکم اعلی کی حیثیت سے رسول اللہ کو قبول کیا تھا۔ مگر سب سے پہلے بنی قینقاع نے علانیہ معاہدہ توڑا، بغاوت کی اور جنگ کا اعلان کیا [1]۔

پھر بنو نضیر نے غداری کی انتہا یہ کی کہ رسول اللہ کو (معاذ اللہ) دھوکہ سے قتل کرنا چاہا، سازش کا انکشاف ہو گیا مگر آپ نے بھی تحمل کی انتہا کر دی۔ ان کو سزا دینے کے بجائے مہلت دینے کا ارادہ فرمایا، اور ان سے کہا کہ اب تم پر اس کے بغیر اطمینان نہیں کیا جا سکتا کہ تم از سر نو معاہدہ لکھو۔ مگر وہ تو آمادۂ جنگ تھے، معاہدۂ صلح پر آمادہ نہیں ہوئے۔ جب کہ بنی قریظہ نے معاہدہ کی تجدید کی۔ پھر آپ نے بنی نضیر پر لشکر کشی فرمائی [2]۔

بنی قریظہ کی عہد شکنی بلکہ غزوۂ خندق کے نازک ترین موقع پر حملہ آوروں فوجوں کا مدینہ کے اندر سے ساتھ دینا اور حملہ میں شرکت معروف ہے۔

(۳) قرآن کی صراحت اور تاریخ کی تصدیق ہے کہ عرب کے مشرک قبائل سب مسلمانوں کے خلاف آمادۂ پیکار تھے اور قریش کے ساتھ تھے۔ قرآن نے ان کے بارے میں کہا ہے:

''وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ'' اور تمام مشرکین سے جنگ کرو اس لئے کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کر رہے ہیں۔

نجد کے قبائل عکل وعرینہ اور بنو سلیم کی سنگین غداریاں اور خونچکاں حرکتیں معروف ہیں، بنو مصطلق جن پر آپ نے اچانک حملہ کیا تھا، وہ پہلے سے محارب تھے، احد میں اہل مکہ کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ پھر ان کے سردار کے بارے میں یہ اطلاع آئی کہ وہ مدینہ پر حملے کے لئے فوجیں جمع کر رہا ہے۔ آپ نے بریدہ بن

---

[1] سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد

[2] سنن ابی داؤد، باب خبر بنی النضیر، بسند صحیح۔

الحصیب الاسلمیؓ کو تصدیق کے لئے بھیجا، وہ خود سردار قبیلہ حارث ابن ابی ضرار سے ملے اور اسی سے تیاریوں کی تصدیق کرلی، جب تحقیق ہوگئی تو آپ نے حملہ فرمایا[1]۔

(۴) شمالِ عرب کی مہمات کی تفصیل پیچھے غزوۂ تبوک اور غزوہ موتہ کے حوالے سے گذر چکی ہے، وہاں ہم نے ان مہمات کا پورا تاریخی پس منظر ذکر کردیا ہے۔ اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے ان طاقتوں کے خلاف جو جنگ کی تھی وہ ان کے محاربہ کے نتیجہ میں تھی، آپ نے کسی صلح جو اور امن پر آمادہ طاقت کے خلاف قطعاً جنگ نہیں کی۔

ابن تیمیہ اور ابن قیم کی صراحتیں:

امام ابن تیمیہ اپنے رسالہ قاعدۃ فی قتال الکفار میں کہتے ہیں:

وکانت سیرته (صلى الله عليه وسلم) ان كل من هادنه من الكفار لا يقاتله، وهذه كتب السيرة والحديث والتفسير والفقه والمغازى تنطق بهذا وهو متواتر من سيرته۔

یعنی آپؐ کی سیرت کی شہادت ہے کہ آپ سے جن کفار نے صلح کی آپ ان سے جنگ نہیں کرتے تھے، یہ سیرت کی کتابیں ہیں، یہ حدیث وتفسیر اور فقہ وتاریخ کی کتابیں ہیں، سب یہی بتلاتی ہیں، اور یہ چیز آپؐ کی سیرت سے متواتر اور قطعی طور پر ثابت ہے[2]۔

علامہ ابن قیمؒ اپنی کتاب ''ہدایۃ الحیاریٰ'' میں کہتے ہیں:

من تأمل سيرة النبى (صلى الله عليه وسلم) تبين له ......أنه انما قاتل من قاتله وأما من هادنه فلم يقاتله۔

جو رسول اللہ کی سیرت میں غور کرے گا اس کو پتہ چل جائے گا کہ......آپ

---

[1] طبقات ابن سعد،۲/ ۴۳، و سیرت ابن ہشام

[2] کتاب مذکور صفحہ:۱۳۴)

نے صرف ان لوگوں سے جنگ کی جو آپ سے جنگ کرتے تھے، رہے وہ جنہوں نے آپ سے صلح کی آپ نے ان سے جنگ نہیں کی۔[1]

رسول اللہؐ نے صرف دفاعی نہیں اقدامی جنگیں بھی کیں:

ان جنگوں کو جن بزرگوں نے ''محض دفاعی'' جنگوں کا نام دیا ہے، غالبًا یہ لفظ اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے یہ خیال قائم ہوتا ہے کہ آپ نے دوسروں کے حملوں کا صرف دفاع کیا، حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ آپ محاربہ کا ارادہ اور تیاری کرنے والوں کے خلاف خود بھی اقدامات فرمایا کرتے تھے، جنگ بدر ایسے ہی ایک اقدام کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئی، موتہ اور تبوک کی یہی کہانی ہے، اور بنو مصطلق اور دیگر کئی مہموں کی یہی حقیقت ہے۔ آج کی اصطلاح میں آپ ان جنگوں کو (Preemptive wars) کہہ سکتے ہیں۔ یہ جنگیں اقدامی جنگیں ہی تھیں۔

بہر حال آپؐ نے دفاعی جنگیں بھی لڑیں ہیں اور محاربہ کرنے والوں کے خلاف اقدامی جنگیں بھی۔ مگر آپ کی ہر جنگ صرف محارب طاقتوں کے خلاف تھی۔ اور اسی لئے قطعی طور پر منصفانہ تھی اور اس ''اعتداء'' اور زیادتی سے پاک تھی جس سے دور رہنے کا حکم قرآن نے مسلمانوں کو عین اس وقت دیا تھا جب ان پر جنگ کرنا واجب قرار دیا جارہا تھا۔ **وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين.**

قرون اولی کی جنگی مہمات:

صحابہ کرام اور خلافت راشدہ کے دور میں فارس وروم کی مقبوضات فتح کی گئیں، اس دور میں ہم کو ان دونوں سلطنتوں کے خلاف ایران کی سرحدوں سے لے کر

---

[1] ہدایۃ الحیاری جلد اول صفحہ: ۱۱۳

شام و مصر کی آخری حدوں تک جنگوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ جلد بازی اور سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والے ان جنگوں کی علت یہ بتاتے ہیں کہ صحابہ کرام نے جب عرب کے دائیں بائیں نظر اٹھائی کفار کو حکمراں دیکھا، تو ان کو اپنے دین کا یہی حکم نظر آیا کہ ان کے سروں پر تلوار لے کر پہنچ جائیں اور صاف کہہ دیں یا اسلام قبول کر دیا مسلمانوں کے لیے تخت چھوڑ دو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگیں دراصل عہد نبوی کی جنگوں کا امتداد ہیں، رسول اللہ کی جب وفات ہوئی تو شام کے حدود پر رومن امپائر کے ساتھ جنگ شروع ہو چکی تھی، اور متعدد معرکے ہو چکے تھے۔ قیصر اور اس کی ماتحت طاقتیں اپنے پڑوس میں ایک انقلابی اور نہایت جاذب و مؤثر دعوت پر قائم ریاست کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے لاکھوں کے لشکر جمع کر چکیں تھیں اور رسول اللہ نے ان کی پیش بندی کے لئے اقدامات بھی فرمائے تھے۔ لیکن نہ رومیوں کا زور ٹوٹا تھا نہ ان کے ارادے بدلے تھے۔ لہذا بعد میں بھی اس قسم کے اقدامات کرنے ضروری تھے، جو خلافت راشدہ کے دور میں انجام پائے۔

سلطنت فارس دوسری بڑی طاقت تھی، جو صحابۂ کرام کے ہاتھوں زیر ہوئی، رسول اللہ نے اس کے فرماں روا کسریٰ کو دعوت اسلام کا خط لکھا، جو اس نے نہ صرف نہایت رعونت کے ساتھ پھاڑ ڈالا، بلکہ اپنے ایک گورنر کو (معاذ اللہ) رسول اللہ کو گرفتار کر کے اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا، یمن کے گورنر نے دو سپاہیوں کو اس پیغام کے ساتھ مدینہ بھیجا کہ اپنی اور عرب کی خیر چاہتے ہو تو گرفتاری قبول کر کے کسری کے دربار میں حاضر ہو جاؤ ورنہ تم کسری کی طاقت و جبروت کو جانتے ہو وہ تمہارے پورے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

بہر حال اس پس منظر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تصور سراسر سطحی

مطالعہ پر مبنی ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں جو جنگیں ان ممالک کے ساتھ ہوئیں قصہ کی ابتداء وہیں سے ہوتی ہے، نہ ان کے ساتھ کوئی کشمکش جاری تھی اور نہ یہ حکومتیں اس کے علاوہ کسی اور جرم کی مرتکب تھیں کہ وہ غیر مسلم تھیں اور صاحب شوکت تھیں۔

افسوس کس قدر سادگی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ لوگ جو خلافت راشدہ کی ان جنگوں کے پورے تاریخی پس منظر کے ریکارڈ ہونے کے باوجود ان ظالم وخونی حکومتوں اور ان کے دشمنِ حق حکمرانوں کے خلاف جنگ کا سبب صرف غیر مسلم حکومت کا خاتمہ قرار دے دیتے ہیں۔ کوئی شخص جو ایک طرف ان سلطنتوں کی توسیع پسندی کی ہوس اور خونی تاریخ کو جانتا ہو اور دوسری طرف وہ نوخیز اسلامی ریاست اور ان طاقتوں کے ابتدائی تعلقات کے اس پس منظر پر بھی نظر رکھتا ہو جس کو ہم نے اوپر ذکر کیا، کیا وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بالکل پڑوس میں واقع ان عالمگیر طاقتوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا؟؟ اگر شدید خطرہ تھا اور یقیناً تھا تو ان جنگوں کا سبب اس سنگین خطرے کی پیش بندی اور اسلامی ریاست کا تحفظ تھا۔

ان دونوں حکومتوں سے جنگ کو مسلمانوں پر فرض کرنے والی ایک دوسری اہم چیز یہ بھی تھی کہ ان طاقتور حکومتوں کے باقی رہتے ان کے عوام تک اسلام کی دعوت پہنچنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اسلام کے اولین داعیوں کا کیا انجام رومن امپائر کی تابع ایک عرب ریاست میں ذات اطلاح کے مقام پر ہوا۔ دعوت اسلام دیتے ہی پندرہ میں سے چودہ داعیوں کو قتل کر دیا گیا، صرف ایک نہایت زخمی حالت میں...... مدینہ پہنچ سکا۔ ان ریاستوں کے ایک معزز امیر نے اسلام قبول کرلیا تو ہرقل (بیزنطینی رومن سلطنت کے فرمانروا) نے اس کو بلا کر قتل کر کے سولی پر لٹکا دیا کہ دوسروں کے لئے عبرت کا سامان بنے۔

نامۂ نبوی پر کسریٰ کے رعونت بھرے ردعمل نے صاف بتا دیا تھا کہ فارس

علاقوں میں دعوت اسلام کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا، ان حکمرانوں کی حکومتوں کے مذہبی جبر، اور قرآنی اصطلاح میں ’’فتنہ‘‘ اور صدعن سبیل اللہ‘‘ نے یقیناً ایسی صورت حال پیدا کردی تھی کہ اللہ کے سپاہی اٹھیں اور ان کے غرور کو، بحکم خدا، خاک میں ملا دیں۔

ان حکومتوں کا یہی جرم دراصل صحابۂ کرام کی جنگوں کا اصل سبب تھا، دراصل اس زمانہ کی صورت حال ہی ایسی تھی کہ کوئی حکومت اپنی قلم رو میں دوسرے دین کو اور خصوصاً اسلام جیسی دعوت کو ہرگز پنپنے نہیں دے سکتی تھی، یہ چیز اس زمانے کی صورت حال میں بالکل قطعی اور طے تھی، اسی لئے رسول اللہؐ نے ان حکمرانوں کو جو خطوط لکھے تھے ان میں کہا تھا کہ اگر تم اسلام نہیں لائے تو پوری قوم کے کفر کے تم ہی ذمہ دار ہوگے۔ آپؐ نے کسریٰ کو لکھا: فان ابيت فعليك إثم المجوس ’’(تاریخ طبری: ۲/۱۲۳) مقوقس شاہ مصر کو آپ نے لکھا: ’’فان أبيت فان إثم القبط عليك ‘‘[1] قیصر کو آپ نے لکھا: ’’فعليك إثم الأريسين ‘‘[2] ریسیئن یا اریسیئن سے مراد کاشتکاروں پر مشتمل وہ کثیر تعداد کی رعایا تھی جو رومی مقبوضات (شام و مصر اور افریقہ و ایشیا) کے وسیع علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی[3]، اور جن کی حیثیت تاریخ کی واضح شہادتوں کی روشنی میں مقہور و مجبور غلاموں کی سی تھی۔

ایک اور استدلال:

جو حضرات بوقت قدرت تمام غیر مسلم حکومتوں سے جنگ کے فرض ہونے کی رائے رکھتے ہیں چاہے وہ صلح کرنے پر آمادہ ہی کیوں نہ ہوں، ان میں سے بعض بزرگ اِس موقف کے اُسی استدلال کے لیے جو مولانا مودودی کے حوالے سے اور پر

---

[1] زاد المعاد: ۳/۶۰۰

[2] صحیح بخاری: ۷

[3] فتح الباری

گذرا ہے ایک نسبتاً زیادہ معقول تعبیر اختیار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ غیر مسلم حکومت جب اپنی حربی طاقت، مادی وسائل اور اپنے نظریات کے ساتھ موجود رہے گی تو اس کی یہ شوکت خود دنیا کے عوام کے لئے اسلامی دعوت قبول کرنے سے ایک نفسیاتی رکاوٹ پیدا کرے گی، کفر کی ایسی شوکت وعزت کے ساتھ لوگ آزادانہ غور وفکر نہیں کر سکیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی قوم کی شوکت وطاقت اس کے نظریہ کے لئے ایک مددگار وسازگار ماحول پیدا کرتی ہے، اور اس ماحول میں کسی دوسری اجنبی دعوت کے لئے ایک درجہ کی نفسیات رکاوٹ پیدا ہونا یقیناً فطری امر ہے۔ مگر مجھے یہ بتایئے کہ کیا اگر کوئی دوسری قوم یہ کہے کہ ہمارے نظریات پر مسلمان غیر جانبداری کے ساتھ اس وقت تک غور کر ہی نہیں کر سکتے جب تک مسلمانوں کی حکومت وشوکت ختم نہیں کی جائے، لہذا ہم مسلمانوں کے ملک پر اس لیے حملہ کر رہے ہیں تاکہ وہ آزادانہ ہماری دعوت پر غور کر سکیں، تو ایسی شکل میں ہم کیا کہیں گے؟؟

اگر ہم مذہب وعقیدہ اور نظریہ کے سلسلہ میں آزادانہ انتخاب کے اصول کے قائل ہیں تو آزادی کے لئے ساری ملتوں کے حق میں ایک ہی معیار اپنانے کا پابند ہونا ضروری ہے۔

نیز یہ بھی سوچیے کہ دنیا میں کون انصاف پسند اس قوم وملت کے بارے میں اچھی رائے رکھ سکے گا جو یہ کہے کہ چوں کہ ہم کو اپنے دین کی تمہیں دعوت دینی ہے اور تمہاری حکومت اور طاقت ایسی نفسیاتی رکاوٹ بن رہی ہے جس کے رہتے ہوئے تمہارے لئے ہماری دعوت پر پورے طور پر غیر جانبدار ہو کر غور کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے ہم تم سے جنگ کر کے پہلے اپنی حکومت تم پر قائم کریں گے اور تمہاری طاقت ختم کریں گے۔ ہم بصد ادب ونیاز اپنے بزرگوں سے گذارش کریں گے کہ یہ منطق

اسلام کی دعوت کے سامنے کسی بھی غیر مسلم حکومت سے بڑی نفسیاتی رکاوٹ بنے گی، اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں یہی تاثر قائم کرے گی کہ یہ باتیں سب بہانے اور دھوکے ہیں، اور ان کی آڑ میں ہم کو غلام بنانے اور دباؤ اور لالچ کے ذریعہ ہمارا دین بدلنے کا منصوبہ ہے۔

اصل بات کیا ہے؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علماء سلف کی اکثریت کی تحریروں اور تشریحات سے غالب تاثر یہ نہیں قائم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت اور غیر مسلم حکومت کے درمیان اصل صلح ہے، اور صلح پر آمادہ قوم کے خلاف جنگ کی گنجائش نہیں ہے۔ ماضی کی طویل تاریخ پر محیط اسلامی فکر کا عمومی رجحان اسی طرف محسوس ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے پاس قدرت وطاقت ہو تو وہ کسی غیر مسلم طاقت سے صلح نہیں کریں گے، چاہے وہ کسی ''فتنہ'' یا زیادتی کی مرتکب نہ ہو، اور صلح کی پیش کش بھی کرے۔

پھر کیا یہ رائے غلط تھی؟ کیا علمائے سلف اور ائمہ اسلام اتنی لمبی مدت تک ایک غلط بات کہتے آئے؟ ہرگز نہیں۔ اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ قیامت تک مکمل محفوظ رہے گا۔ اور یہ بھی کہ اس امت کے اہل علم اجتماعی طور پر کسی غلطی میں نہیں پڑیں گے، جو لوگ اپنے علم وفہم کی بنیاد پر اسلاف امت اور ائمہ کرام کے مجموعی موقف کو غلط سمجھتے ہیں وہ بے شمار گمراہیوں کے دروازے کھولتے ہیں۔

ہمیں پورا اطمینان ہے کہ جس دور میں اور جن حالات میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی وہ بالکل برحق رائے تھی، ان حالات کے لئے وہی شرعی حکم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے کے زمانوں میں ہر ریاست واضح مذہبی شناخت رکھتی تھی۔ بادشاہتیں مذہب سے اپنی حکومت کے استحکام کا کام لیتی تھیں، بادشاہ یا تو خدا کا اوتار بنتا تھا یا

مذہبی قیادت کے ساتھ اس کا یہ سمجھوتہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے۔ اس لئے اس کا نہ کوئی امکان ہوتا تھا اور نہ ہی تصور کہ کوئی طاقتور حکومت اور منظم ریاست اپنے قلم رو میں اسلام کی نشر واشاعت ودعوت اور اللہ کی عبادت وبندگی کی اجازت دے سکتی ہے۔ مسلمانوں جن ریاستوں سے جنگ کی ان میں سے کسی نے کبھی اس کا جھوٹا دم بھی نہیں بھرا تھا کہ وہ اسلامی دعوت کے لئے راستہ کھولنے کو تیار ہے۔ یہاں تک کہ شکست کھاتے وقت بھی کسی غیر مسلم حکومت نے ایسی کوئی پیشکش نہیں کی۔

رسول اللہؐ نے سلاطین عالم کو خطوط لکھے تو ان میں صاف لکھا کہ اگر تمہاری حکومت اسلام قبول نہیں کرتی تو عوام کی گمراہی کا گناہ بھی تم پر ہی ہوگا۔ یہ اسی صورت حال کی طرف اشارہ تھا۔ ایسی صورت حال چاہے وہ ماضی میں ہو یا حال میں یا مستقبل میں اس کا شرعی حکم یہی ہوگا کہ قدرت ہو تو ضرور جنگ کی جائے۔ اور اللہ کے دین کے سامنے سے رکاوٹیں ہٹا دی جائیں۔

لیکن اگر دنیا کی کوئی حکومت عملاً دعوت اسلام کے سامنے رکاوٹ نہیں بن رہی ہو اور صلح پر آمادہ ہو تو یقیناً اس سے جنگ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

آج کے زمانے میں جب کہ ایک بندۂ خدا تک دعوت پہنچانے کے بظاہر سارے امکانات کھلے ہوئے ہیں یہ کیسے مان لیا جائے کہ محض حکومت کے سامنے ایک مرتبہ دعوت پیش کر کے پورے ملک کے انسانوں کو دعوت دینے کا فریضہ ادا ہو گیا اور حجت تمام ہوگئی اب ان کے لئے جنگ کے علاوہ کوئی راستہ نہیں باقی رہ جاتا ہمیں مکمل یقین ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اگر عام انسانوں تک پہنچنے اور ان کو اللہ کے دین کی طرف گفتار وکردار سے دعوت دینے اور اسلامی زندگی کی حقیقی برکتوں سے ان کو روشناس کرانے کے امکانات ہوتے اور حکومت واقتدار کی طاقتیں لوگوں کی

عقلوں اور دلوں کو فتنہ میں مبتلا نہ کرتیں تو کبھی ان امکانات کے باقی رہتے ہوئے مسلمان کسی حکومت کو ہٹانے کے لئے جنگ نہ کرتے۔

اگر چہ میں اس تاریخی حقیقت سے ناواقف نہیں ہوں کہ دین حق کی یہ دعوت بہت جلد حکومتوں اور مقتدر طبقات کو اپنے ظالم نظام اور فاسد طریقۂ زندگی کے لئے ایک خطرہ نظر آنے لگتی ہے، اور پھر وہ اس کے راستہ میں مکروفریب سے لے کر ظلم و جبر تک کی ساری رکاوٹیں کھڑی کرنے لگتے ہیں۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن نے فتنہ کہا ہے۔

یقیناً ایسی صورت میں ان حکومتوں کو ختم کرنا ایک مقدس اسلامی فریضہ اور انسانی خدمت کا ایک ضروری کام ہوگا۔ مگر پھر بھی اگر کوئی یہ کہے کہ غیر مسلموں کی حکومت فی نفسہ ایسی چیز ہے کہ اس کو ختم کرنے کے لئے جنگ کرنی چاہئے چاہے وہ کسی ظلم و جبر اور اسلام کا راستہ روکنے کی مجرم نہ ہو، تو یہ بات اسلام کے بارے میں غلط تاثر ضرور قائم کرے گی۔

یہ بات بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر معاشرہ کی قیادت اپنی تہذیب اور اپنے تصورات کو رائج کرنا چاہتی ہے۔ قوموں میں اپنے عقائد و تصورات اور تہذیب و طرز زندگی کے لئے ایسا تعصب ہوتا ہے کہ وہ ہر نئی دعوت و تحریک کی مخالفت اپنا قومی فریضہ جانتی ہیں۔ خصوصاً ان کی قیادت اور طاقت کے مراکز پر قابض طبقہ (قرآن کے الفاظ میں ''الملأ'' کا طبقہ) تعصب اور تہذیبی استکبار میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اگر وہ شروع میں کسی ایسی نئی دعوت کو (جو زندگی کے بگاڑ کی بنیادی اصلاح کرنا چاہتی ہو) برداشت کر لیتے ہیں تو ان کو جیسے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی آواز کی طرف دل متوجہ ہو سکتے ہیں اور وہ کچھ انسانوں کو متاثر کر سکتی ہے، اسی وقت سے وہ اس کے دشمن بن جاتے ہیں اور اپنی قوم کو قائل کرنے کے لئے اس کے خلاف طاقت کے استعمال کا

جواز یہ کہ کر پیش کرتے ہیں کہ:

إِنْ هَـٰذَانِ لَسَـاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَنْ	یہ چاہتے ہیں کہ تم کو اپنے جادو کے زور
يُـخْـرِجَـاكُـم مِّنْ أَرْضِـكُـم	سے اپنے ملک سے بے دخل کر دیں اور
بِسِـحْـرِهِـمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ	تمہارے شاندار طرز زندگی کا خاتمہ کر
الْـمُثْلَىٰ. فَأَجْمِعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ	دیں لہذا تم سب اپنی طاقت جمع کرو اور
ائْتُوا صَفًّا	متحد ہو کر ان کے مقابلے کو آؤ۔

اس تاریخی اور فطری حقیقت کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یورپ نے صدیوں انسانی حقوق کا راگ الاپا اور شخصی آزادیوں کے نعرے لگائے اور جو مذہبی آزادی کا چمپئن بنا رہا اس نے عالم اسلام کو طاقت کے زور سے فتح کیا اور پھر اس کی تہذیبی وفکری یورش نے مسلمانوں کی دینی بنیادیں ہلا دیں۔ اس دوران یورپ کے مختلف ممالک میں مسلمان جا جا کر آباد ہوے۔ لمبے عرصے تک وہاں کی حکومتوں نے پوری مذہبی آزادی دی، لیکن اب جب اسلام کی دعوت مغرب میں عام ہونے لگی اور مغرب کا انسان اپنی تہذیب کے داخلی تضادات اور کھوکھلے پن کے احساس سے مجبور ہو کر اسلام کی طرف نگاہ اٹھانے لگا ہے تو یہی آزادیِ انسان کی علم بردار حکومتیں مسجد کے میناروں اور نقاب کے خلاف قانون بنانے لگی ہیں، اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ اسلام کے داعیوں کا اپنے ملک میں داخلہ بند کرنے لگی ہیں۔

ہم ان حقیقتوں سے غافل نہیں ہیں، اور قرآن نے دعوت دین کے راستے میں پیش آنے والی اس فطری صورت حال کی طرف ہماری رہنمائی بھی کی ہے، مگر ہم ایک بار پھر اپنی اس رائے کو دہراتے ہیں کہ یہ کہنا اسلام کو بدنام کرنا ہوگا کہ جنگ کرنے کے لئے محض یہ بات کافی ہے کہ دنیا میں کوئی غیر مسلم قوم اپنی خود مختار حکومت رکھتی ہے جو نہ کسی بڑے ظلم کی مرتکب ہے اور نہ اپنی عوام تک اسلام کی دعوت پہنچنے کی راہ میں

مزاحم ہے۔ ہاں اگر وہ اللہ کے دین کی مخالفت میں "فتنہ" کی مرتکب ہے تو ضرور اللہ کے بندوں پر یہ فریضہ عائد ہوگا کہ وہ اس کا خاتمہ کر کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دیں۔

لہٰذا اسلامی اصول یہ قرار پایا کہ جب تک کوئی غیر مسلم حکومت دین حق کی راہ میں رکاوٹیں نہیں کھڑی کرتی اس وقت تک مسلمانوں سے اصل مطالبہ یہی ہے کہ وہ دعوت و نصیحت پر اپنی ساری کوششوں کو مرکوز کر دیں اور انبیا علیہم السلام کے طریقہ پر ان پر اتمام حجت کر دیں، جس کے بعد اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے لئے ضرور بالضرور یا دلوں کو فتح کر دیتا ہے یا ملکوں کو۔ اور یہ اس کی ناقابل تبدیل سنت ہے۔

واضح رہے کہ ہماری اس بات کا تعلق محض اس مفروضے سے ہے کہ کوئی حکومت عملاً دعوت اسلام کے سامنے رکاوٹ نہیں بن رہی ہو اور صلح پر آمادہ ہو، واقعہ میں کون سی حکومت کس کے لیے کیسی ہے ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ رہے۔ ہم بس یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام صلح چاہنے والی اور اسلامی دعوت کا راستہ نہ روکنے والی حکومت سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

ایک ضروری تنبیہ:

اس کے علاوہ قرآن وسنت کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ بات سنت اللہ میں طے ہے کہ مسلمان جب بھی اپنے منصب شہادت کے ساتھ ناانصافی کریں گے اور ان کا عمومی حال دین سے غفلت اور اللہ کو ناراض کرنے والا ہوگا تو ان کو اللہ کی طرف سے دنیا میں ایسی طاقت اور عزت نہیں مل سکتی کہ وہ اقدامی کارروائیوں کی پوزیشن میں ہوں۔ اس دور میں ان سے اپنے علاقوں کا اور اپنی آزادیوں کا دفاع بھی نہیں ہو پاتا، تا آنکہ وہ اللہ سے اپنا معاملہ ٹھیک کر لیں۔ یعنی شرعی ہی نہیں تکوینی طور پر بھی امت مسلمہ اللہ سے دوری اور نقض عہد کے دور میں اس طرح کے اقدامی جہاد

کے لائق نہیں رہ سکتی۔ قرآن نے اس کو صاف اور قطعی طور پر واضح کیا ہے، اور اس کی دلیل کے طور پر بنی اسرائیل کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔ اللہ کی اس سنت کی کچھ تفصیل آئندہ آئے گی۔

جاہلانہ غلو کی ایک مثال:

ہمارے یہاں اور دینی حمیت کے نام پر کس قدر جہالت آمیز غلو کے شکار ''اہل علم وقلم'' پائے جاتے ہیں اس کی ایک مثال اس وقت میرے سامنے ہے۔ سرٹی ڈبلیو، آرنلڈ سے برصغیر کے اہل دانش ناواقف نہیں۔ جب دنیا اسلام کے تلوار کے زور پر پھیلنے کے پروپیگنڈے سے گونج رہی تھی، شور تھا کہ مسلمانوں نے تلوار کی دھار پر قوموں کو زبردستی مسلمان بنایا ہے۔ اور یہ سب اس لئے تھا کہ استعماری طاقتوں اور عیسائی مشنریز کے لئے دنیا کی قوموں کو اسلام سے برگشتہ کرنا آسان ہو جائے، اس وقت اس غیر مسلم حق گو کی آواز اٹھی کہ سب جھوٹ ہے۔ ایک شاندار کتاب The preaching of Islam کے نام سے ایسی شائع کی جس کی افادیت آج بھی مسلم ہے۔ ایسے منصف مزاج اور مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہونے والے غیر مسلم دانشور کے بارے میں ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ان جیسوں کو تہ تیغ کر دینا چاہئے۔ **لاحول ولاقوۃ إلا باللہ۔**

ہم آپ مزید شرمندہ و حیران اور مضطرب ہوں گے جب آپ ان صاحب کو دیا گیا علمی مرتبہ جانیں گے۔ قصہ یہ ہے کہ آرنلڈ کی کتاب کا دنیا کی مختلف اسلامی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا، عربی کے مترجم نے مصنف کے تعارف میں یہ لکھ دیا کہ ''حق یہ ہے کہ ہم مصنف کی قدر نہیں کر سکتے''۔ بس کیا تھا ایک برخود غلط نادان ''دکتور'' نے تبصرہ فرمایا:

> اس کی قدر؟ اس کی قدر یہ ہے کہ تلوار سے سر قلم کر دیا جائے، الا یہ کہ وہ

اسلام کے سامنے سر جھکا دے یا جزیہ دے۔

"قلت ان قدره لو يعلم هؤلاء هو الضرب بالسيف حتى يرد، او يخضع الإسلام أو يدفع الجزية"[1]

معاف کیجئے گا جو شرمندگی ہو، کہ ہمارے درمیان دین و شریعت میں اسی قدر کج فہمی کے شکار بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی نہیں، حیرانی و شرمندگی کی انتہا نہیں رہتی جب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اس تحریر پر جامعہ ام القریٰ، سعودی عرب سے ڈاکٹرٹ کی سند پاتے ہیں اور ان کو ممتاز کا گریڈ دیا جاتا ہے۔

کیسے عرض کیا جائے کہ سعودی عرب میں علم دین کے ساتھ کیسا مذاق ہو رہا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے غیر مسلموں کے لئے یہ خیالات رکھنے والے نہ قرآن کو سمجھتے ہیں نہ حدیث کو۔ کاش ان کی نظر جاتی کہ بدر کے قیدیوں کو دیکھ کر رسول اللہؐ کو ایک پرانا غیر مسلم محسن مطعم بن عدی یاد آتا ہے، جس نے آپؐ کو طائف سے واپسی پر پناہ دی تھی، آپؐ فرماتے ہیں: اگر مطعم حیات ہوتے اور اِن کو چھوڑنے کی سفارش کرتے تو میں اُن کی خاطر اِن سب کو چھوڑ دیتا[2]۔

اس ذہنیت کے لوگوں کی نفسیات کا یہ محض ایک نمونہ ہے۔ اس کو ایک دو افراد کا مسئلہ سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے۔ مسلمانوں کی مظلومیت اور مغرب کی لگاتار اور بے حیا چیرہ دستیوں نے ایک عجیب قسم کی بر خود غلط سوچ پیدا کر دی ہے، جو ہمارے لئے ایک مشکل مسئلہ بن رہی ہے۔ اسلام کے یہ نادان دوست اسلاموفوبیا پھیلانے والوں اور صیہونیت اور صلیبیت کی نہایت بیش بہا خدمت انجام دے رہے ہیں۔

---

[1] أهمية الجهاد للعلياني صفحہ: ۲۶۲، بحوالہ فقہ الجہاد، شیخ یوسف القرضاوی: ۱/۲۵۳)

[2] بخاری: ۴۰۲۴

اسلاموفوبیا کی خدمت:

کچھ لوگ دینی حمیت وصلابت کے نہایت پسندیدہ جذبے سے ایسی تعبیرات پر اصرار کرتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچانے والی ہوتی ہیں۔ آپ ذرا سوچیے! یہ بات کہ اگر ہمارے پاس قدرت ہوگی تو ہم دنیا کی ہر قوم کو اس حق سے محروم کردیں گے کہ وہ اپنے اوپر اپنی پسند اور اپنی قوم کی حکومت قائم کرے۔ وہ یا تو اسلام قبول کرے ورنہ اس کو ہماری حکومت کے تحت رہنا ہوگا غیر مسلموں کے لیے کیسا خوف زدہ کرنے والا تصور ہے۔ جہاد کی یہ تعبیر مشرق ومغرب کی تمام قوموں کو اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر متحد کررہی ہے۔ اور مسلم دشمن لابیوں کو اس کا سامان فراہم کررہی ہے کہ وہ دنیا کی مختلف قوموں کو یہ باور کرائیں کہ مسلمان واقعۃً ایسا خطرہ ہیں کہ ان کو ویسے ہی دبا کر رکھنا ضروری ہے جس طرح امریکہ واسرائیل کے زیر قیادت دنیا میں اس وقت ان کو رکھا جارہا ہے۔

آخری بات:

<u>اس خاص پہلو پر فوری غور کی اس لیے شدید ضرورت ہے کہ بظاہر دنیا میں قیادت اور پالیسی کی بڑی تبدیلیاں قریب ہیں، بلکہ ان کا آغاز ہوچکا ہے۔ خود مغرب پورے طور پر آگاہ ہے کہ ان تبدیلیوں کا آغاز اس قوت اور رفتار سے ہوچکا ہے کہ اب ان کو روکنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ قیادت اور سیاسی ثقل کا مرکز امریکہ اور مغربی یورپ سے جنوبی ایشیا منتقل ہورہا ہے۔ نئی قیادت اپنے مصالح کے مطابق یقیناً نئی پالیسیاں بنائے گی۔ امریکہ اور اسرائیل اس وقت اسلام سے خوف دلا کر اپنی پالیسیوں کی بقا اور مفادات کے تحفظ کے لیے کوشش کررہے ہیں۔ ان کی کوشش ہوگی کہ وہ دنیا کی نئی قیادت کو پھر سے مسلمانوں سے اسی طرح متنفر کردیں جس طرح جانے والی قیادت کو</u>

لگاتار ایک خاص نفسیاتی کیفیت میں مبتلا رکھا گیا۔ اگر اس کروٹ بدلتی دنیا میں اور اس کے نئے سیاسی ذہن میں بھی وہی اسلام فوبیا اور اسلام دشمنی باقی رہی تو یقیناً ہم اگلی نئی دنیا میں دعوت اور امن وانصاف دونوں کے امکانات کو کھودیں گے۔

اللہ سے دعا ہے کہ یہ باتیں وہاں پہنچ جائیں جہاں ان کا اصل فائدہ ہو سکے۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات۔

فصل سوم

صلح

اسلام کے قانون بین الاقوام کا اصل الاصول صلح ہے۔ یعنی دنیا کی ریاستوں کے ساتھ مسلم ریاست کے تعلق کی اصل نوعیت یہ ہے کہ وہ پر امن صلح پر مبنی ہوں گے۔ قرآن نے مسلمانوں کے لیے جس وقت جنگ کرنے کی اجازت دی ہے اسی وقت جنگ کے جواز (Justification) کے سبب کے طور پر یہ بات بیان کی ہے کہ:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا — جن لوگوں پر جنگ مسلط کی جارہی ہے ان کو (اب) اجازت دی جارہی ہے اس لیے کہ وہ مظلوم ہیں۔

یعنی مکہ کے ظالموں نے لوگوں کے لیے آزادی کے ساتھ اللہ کے دین پر قائم رہنا مشکل کر رکھا ہے، پہلے انہوں نے مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں پر دائرۂ حیات ایسا تنگ کیا کہ انہیں اپنی متاع جان وایمان بچا کر بھاگنا پڑا، اور اب وہ مدینے میں بھی ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دے رہے ہیں اور یہاں بھی ان کے خلاف مستقل جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف سے اس مذہبی جبر ''الفتنة'' کو ختم کرنے کے لیے قتل وقتال کی اجازت دی گئی ہے۔

اسی سورت بقرہ میں اس سے پہلے جب پہلی مرتبہ قتال کا حکم مسلمانوں کو دیا جارہا تھا، کہا گیا ہے کہ ان مسلمانوں کی جنگ پر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں، اس

لیے کہ ان کے خلاف ان مکہ والوں نے خود جنگ چھیڑ رکھی ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ. وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (البقرة ۱۹۰-۱۹۱)	اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو خود تم سے جنگ کر رہے ہیں، اور (خود) کوئی زیادتی مت کرنا۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اور ان کو جہاں پاؤ قتل کرو، اور انکو وہاں سے (یعنی مکہ سے) بے دخل کرو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور "فتنہ" قتل سے بڑی برائی ہے۔

مگر قرآن کہتا ہے کہ امکان ہو تو صلح ضرور کر لی جائے۔ جہاد و قتال کے لیے جوش دلانے والے ایک ولولہ خیز سلسلۂ کلام میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. وَإِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ (الانفال: ۶۱-۶۲)	"اگر یہ (خدا اور مسلمانوں کے دشمن، اپنی دشمنی کے باوجود) مصالحت کی طرف جھکتے ہیں تو تم بھی اس کی طرف جھک جانا، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ (سب) سننے اور جاننے والا ہے۔ اگر ان کی نیت تم کو دھوکہ دینے کی ہوگی تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔

جیسا کہ ہم باب دوم کی دوسری فصل میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ ان آیات کا سیاق وسباق مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے اور اس کی تیاری کے لئے جوش وحمیت پیدا کرنے کا ہے۔ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ دشمن اگر صلح پر

آمادہ ہوتا ہے تو صلح کرنے کا حکم ہے۔ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ دشمن صلح کے بہانے دھوکہ نہ دے دے۔ سو اس کی پیش بندی کے طور پر پہلے تو کہا کہ صلح کرنے میں توکل علی اللہ کا مظاہرہ کرو۔ پھر مزید صراحت کی کہ اگر ان کے دھوکہ دینے کا اندیشہ ہو تو جان لو کہ اللہ پر توکل ہی تمہارا سرمایہ ہے۔ یعنی اس سلسلے میں اندیشہائے دور دراز کا زیادہ خیال نہ کرو۔

یہ آیات (مدینہ کے یہودی قبائل کے بارے میں یا) مکہ کے ان مشرکین کے سلسلہ میں نازل ہو رہی تھیں جن سے اس دور میں اصل جنگ چل رہی تھی، جو اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے، جنہوں نے اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور شہر اسلام مدینہ منورہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کو اپنا قومی مقصد بنا رکھا تھا۔ اور یہودی قبائل ان کے مددگار بنے جا رہے تھے۔ ان آیات کا اصل موضوع جہاد و قتال پر آمادگی بلکہ اس کا جوش پیدا کرنا ہے، ان کا انداز و اسلوب بھی ولولہ خیز اور جذبات انگیز ہے۔ اس کے باوجود اسی سیاق میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ صلح کی جانب جھکیں تو تم بھی صلح کے لئے تیار ہونے میں حوصلے کا مظاہرہ کرنا، اور اللہ کے بھروسے پر اس کے لئے باوجود اس کے تیار ہو جانا کہ دشمن ناقابل اعتبار ہے اور اس سے عہد شکنی اور دغا کا خطرہ ہے۔

ان آیات کے اس سیاق کی بنیاد پر ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ صلح کی گنجائش صرف اس وقت ہے جب مسلمانوں کی پوزیشن اتنی کمزور ہو کہ وہ جنگ کرنے کے موقف میں نہ ہوں۔ جن آیات میں صلح کی پیشکش کو قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کا سیاق و سباق ببانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ اس وقت ایسی مجبوری کی صورت حال نہیں ہے، جیسا کہ باب دوم کی دوسری فصل میں لکھا جا چکا ہے۔

پھر فقہی ذخیرے میں صلح عارضی کیوں نظر آتی ہے؟

اگرچہ قرآن کی اس آیت پر غور و تدبر کی نگاہ اس بات کو بے غبار کر دیتی ہے کہ

"صلح کے حقیقی امکانات پائے جانے پر اسلام کے قانون میں صلح کرنا ہی ضروری ہے" مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ہمارے فقہی ذخیرے میں صلح و جنگ کے سلسلے کی جو تفصیلات ملتی ہیں اس سے مجموعی طور پر یہ تأثر نہیں قائم ہوتا کہ "اسلام کے قانون بین الاقوام کا اصل الاصول صلح ہے"۔ ان کے مطالعے سے واضح طور پر یہ تأثر قائم ہوتا ہے کہ صلح صرف عارضی شے ہے۔

اس کا سبب اس زمانے کا تمدن اور بین الاقوامی اور سیاسی صورت حال تھی۔ اور اس زمانے کے لیے یہی شرعی حکم تھا۔ اصل میں اُس زمانے میں دنیا میں کہیں بھی مستقل صلح کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ عملاً ہی نہیں، نظری طور پر بھی ریاستوں کے درمیان ایسی دائمی صلح سیاسی اور اخلاقی فکر کے لیے اجنبی چیز تھی۔ انسانی تمدن کی اس وقت یہی حالت تھی کہ کسی مملکت کے لیے اگر جنگ ممکن ہوتی تھی تو وہ جنگ کر کے دوسری طاقتوں کو زیر کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔

مزید اس وقت کی بین الاقوامی صورت حال کا ایک اور پہلو ایسا تھا کہ اس کی بنا پر علماء امت کا فریضہ بنتا تھا کہ وہ مسلم حکومتوں کو متنبہ کریں کہ صلح بس مجبوراً ہی کی جائے۔ وہ پہلو یہ تھا کہ قدیم زمانے میں ریاستیں واضح طور پر کوئی نہ کوئی مذہب رکھتی تھیں، بلکہ ہر ریاست تعصب کی حد تک مذہبی تصورات پر قائم ہوتی تھی اور اس کا اُس دور میں تصور ہی نہیں تھا کہ کوئی غیر مسلم حکومت اپنے زیر اقتدار علاقوں میں اللہ کے بندوں کو اس کے دین کی طرف بلانے کے لیے امکانات کھلے چھوڑ دے۔ یہ بات اس وقت بالکل ناقابل تصور تھی۔ ہر حکومت کے بارے میں یہ بات طے تھی کہ وہ بزور قوت امت مسلمہ کی ایمانی و اصلاحی دعوت کی راہ میں مزاحم بنے گی اور اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ضرور حائل ہوگی۔ لہٰذا اس وقت صلح کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ امت اس پورے خطے کے بارے میں صبر کر لے اور وہاں کے انسانوں کو اللہ کی

عبادت کی طرف بلانے اوراس کی بندگی کے راستے پر چلانے کی جدوجہد نہ کرنے کو منظور کرلے۔ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے لیے اس صورت حال کو مستقل طور پر تسلیم کرنے کی کسی طرح اجازت نہیں دی جاسکتی۔یہ بات امت مسلمہ کے لیے اپنے فرض منصبی کے خلاف ہے۔اس لیے علماء امت نے اس زمانے میں بجا طور پر یہ خیال ظاہر کیا کہ صلح برائے مصلحت اور عارضی طور پر ہی کی جائے۔

لیکن اگر اس صورت حال سے الگ کر کے اصل مسئلے پر غور کریں تو قرآن کی یہ بات اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ جنگ ''فتنہ'' کی صورت میں اسی باطل کوش طاقت کے خلاف کی جاسکتی ہے جو بزور قوت انبیاء علیہم السلام کی ایمانی واصلاحی دعوت کی راہ میں مزاحم بن رہی ہو، اور اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان حائل ہو رہی ہو۔ورنہ اسلام کے قانون بین الاقوام میں اصل صلح ہی ہے۔

ایک ضروری وضاحت:

اوپر ایک سے زائد جگہ پر قرآن کے یہ الفاظ ''**وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله**'' گذرے ہیں، جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے مسلمانو! مشرکین مکہ (جن سے جنگ کے حالات کے پس منظر میں یہ آیات اتر رہی ہیں، اور جن سے جنگ کرنے کا اس وقت حکم دیا جارہا تھا ان) سے اس مقصد سے جنگ کرو کہ ''فتنہ'' اور مذہبی جبر وایذا رسانیوں کا یہ سلسلہ بند ہو، اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔''فتنہ'' کا جو لفظ یہاں آیا ہے اس کی وضاحت تو اس کتاب میں ہو چکی ہے کہ عربی زبان کی روح سے اس کے معنی ستانے، اور آزمائش میں ڈال کر مجبور کرنے کے ہیں۔جن لوگوں نے اس کو محض شرک کے معنی میں لیا ہے ان کو یہ خیال اس لئے ہوا ہے کہ مسلمانوں کو مشرکین عرب سے، ایک مرتبہ جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جانے کے بعد، اس وقت تک جنگ جاری رکھنے کا حکم تھا جب تک اس سرزمین سے

شرک کی جڑیں نہ اکھیڑ دی جائیں، یعنی عرب کے مشرکین سے اسلام کی جنگ کی غایت اور انتہا یہ قرار دی گئی تھی کہ سرزمین عرب سے شرک کا خاتمہ ہو جائے۔ اس لئے ان حضرات نے اس آیت کے بھی یہ معنی بتلائے کہ مسلمانوں کو مشرکین مکہ سے اس وقت تک جنگ کرنے کا حکم تھا جب تک کہ سرزمین عرب سے شرک ختم نہ ہو جائے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ "فتنہ" کا لفظ صرف 'اکیلے شرک' کے معنی میں نہیں آتا۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "ویکون الدین للہ" جو جنگ کا مقصد بتلایا گیا ہے، یعنی یہ کہ جنگ کرو' تاکہ دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے"، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے جنگ کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کی سب سے اہم اور بنیادی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے غیر مسلموں سے جزیہ لے کر صلح کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اسلامی جہاد کے تصور کی بنیاد یہ خیال ہے کہ سوائے مسلمانوں کے کسی اور قوم کو اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ حکم اصلاً صرف جزیرۃ العرب کے لئے ہے کہ اس میں اسلام کے علاوہ کسی اور کی حکومت کو باقی رکھنا مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں چھوڑا گیا تھا۔ قرآن نے یہ بات بالکل صاف کی تھی کہ مکہ کی حیثیت ایک "ابراہیمی واسماعیلی وقف" کی ہے اور بنی اسماعیل کا یہ پورا ہی علاقہ ابراہیمی دعوت کے مرکز بننے کے لئے خاص کر لیا گیا تھا۔ لہٰذا اس جزیرہ کے اندر سلسلہ قتال کا آخری مقصد اور اس کی غرض وغایت یہ بتائی گئی کہ جزیرۃ العرب تمام تر اللہ کے دین کے تحت آجائے۔

اسی آیت کی گویا وضاحت تھی رسول اللہؐ کی یہ خاص وصیت کہ "مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے"[1]۔ اور یہی آیت آپؐ کے اس فرمان کی بھی بنیاد تھی کہ "لا یبقین دینان فی جزیرۃ العرب" جزیرۃ العرب میں اسلام کے علاوہ کسی

---

[1] صحیح بخاری ۳۰۵۳ و صحیح مسلم ۱۶۳۷

دوسرے دین کی گنجائش نہ رہے۔[1]

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے قرآن کا حکم ہے کہ اگر کوئی قوم شریفانہ صلح کے لئے آمادگی کا اظہار کرے تو اس کو ضرور قبول کیا جائے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم ریاست مسلمانوں کے ساتھ صلح پر آمادہ ہو سکے اور اپنے علاقہ میں پُرامن طور پر اسلام پر عمل کرنے اور اپنی سرزمین پر اللہ کے بندوں کو اللہ کی عبادت اور بندگی کرنے دیتی ہے اور اللہ کے بندوں کو اس کے دین وشریعت کی طرف دعوت دینے اور اس کی راہ پر چلانے کی اس جدوجہد میں (جس جدوجہد کے لیے ہی امت اسلامیہ کو اصلاً وجود بخشا گیا تھا) طاقت کے زور سے حائل نہیں ہوتی، یعنی ظلم اور ''فتنہ'' کی صورت نہیں پائی جاتی، تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے دعوت ونصیحت کے راستے کے امکانات کو استعمال کرنے سے پہلے قتال وجنگ کرنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اس راستے پر خوب محنت کرلیں یہاں تک کہ اللہ کی حجت تمام ہو جائے، اور اللہ اپنی سنت کے مطابق کوئی فیصلہ فرما دے جو حجت تمام ہونے کے صورت میں وہ یقیناً فرمایا کرتا ہے۔

---

[1] موطا ۱۳۸۸

فصل چہارم

جہاد اور امپیریلزم؟

اسلام نے مسلمانوں کو جس جہاد کی تعلیم دی ہے، اس کے جو مقاصد اور ہداف قائم کیے ہیں، اس کے جو شرائط اور قوانین طے کیے ہیں، اور سب سے بڑھ کر اس میں تقرب الی اللہ، خدا پرستی اور متاع دنیا سے بے رغبتی کی جو روح پھونکی ہے، اس کی تفصیلات پر نظر رکھنے والا ہر سلیم الفطرت یہ گواہی دے گا کہ اس جہاد کا قیام انسانی دنیا کی ضرورت اور اللہ کا ایک فضل ہے، جو تاریکی و ظلم اور بدی کے دھوئیں کو چھانٹنے کا ذریعہ اور نوع انسانی کو شقاوت کی کھائیوں سے نکال کر سعادت کی بلندیوں پر پہنچانے کا وسیلہ ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی کسی جماعت کی نیت میں شک کرے۔ یہ شک صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کسی زمانے میں مسلم جنگجو جماعت عملی طور پر ''صحیح جہادی اقدار'' کی حامل نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ بطور اصول و نظریہ کوئی اسلام کی جہادی تعلیم کو انسانی دنیا کی سعادت کا ذریعہ ماننے کو غلط ٹھیرادے۔

ہر سوچنے سمجھنے والا قرآن کی اس بات کی تصدیق کرے گا کہ اگر دنیا جہادی روح وجذبہ رکھنے والے اللہ کے مخلص بندوں سے خالی ہوجائے تو شیطانی اور ہوس کی طاقتیں خدا پرستی کا جنازہ نکال دیں گی۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ
وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا (الحج: ٤٠)

قرآن مزید کہتا ہے کہ پھر زمین کے بگاڑ کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ لہٰذا یہ تو دنیا پر اللہ کا خاص فضل ہے کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اپنے خاص بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ پاکیزگی اختیار کریں اور دنیا کو فساد و ظلم سے بچانے کے لیے اور انسانوں کی ہدایت اور خیر خواہی کے لیے ضرورت ہو تو جہاد کے اصول پر جنگ کریں۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ۔

جدید دور میں ہمیں ایک عجیب اور نسبۃً نئی قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑتا ہے۔ مغرب کے جدید ''دور تہذیب و ترقی'' سے پہلے سلطنتیں ایک دوسرے پر جہانگیریت (Imperializm) اور وسائلِ حیات پر قبضے کے لیے حملے کرتی تھیں، اور یہی ان کی حکومتوں کے مقاصد ہوتے تھے، اور ان کی جنگوں کے بھی۔ ان کا کردار، طرز جنگ اور مفتوح قوموں اور علاقوں کے ساتھ ان کا برتاؤ انہی مقاصد کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ ان حکومتوں نے دنیا میں آشتی کے پیامبر اور ''امن کی فاختہ'' ہونے کے ترانے نہیں گائے تھے۔ اور نہ جمہوریت، حقوق انسانی اور تہذیب کی معلمی کو اپنا مشن بتایا تھا۔ اس لیے ان کا معاملہ سادہ تھا۔ مگر جدید مغربی حکومتیں اپنے جہانگیری اور توسیعی عزائم و کردار میں سکندر و دارا سے بڑھے ہونے کے باوجود، امن و آشتی کا چیر ہن پہن کر سامنے آتی ہیں۔ اور دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کی جنگیں تہذیب و انسانیت کی ترقی کی خاطر، فلاح عام کے مقصد سے، حقوق انسانی کی نگہبانی اور جمہوریت کے فروغ کے لیے ہیں۔ ان مغربی حکومتوں نے قول و عمل میں تضاد کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ الفاظ کی بازی گری اور نہایت مکروہ حقائق پر حسین و دل فریب پردے ڈالنے کا

عجب کلچر قائم کیا۔ لہو پی کر تعلیم مساوات دی۔ ان کی درندگی اور خباثت کا وہ حال ہے جو ابوغریب اور گوانٹانامومیں نظر آیا ہے، مگر اندروں چنگیز سے تاریک تر رکھ کر بھی یہ روشن خیالی کی تبلیغ کرتی ہیں۔ اس نئی صورت حال نے لوگوں کو اس شبہ میں ڈالا ہے کہ اسلام کا دعویٰ بھی کہیں ایسا نہ ہو کہ اصلاح و فلاح کے سارے وظیفے زبان تک محدود ہوں اور عملاً صرف قوت و استبداد مقصد ہو۔

اگرچہ بنیادی طور پر یہ شبہ کرنا ہی اس لیے غلط ہے کہ کسی دعوت یا نظریہ کو جانچنے کا یہ کوئی پیمانہ نہیں ہے کہ اس کے حاملین کے کردار کو کسوٹی بنالیا جائے یا ان کی نیت پر اس لیے شبہ کیا جائے کہ دوسروں نے بھی بظاہر اچھے مقاصد کا نام لے کر بری نیتیں رکھی ہیں۔ نظریات اور دعوتوں کو جانچنے کا ذریعہ صرف دلائل و حقائق کی آزمائش ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اسلام ایک دینی و روحانی دعوت ہے۔ اس کا اصل مقصود کسی قوم کی حکومت یا قوت نہیں ہے، بلکہ ان اخلاقی اقدار اور روحانی حقائق کا فروغ اس کا اصل مطلوب ہے جو اس کی دعوت کی بنیاد ہیں۔ مسلمانوں کی قوت اگر ان اقدار کے فروغ میں معاون ہو تو وہ مطلوب ہے۔ اور اگر وہ ان کے احیاء و فروغ میں رکاوٹ بنے یہ قوت قابل نفرت ہے، اور قرآن کے بیان کے مطابق اللہ کی سنت میں یہ بات طے ہے کہ وہ مسلمانوں کی ایسی قوت کو توڑ کر ان کو ذلت کا مزہ ضرور چکھائے گا۔ اسلام نے جنگ کو "جہاد فی سبیل اللہ" کی روح اور قالب عطا کیا ہے۔ وہ جہاد کرنے والے کو ہر دم یوم جزا کی فکر میں رکھتا ہے، اور اس کو خداوند قہار کے سامنے کھڑے ہونے کی منزل یاد دلاتا رہتا ہے۔ قرآن صاف آگاہ کرتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (القصص ۸۳)

وہ آخرت کا گھر ہم انہی لوگوں کو دیں گے جو زمین میں تکبر کرنا اور بگاڑ مچانا

نہیں چاہتے۔ اور آخرت کی کامیابیاں صرف پرہیزگاروں کیلئے ہیں۔

اس جہاد کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اگر اپنے بندوں کو حکومت واقتدار کا موقع عطا فرمائے تو انہیں یہ بات جان لینی چاہیے کہ یہ ایک امانت ہے، اور اللہ کے یہاں اس کا سوال ہوگا۔ لہذا اگر کوئی اس حکومت واقتدار کو امانت کے طور پر لینے کے بجائے دنیاوی عزت وقوت اور لذت وفرحت کے بیش بہا موقع کے طور پر لے گا تو وہ آخرت کے دن شدید عذاب سے دوچار کیا جائے گا۔ اللہ تعالے نے جب حضرت داؤدؑ کو حکم رانی کے منصب پر فائز فرمایا تو ان کو تاکید فرمائی:

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ۔ (ص، ۲۶)

یعنی اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر حکم راں اور اپنا نائب بنایا ہے۔ لہذا تم لوگوں کے درمیان راستی اور عدل کے ساتھ حکومت کرو۔ اور (خبردار) نفسانی خواہشات کے پیچھے مت پڑ جانا ورنہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گی۔ جو لوگ اپنی خواہشات نفس کے پیچھے پڑ کر اللہ کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ جاتے ہیں ان کو سخت عذاب ملے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے اس دن کو بھلا دیا جب ان کے اعمال کا حساب ہونا تھا۔

یوم جزا وحساب کی فکر ہی بس امانت کی اس روح کی حفاظت اس درجے میں کرسکتی ہے کہ وہ حکم رانی اور قوت واستیلاء کے موقع پر بھی حکم رانوں کو حدود کے اندر رکھ سکے۔ قرآن وسنت نے مسلمانوں کو اسلامی تربیت وتقوی کی جو راہ دکھائی ہے وہ یقیناً اس روح کی حفاظت کی پوری کفیل وضامن ہے۔ یہاں حدیث کے ذخیرے سے اس تعلیم کی بس ایک مثال ذکر کی جاتی ہے۔ ایک صحابی کو حکومت واقتدار کے سلسلے

میں نصیحت کرتے ہوئے اوراس بھاری امانت کی نزاکت سے آگاہ کرتے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا:

یا أباذر! انها أمانة وانها یوم القیامة خزيٌ وندامة الّا من أخذها بحقها وأدّیٰ الذی علیه فیها!

ابوذر! یہ امانت ہے۔ اور قیامت کے دن یہ رسوا کن اور باعث ندامت ہوگی۔ سوائے اس شخص کے لیے جو اس کو حق کے ساتھ لے، اور اپنی ذمہ داریاں ادا کرے۔

جہاد فی سبیل اللہ کو اپنی پاکیزہ روح اور اپنی اخلاقی وروحانی خصوصیات کے ساتھ باقی رکھنے کے لئے اسلام نے جو انتظامات کیے ہیں، پچھلی سطروں میں ان کی صرف ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ اس اہتمام وانتظام کی کوئی جھلک بھی دنیا کے کسی پولیٹکل سائنس اور قومی تربیتی نظام میں نہیں مل سکتی۔ جہاں تک جہاد کے کامل معیاری عملی نمونے کا تعلق ہے وہ اول درجے میں رسول اللہؐ کے زمانے کا جہاد ہے۔ اور دوسرے درجے میں یہ معیاری نمونہ خلفائے راشدین کے اس دور میں ہم کو ملتا ہے جب مسلمانوں کے اجتماعی معاملات ناتربیت یافتہ عناصر کے ہاتھ میں نہیں آئے تھے۔

مستشرقین نے عہد رسول کے جہاد کو عربوں کی کمزور اقتصادی پوزیشن اور خصوصاً بدو عربوں کے قلیل وسائل معیشت کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ انہوں نے اوران کے مشرقی شاگردوں نے ان کا اتباع کرتے ہوئے جہاد کا اصل مقصد مالی خوشحالی کا حصول قرار دیا ہے۔ اگر ناواقفیت نہیں تو ان کی اس روش کو کم سے کم جو نام دیا جاسکتا ہے وہ شپرہ چشمی ہے۔ یہ کیسی مالی مقاصد کے لیے برپا کردہ تحریک ہے جس کے

---

1 صحیح مسلم ۱۸۲۶

صف اول کے قائدین جان کی بازی لگانے میں سب سے آگے ہیں، مگر پھر بھی غریب وفقیر مرتے ہیں۔ آں حضرتؐ کا جب وصال ہوتا ہے تو یہ مکہ کے کس مپرسی کے دن نہیں ہیں، پورا عرب فتح ہو چکا ہے، اور جاں نثاروں کی بھیڑ مال در کنار، گردن ہتھیلی پر رکھے حاضر ہے۔ مدینہ میں مال آتا ہے اور غریبوں میں تقسیم ہوتا ہے، مگر خانہ نبوی میں صرف ایک وقت ہی کھانا پکتا ہے[1]۔ اور وفات کے وقت وہ بھی ایک یہودی سے قرض لے کر ہی ممکن ہو سکا[2]۔

عہد نبوی میں سب سے زیادہ مال غنیمت جنگ ہوازن میں حاصل ہوا تھا۔ ہوازن کے لوگ جوش دشمنی میں اپنا سارا مال ومتاع لے کر میدان میں آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب سارا مال ومتاع داؤ پر لگا ہوگا تو کوئی بھاگنے کو نہیں سوچ سکے گا۔ شکست ہوئی تو یہ عظیم ذخیرہ غنیمت کی صورت میں مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ اگر ان جنگوں میں دنیا طلبی کا کوئی محرک ہوتا تو ضرور یہ دولت مدینہ میں روشنی کرتی اور مسلمانوں کے گھروں میں عیش کا سامان بنتی۔ مگر یہاں تو نظارہ ہی کچھ اور ہے۔ آپؐ سارا مال قریش اور بعض دیگر قبائل کے سرداروں میں بانٹ ڈالتے ہیں۔ جنہوں نے آپؐ سے جنگ کی ان میں ہی مال بانٹ ڈالا!!۔ یہ سب جو کل تک دشمن محاذ کے سردار ہیں بڑے بڑے حصے پاتے ہیں۔ مدینہ کے مخلص وجاں نثار مسلمانوں کو کچھ نہیں مل رہا ہے۔ یہ دیکھ کر انصار کے کچھ نوجوان صبر نہیں کر پاتے، چہ می گوئیاں شروع ہوتی ہیں۔ یہ خبر پا کر رسول اللہؐ نے انصار کو ایک خیمہ میں جمع کرنے کا حکم دیا۔ اور جو گفتگو فرمائی وہ جہاد کی اصل روح، مقاصد اور حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ آپ نے انصار سے فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم ۲۹۷۰

[2] صحیح بخاری ۲۹۱۶

''مجھے کیا خبریں پہنچ رہی ہیں؟ میں نے یہ مال نئے اسلام لانے والوں کو دیا ہے، تا کہ ان کے دل نرم پڑ جائیں۔ انصار کے لوگو! تم گمراہ تھے کیا اللہ نے تم کو میرے ذریعہ ہدایت نہیں دی؟ تمہارا شیرازہ منتشر تھا، کیا میرے ذریعہ اللہ نے تم کو جمع نہیں کیا؟ تم فقیر تھے، اللہ نے میرے ذریعہ تم کو غنی نہیں بنایا؟ (انصار ہر سوال کے جواب میں سراپا نیاز وادب کی تصویر بنے کہتے جاتے: اللہ اور اس کے رسول کے بڑے احسانات ہیں'')۔

پھر آپؐ نے فرمایا: اگر تم اس کے جواب میں مجھ سے یہ کہو تو سچ ہوگا کہ ہم کو تمہاری قوم نے جھٹلایا، ستایا اور نکال دیا، تو ہم ہی تھے جنھوں نے تم کو پناہ دی۔ کسی نے تمہاری مدد نہیں کی، تو ہم ہی نے تمہاری مدد کی اور اپنے گھر رکھا۔ تم ضرورت مند تھے۔ ہم ہی نے تمہارے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا۔ اے انصار! اگر تم ایسا کہو تو حق ہوگا اور میں بھی تمہاری تصدیق کروںگا مگر سنو! میں نے دنیا کا یہ حقیر مال کچھ لوگوں کے دل رکھنے کے لیے دے دیا تو تم کو خلش ہے؟ مگر تم سوچو! کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ یہ سارے لوگ اونٹ بکریاں لے کر جائیں اور تم اللہ کے رسول کو اپنے گھر لے کر جاؤ''۔[1]

آں حضرتؐ کے بعد جو اس کارواں کے صف اوّل کے رہنما تھے ابوبکرؓ و عمرؓ، وہ بھی تادم وفات فقیرانہ بود و باش اختیار کیے رہے۔

یہ بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اسلام کی فتوحات کے زمانے میں عرب کے اندرونی حصوں کے مقابلے میں مفتوحہ علاقے کہیں زیادہ خوش حال تھے۔ اور ہمیشہ یہی حال رہا۔ بغداد، دمشق، اسکندریہ، کوفہ اور بصرہ سب اندرون عرب سے کہیں زیادہ خوش حال شہر تھے۔

شام ایک زرخیز خطہ تھا، حضرت عمرؓ کے عہد میں وہ فتح ہوتا ہے پہلے مسلمان

---

1. صحیح بخاری ۴۳۳۰، و مسند احمد ۱۱۷۳۰

عراق وغیرہ فتح کر چکے تھے، اور ان فتوحات کے دوران مسلمانوں نے مفتوح قوم کے ساتھ ایسا منصفانہ ہمدردانہ اور انسانیت نواز معاملہ کیا تھا کہ شام کے باشندے مسلم فوجوں کا استقبال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو شام میں صرف ان شہروں میں کسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جہاں باقاعدہ رومن فوجوں کی قلعہ بند چھاؤنیاں تھیں۔ عوام بیزنطی حکومت کے ہم مذہب عیسائی تھے، اس کے باوجود وہ مسلم فوجوں کا استقبال کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی دنیا نے ایسا نظارہ نہیں دیکھا ہوگا کہ مفتوح قومیں فاتح طاقت سے اصرار کریں کہ وہ واپس نہ جائے۔ مسلمانوں کو جنگی حکمت عملی کے تحت حمص، دمشق، اور بعلبک کے شہر خالی کرنا پڑے۔ اس وقت ان شہروں کے عیسائی باشندے آکر کھڑے ہوگئے کہ ہم تم کو واپس نہیں جانے دیں گے۔ رومیوں کے ظلم کے لیے ہم کو نہ چھوڑو۔ مسلمانوں نے اپنی مجبوری بتائی، تو انہوں نے مسلمانوں کو ان دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا کہ خدا تم کو دوبارہ لائے۔ اور یہ وعدہ کیا کہ اگر رومن فوجیں یہاں آئیں تو ہم ان سے تمہاری فوج کے ساتھ مل کر لڑیں گے۔ یہودی بھی کھڑے ہوئے اور کہا: ہمارے جیتے جی ہرقل کا حاکم حمص میں داخل نہیں ہوسکتا[1]۔

مختصر یہ کہ جہاد کی بنیاد دنیا سے بے رغبتی آخرت طلبی اور مخلوق خدا سے ہمدردی اور انصاف کے جن اصولوں پر رکھی گئی ہے، اور پھر اسلام کے آئیڈیل قرار دیے گئے دور (قرون اولی) میں اس کا جو نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ اس کی واضح دلیل ہے کہ جہاد دراصل امپیریلزم اور جہانگیریت کو مٹانے کا ہی نام ہے۔ اور اس نے ابتدائی عہد میں دنیا کو دو بڑی امپیریل ظالم طاقتوں کے ظلم واستبداد سے نجات دلانے کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ اور اسی کے نتیجہ میں یہ عظیم خطے فساد وتاریکی اور جاہلیت کے دور سے نکل کر خدا پرستی اور پاکیزہ اخلاقیات کی تہذیب میں داخل ہوئے تھے۔

---

1. فتوح البلدان ۲۵۸

باب سوم

جہاد کی کچھ اہم شرطیں اور قوانین

فصل اول

اطاعت امام

جنگ فی نفسہ خونریزی ہے، یہ تیر وتفنگ اور سیف وسنان کا وہ کھیل ہے جس میں جوش وخروش اور غیظ وغضب سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ ذرا انتشار اور بے احتیاطی اس کو جہاد فی سبیل اللہ سے نکال کر فساد بنا سکتی ہے، اس لیے رسول اللہؐ نے اس سلسلے میں واضح، بے ٹوک اور تاکیدی حکم دیا ہے کہ اگر مسلم حکومت موجود ہو تو جہاد کے سارے فیصلے صرف اسی کے ہاتھ میں ہوں گے۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنا قطعاً جائز نہیں ہو گی۔ اس سلسلے میں قرآن وحدیث میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ اس سلسلے کی صرف ایک حدیث اس جگہ دی جارہی ہے:

من اطاعني فقد اطاع اللّٰه ومن عصاني فقد عصى اللّٰه. ومن يطع الأمير فقد اطاعني ومن يعص الأمير فقد عصاني. وانما الامام جُنّة يقاتل من ورائه ويتقى به.

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جو امیر (جہاد) کا مطیع ہوا وہ میرا مطیع اور جو امیر کا نافرمان وہ میرا نافرمان۔ اور مسلمانوں کا حکمراں ایک سپر کی طرح ہے، جنگ اس کے پیچھے (تابع) رہ کر کی جائے گی اور اس کی آڑ پکڑ کر کی جائے گی۔[1]

---

1. صحیح بخاری ۲۹۵۷ و صحیح مسلم ۱۸۴۱

اطاعت امیر و امام کے اس اصول کا یہ مطلب بھی ہے کہ دوران جنگ اقدامات اور کارروائیوں میں اس کی فرماں برداری اور حکم کی پابندی ضروری ہے۔ مگر اس سے بھی قبل اس کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ یہ بات بھی اس کے حکم اور اجازت پر منحصر ہے کہ کس سے جنگ کی جائے اور کس سے یا کب نہ کی جائے۔ سلف کا فقہی ذخیرہ آپ پڑھ جایئے، آپ کو اس کا کوئی تصور نہیں ملے گا کہ کسی جگہ کے لوگ اپنے حکم رانوں کی اجازت کے خلاف اپنے طور پر جہاد چھیڑ دیں۔ فقہ کی مشہور کتاب المغنی میں ایک مختصر سے جملے میں اس بات کو سمیٹ دیا گیا ہے:

وأمر الجهاد موكول الى الامام[1]

اور جہاد کا معاملہ مسلمانوں کے حکمراں کی رائے پر منحصر ہے۔

موجودہ زمانے میں اس اصول کی رہنمائی:

اس لیے یہ بات بالکل قطعی ہے کہ جہاں مسلمانوں کی کوئی حکومت موجود ہے وہاں اس کے جھنڈے تلے ہی جہاد ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس حکومت کے تحت ریاست کے شہری ہیں وہ اس کی طرف سے ماموروں مجاز ہوئے بغیر جنگ نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا ملک تو دوسرے ملکوں سے صلح اور معاہدے کیے ہوئے ہو اور یہ اس کے معاہدے کو توڑتے ہوئے کسی دوسرے ملک کے خلاف جنگ چھیڑیں۔ ہاں یہ اگر اپنے ملکوں کی شہریت چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں اور کسی منظم ریاست کے شہری نہ رہیں، یا اپنی الگ ریاست بنالیں تو ان کو اپنے بارے میں فیصلے کرنے کی آزادی ہوگی۔ ایسے مسلمانوں کی ایک مثال عہد نبوی میں پائی گئی تھی۔ یہ ایک گروہ تھا جس کے قائد حضرت ابو بصیرؓ تھے، جن کا واقعہ آگے آ رہا ہے۔

---

[1] المغنی ۸/۳۴۵

حکومت کے معاہدوں کی پابندی تمام شہریوں پر لازمی ہے:

لیکن جب تک وہ کسی مسلم ریاست کے شہری ہیں اور اس میں قیام پذیر ہیں، یا اس کے شہری کی حیثیت سے ہی کسی دوسرے ملک میں داخل ہوئے ہیں وہ امن یا جنگ کے کسی فیصلے کے سلسلے میں خود مختار نہیں۔ ان کو لازماً ہر حال میں اپنے ملکوں کی حکومتوں کے معاہدوں کی پابندی کرنی ہوگی۔ یہ اللہ ورسول کا قطعی حکم ہے، کسی کے اس کو نظر انداز کر دینے سے اس کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

حمیت نہیں جہالت:

لہٰذا اگر کوئی پر جوش مسلم نوجوان یا کوئی گروہ کسی ایسے غیر مسلم ملک کے شہریوں کے جان ومال کے لئے خطرہ بنتا ہے جس سے اس کے ملک کے سفارتی تعلقات اور معاہدۂ امن ہے تو اس کا یہ فعل یقیناً غیر شرعی ہوگا، چاہے اس کو کتنی ہی اچھی نیت سے کیا گیا ہو۔

ماضی قریب میں اہانت رسول کی بدبختانہ اور قابل لعنت حرکتوں کے بعد جن طالع آزما لوگوں نے کسی کے قتل کی اپیل کی، یا بعض مخلص مسلمانوں نے کسی جرأت مند مسلم نوجوان کی اس طرح کی حرکتوں کی تحسین کی، انہوں نے شرعی اصولوں کو نظر انداز کیا۔ جب تک کسی ملک سے ہماری حکومت کا معاہدۂ امن ہے اس وقت تک اس کے کسی شہری کو نقصان پہنچانا ہمارے لئے کسی طرح جائز نہیں۔ چاہے ہم کو اس ملک سے کیسی ہی شکایت ہو۔ اس کا راستہ صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ حکومتی سطح پر معاہدے کے خاتمے کا اعلان کر دیا جائے۔

اسی طرح جو لوگ کسی غیر مسلم ملک کے پیدائشی شہری ہیں یا وہاں کی شہریت انہوں نے لے لی ہے، انہوں نے اپنے لئے اُس ریاست کا حصہ بننے کا معاہدہ کیا

ہے۔ اسی طرح اس کے شہریوں کے ساتھ ہم وطنی اختیار کر کے ان سب کو ایک عام امان دینے اور ہر ایک کے جان و مال کے تحفظ کا اقرار و عہد کیا ہے۔ اب اگر وہ غیر مسلم ملک کسی مسلم ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ اُس کو اِس ظلم سے باز رکھنے کی اپنے وطنی و شہری حق کی بنا پر ہر کوشش تو ضرور کریں گے، اور یہ ان کا ایمانی فریضہ ہوگا۔ لیکن مسلح مقابلہ نہیں کر سکتے۔ الا یہ کہ وہ اس کی شہریت ترک کر دیں اور یہ معاہدہ ختم کر دینے کا اعلان کر دیں۔ عام شہریوں کو تو جنگ کی حالت میں بھی نقصان پہنچانا اسلام نے حرام قرار دیا ہے، ''ہم وطنی'' کے مضبوط معاہدے کے بعد تو اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

نوجوان خون مسلم کے بے دردی سے بہائے جانے پر مضطرب اور مشتعل ہیں اور قربانیوں کے لئے تیار ہو کر اٹھ کھڑا ہونا چاہتے ہیں، کیا شبہ ان کا یہ جذبہ لائق صد رشک، اور اسی جذبے سے امید بندھتی ہے کہ اگر اس کو صحیح رخ دے کر شرعی اصولوں کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ امت کی تعمیر نو اور اس کو قعر مذلت سے نکال سکے گا، مگر اللہ نے ہم کو جس شریعت کا پابند بنایا ہے اس کا مقصد اسلام کی عزت اور دنیا میں خیر کا فروغ ہی ہے، ہم اس کی خلاف ورزی کر کے اپنے مقصد کو نہ خود پا سکتے ہیں اور نہ اللہ کی مدد حاصل کرنے کے قابل بن سکتے ہیں۔ اور اس شریعت نے ہم پر معاہدوں کی پابندی لازم کی ہے۔

جہادی تنظیموں کا مسئلہ؟؟

گذشتہ دو دہائیوں سے یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصے کے دوران ہمارے بہت سے لوگوں سے ''اسلامی جہاد'' کی عملی تطبیق میں بڑی چوکیں ہوئی ہیں، اس وقت تو ماحول کے مطالبے اور سازگاری کے تحت ان غلطیوں کی طرف دھیان نہیں گیا، مگر بعد میں ان غلطیوں کے نتائج دیکھ کر اور حالات کے بعض اندرونی پہلوؤں کے آخر کار

کھل جانے کے بعد اب ان پر تنبہ ہو رہا ہے۔ ان میں سے ہی ایک بڑی چوک تھی مسلم ملکوں کی حکومتوں کے ہوتے ہوئے آزاد جہادی تنظیموں اور گروپوں کا قیام۔ یہ ایک طویل تاریخ پر بکھری ہوئی کہانی ہے[1]۔

اس وقت جن بین الاقوامی طاقتوں کو ان جہادی تنظیموں سے مدد ملتی تھی ان کو تو اس کی کوئی فکر ہونی ہی نہیں تھی کہ کل جب افغانستان، بوسنیا، الجزائر وغیرہ میں مطلوبہ اہداف حاصل ہو جائیں گے، یا نہیں ہوں گے اور مہمیں ختم ہوں گی، تو کیسے بھیانک مسائل سامنے آئیں گے۔ اس لئے کہ جو کچھ ہونا تھا اس کا سامنا ایشیا کے مسلم ملکوں یا زیادہ سے زیادہ ان کے پڑوسیوں کو کرنا تھا۔

مگر افسوس کہ یہ فکر مسلم ممالک کی حکومتوں کو اور ان کے اہل حل وعقد کو بھی نہیں ہوئی، اور ان جہادی سرگرمیوں کو مصر وشام، یمن وسعودی عرب اور پاکستان وغیرہ میں جن دینی نمائندوں کی سرپرستی اور سرگرم تعاون حاصل تھا انہوں نے بھی نہ مستقبل کی فکر فرمائی اور نہ اس کے بارے میں سوچا کہ ایک منظّم مسلم ملک میں خطرناک ومفسد بین الاقوامی ایجنسیوں کے تعاون ہی نہیں، بلکہ عمل دخل سے جو آزاد اور بڑی حد تک خود مختار جہادی تنظیمیں اور تحریکیں قائم ہو رہی ہیں، ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جنگ کی کمان مختلف خود مختار ہاتھوں میں دینا عقلاً وشرعاً درست ہے؟

زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں، اس مسئلہ کی نزاکت ہر وہ دردمند اور صاحب عقل سمجھ سکتا ہے جو اس کھلی حقیقت سے بے خبر نہ ہو کہ مسلم اور غیر مسلم ملکوں کی حکومتیں

---

[1] اس موضوع پر ایک فرنچ رائٹر Gilles Kepel کی ترتیب دی ہوئی ایک بڑی ضخیم اور جامع کتاب آئی ہے، "JIHAD" کے نام سے اس کا انگریزی ترجمہ موجود ہے، کتاب اس قابل ہے کہ ہر اس شخص کی نظر سے گذرے جو موجودہ دور میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کچھ سوچتا ہو، کاش کوئی اردو میں ترجمہ کر دیتا۔

عموماً اور اکثر و بیشتر جس قسم کے عناصر کے ہاتھ میں رہتی ہیں، اور حکومتی ایجنسیاں جس قسم، جس قماش اور دینی و ایمانی اعتبار سے جیسی سیرت و نظریات کے حامل لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہیں کیا ان لوگوں کی زیر نگرانی اور تعاون سے قائم تنظیمیں وہ مقاصد حاصل کر سکتی ہیں جو جہاد کے مقاصد ہیں؟

افسوس ہماری نادانی اس حد تک پہونچی ہوئی ہے کہ ہم گرگ سے گلہ بانی کی توقع کر لیتے ہیں۔

انبیاءؑ کی ایک اہم سنت:

مسلمانوں نے جب تک ایک باقاعدہ اور منظم حکومت قائم نہیں کر لی اس وقت تک رسول اللہ کو جہاد کا حکم نہیں دیا گیا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد مسلمانوں کو جب جنگ کا حکم دیا گیا تو اس کو پورے طور پر ایک نظام امارت اور حکمراں کے تابع رکھا گیا۔ پچھلے انبیاء کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ انہوں نے باقاعدہ جنگ اسی وقت کی جب ایک منظم امارت قائم ہو گئی۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں اور اس کے بعد کی تاریخ پر غور کیجئے یہی اصول کارفرما نظر آئے گا۔

حضرت موسیٰ و ہارون کے زمانے میں مصر کی حکومت نے بنی اسرائیل کو کس قدر ظلم کا نشانہ بنایا، وہاں جنگ نہیں کی گئی۔ پھر انہوں نے ہجرت کی، اور اس طرح بنی اسرائیل کی ایک آزاد اجتماعیت اور امارت قائم ہوئی پھر ان کو اپنے خطے میں جہاد کا حکم ہوا۔

اس کے بعد جب بنی اسرائیل پر شدید زوال آیا، اور وہ دوسروں کے محکوم و مقہور ہوئے تو ان کو اپنے علاقوں سے تتر بتر ہو کر اس طرح بھاگنا پڑا تھا کہ ان کی اجتماعیت ہی فنا ہو گئی تھی، ان کے بچے کہیں رہ گئے اور وہ کہیں اور بھاگے، قرآن بتاتا ہے کہ اس وقت قوم کے کچھ لیڈر اپنے وقت کے نبی (حضرت سموئیلؑ) کے پاس اپنی یہ رائے پیش کرنے کے لیے آئے کہ دشمنوں کے خلاف ہم کو باقاعدہ جنگ کرنی

چاہئے۔اس وقت انہوں نے اپنے نبی سے یہ درخواست نہیں کی کہ لوگوں کو جمع کر کے یا فوج بنا کر بس جنگ شروع کردی جائے آپ جہاد کے انتظامات کا حکم فرمائیں۔اس کے بجائے انہوں نے وقت کے نبی سے جنگ کے انتظام کے لیے یہی درخواست کی تھی کہ ہمارا ایک باقاعدہ ''حاکم'' (ملِک) مقرر فرمادیں جس کے زیر حکومت ہم اللہ کے راستہ میں قتال کریں، اور اپنے شہروں کو آزاد کرائیں۔

پھر آگے قران نے قصہ نقل کیا ہے کہ وہ نبی ایسا کرنے کو ابتداء تیار نہیں ہوئے۔.........کوئی حیرت کرسکتا ہے کہ اللہ کا نبی اور ایک ایسی صورتحال میں جس میں وقت کے مسلمان اپنے علاقوں سے بھگائے جاچکے ہیں، ان کے بچے کہیں رہ گئے اور وہ کہیں اور بھاگے، اُن مسلمانوں کے قبلے تک پر بدترین قسم کے ظالم کافروں کا قبضہ ہوچکا ہے، اور مسلمانوں کے لیڈر اس نبی کے پاس یہ درخواست لے کر آئے ہیں کہ حضور جہاد کے انتظامات فرمائیے ہم خدام تعاون کو حاضر ہیں، اور وہ (نبی علیہ الصلاۃ والسلام) کچھ تذبذب کرتا ہے؟ جی ہاں قرآن بتلاتا ہے کہ وہ نبی تذبذب کرتا ہے۔اس لیے کہ اس کو اپنی قوم پہ اعتماد نہیں تھا کہ جب وقت آئے گا تو وہ ثابت قدم رہیں گے اور پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔مگر جب ان قومی زعماء نے اعتماد دلایا کہ ہم ضرور جنگ کریں گے، ہمارے گھر اجاڑے گئے، بچے کہیں، اور ہم کہیں، اب مزید کس چیز کا انتظار ہے جس کے بعد ہم جہاد کو کھڑے ہوں؟ تو اللہ کے اس نبی نے جنگ کے ضروری انتظام کے طور پر ایک ''بادشاہ'' مقرر کیا اور اس بادشاہ کی حکومت کے تحت ہی جہاد کیا گیا، اور اللہ کی مدد سے فتح بھی ہوئی[1]۔

بغیر حکومت کے جہاد کی صورت:

اہل علم کے نزدیک اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کسی مسلم ملک پر کوئی غیر مسلم

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۴۶ تا ۲۵۲

طاقت ظلماً حملہ آور ہو اور حکومت کو بے دخل کردے تو عام مسلمان اس کے خلاف جہاد کے مجاز نہیں ہوں گے۔ آج کل کے زمانے میں اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ کوئی بڑی ہوائی طاقت بم باری کر کے مسلم ممالک کی حکومت اور اس کے اساطین کو ہلاک کردے اور اعلانِ قبضہ کر دے۔ جیسے ہی مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت ختم ہوگی سارے لوگوں پر ہتھیار ڈال دینا ضروری ہو جائے گا۔ شریعت اسلام کی حفاظت کے لیے ہے، اس کو ضائع کرنے کے لیے نہیں۔

علماء کہتے ہیں کہ:

فان عدم الامام لم یؤخر الجهاد لان مصلحته تفوت بتا خیره[1]

اگر کسی جگہ حکومت ہی نہ ہو تو مسلمان جہاد کو مؤخر نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ دیر کرنے سے جہاد کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

یعنی اگر کوئی ظالم طاقت مسلمانوں کے ملک پر ظالمانہ حملہ کرے، اور مسلمانوں کی حکومت تحلیل ہو جائے تو چوں کہ کوئی مسلم حکومت نہیں ہے اسی لئے عام مسلمان اپنے جان و مال اور ملک و وطن کا دفاع کریں گے، اور کب تک وہ مزاحمت کریں گے اس کا فیصلہ حالات پر اور ان کے اہل حل وعقد پر ہوگا۔

جہاں کوئی منظم حکومت نہ ہو وہاں کے افراد فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔ اس کی ایک نظیر ہم کو عہد رسالت میں ملتی ہے۔ کچھ مجبور و مظلوم مسلمان اہل مکہ کے مظالم کی زنجیروں میں قید تھے، نہ بھاگنے کا موقع تھا نہ عافیت کے ساتھ مکہ میں رہنے کا۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب مکے والوں نے رسول اللہؐ سے یہ معاہدہ لے لیا تھا کہ مکے سے کوئی مسلمان اگر مدینہ جائے گا تو واپس کرنا ضروری ہوگا۔ ابو بصیر نامی

---

[1] المغنی ۸/ ۳۵۳

ایک مظلوم مسلمان مدینہ بھاگ کر آیا، پیچھے سے اس کو واپس لینے مکے کے دو آدمی پہنچے۔ معاملہ معاہدے کا تھا، آپؐ نے دل پر پتھر رکھ کر ان کو واپس کر دیا۔ راستے میں ابو بصیر نے ان میں سے ایک کی تلوار لے کر اس کا سر قلم کر دیا۔ دوسرے نے بھاگنے میں عافیت جانی، اب ابو بصیر اور ایسے ہی کچھ اور لوگوں نے بھاگ کر ایک غیر آباد علاقے میں (جو مدینہ کی مسلم ریاست کی قلم رو سے باہر تھا) آ کر ڈیرہ ڈال لیا، حضرت ابو بصیرؓ ان کے لیڈر تھے۔ ان لوگوں نے مکے کے تجارتی قافلوں پر حملے شروع کر دیے۔ (بخاری ۲۷۳۱) لیکن چوں کہ یہ مدینہ کی ریاست سے باہر رہتے تھے اس لئے سیاسی طور پر رسول اللہؐ اور مدینہ کی ریاست پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں مانی جا سکتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کارروائیوں سے منع نہیں کیا، حالانکہ بحیثیت حاکم نہ سہی بحیثیت نبی و رسول آپ کی ذمہ داری تھی کہ ہر غلط کام سے اپنے اوپر ایمان لانے والوں کو روکیں، اور اس کے غیر شرعی ہونے کی وضاحت فرمائیں۔

بعض ان لوگوں نے جن کو افغانستان اور عراق میں امریکی حملوں کے خلاف مجاہدین کی مزاحمت کو غیر شرعی قرار دینا تھا یہ کہا ہے کہ حکومت کے بغیر قتال و جنگ قطعاً غیر اسلامی تصور ہے۔ ان میں ایک صاحب نے تو بہ بانگ دہل دہشت گردی کی تعریف ہی یہ فرما دی ہے کہ بنا حکومت کے ہتھیار اٹھانا دہشت گردی ہے۔ اور یہ بھی دعویٰ فرما دیا ہے کہ میں دنیا میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے دہشت گردی کی معین تعریف کی ہے۔ ان لوگوں کے خلاف یہ واقعہ اپنی اسی حیثیت سے دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بصیرؓ کو اس سے منع نہیں کیا۔ حال آں کہ بطور حاکم نہ سہی، بطور رسول تو آپؐ ان کے عمل کی غلطی کو واضح کرنے کے ذمے دار تھے ہی۔

فصل دوم

معاہدات کی پابندی

وفائے عہد (یعنی جو معاہدہ کیا جائے پورا کیا جائے) اسلامی اخلاقیات کی ایک نہایت بنیادی تعلیم ہے، قرآن مجید میں اس کی بار بار تاکید کی گئی ہے ایک جگہ ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۳۴)	اور پورا کرو معاہدہ کو۔ (اللہ کے یہاں) معاہدے کے بارے میں ضرور سوال ہوگا۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لا ایمان لمن لا امانة له، ولا دین لمن لا عهد له[1]	اس کا ایمان نہیں جو امانت دار نہیں، اور اس کا دین نہیں جو معاہدے توڑے۔

کتاب وسنت کی تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ ورسول کی نظر میں سب سے زیادہ قابل احترام عہد وہ سیاسی عہد ہوتا ہے جو دو مملکتوں کے درمیان یا فرد وحکومت کے درمیان امن وجنگ اور جان ومال کی سلامتی سے متعلق ہوتا ہے۔ اسلام کا قانون جنگ ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا قانون ہے، اس میں وفائے عہد کی صرف تعلیم

---

1. صحیح ابن حبان ۲۲۲/۱، مسند احمد ۱۶۸، صحیح ابن خزیمہ ۵۱/۴

وتلقین ہی نہیں، بلکہ بدعہدی پر جہنم اور اللہ کے عذاب کی وعیدیں آئی ہیں۔ رسول اللہؐ نے اسی طرح کے معاہدے کا پاس نہ کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا:

اذا جمع الله الاولین والآخرین یوم القیامة یرفع لکل غادر لواء، فیقال هذه غدرة فلان بن فلان [1]

قیامت کے دن جب ساری انسانیت اللہ کے یہاں جمع ہوگی، اس دن ہر عہد توڑنے والے کے ہاتھ میں غداری کا جھنڈا دے دیا جائے گا، اس پہ لکھا ہوگا یہ فلاں بن فلاں غدار ہے

مسلمانوں کا مقصد صرف فتحیابی نہیں ہے، وہ جن اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے علم بردار ہیں اگر وہی اصول جنگ کی اندھیر نگری میں کھو جائیں تو پھر مسلمانوں کے پاس بچے گا کیا؟ پھر دعوت دین کا بیج کس زمین میں بویا جائے گا؟ اور اللہ کی حجت کہاں قائم ہوگی؟ جس کی جنگ کا اصل مقصد انسانوں کی ہدایت اور اسلام کی نشر واشاعت ہے، اور جو نہایت سوز وہمدردی کے ساتھ بنی نوع انسان کو اللہ کے ابدی عذاب سے بچانے اور دنیا وآخرت کی سعادتوں سے ان کو ہم کنار کرنے کے لیے اپنی جان اور مال کو ستا کیے ہوئے ہے، وہ کسی قیمت پر یہ برداشت نہیں کرے گا کہ اس کی دعوت داغ دار ہو یا لوگ اس کو اخلاقی اصولوں سے عاری سمجھیں۔ وہ ہر قیمت پر دنیا کے سامنے اپنی اخلاقی برتری کا ثبوت پیش کرے گا۔ ہاں جس کا مقصد قومی فتح یابیاں ہوں یا جو نخوت قومی کے لئے لڑتا ہو وہ شوق سے جو چاہے کرے، اس کو ہر کردنی وناکردنی زیبا۔ مگر جو اللہ کے کلمہ کے لئے لڑتا ہے، اس کے دین کے لیے جھکتا اور اٹھتا ہے، اور اس کا مقصد اس کی بندگی وخود سپردگی ہے وہ اپنے آپ کو عین میدان کارزار میں بھی پابندِ حکم پاتا ہے۔ اور یہی جہاد فی سبیل اللہ کا حسن ہے۔

---

[1] صحیح بخاری ۶۱۷۷ و صحیح مسلم ۱۷۳۵

اس لئے مسلمانوں کے لئے یہ طے ہے کہ بدعہدی میں چاہے فائدہ ہو اور وفائے عہد میں چاہے نقصان، ان کو معاہدے کی پابندی ہی کرنی ہے۔

دین عہد و وفا، نہ کہ غدر و دغا:

قرآن مجید میں جنگ کے حالات کے لیے جو نصیحتیں اور تعلیمات آئی ہیں ان میں ہم کو عہد کی پابندی کی تاکیدی تعلیم بار بار ملتی ہے۔ اسلام کی نظر میں معاہدے کا کیا مقام ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وہ مشرکینِ مکہ جن سے بڑا نہ اسلام کا کوئی مخالف ہوا ہوگا اور نہ رسول اللہؐ اور صحابۂ کرام کو کسی کے ہاتھوں اتنا نقصان پہنچا ہوگا، ان کے بارے میں بھی ہدایت ہے کہ ان کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی بہر حال پوری پوری پابندی کی جائے۔ سورۂ توبہ جو مشرکین عرب پر اللہ کے شدید غضب کا اعلان کرتی اور مسلمانوں کے یہ حکم دیتی ہے کہ ان کو الٹی میٹم دے دیا جائے کہ ان کو بس چار مہینے کی مہلت ہے، یہ یا تو اسلام قبول کرلیں، ورنہ جزیرۃ العرب کی خاص پوزیشن یہ ہے کہ اس میں ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان چار مہینوں کے بعد ان میں سے جو جہاں ملے مارا جائے، پکڑا جائے، اور ان کے شکار کے لیے جگہ جگہ گھات لگا کر بیٹھا جائے:

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ.

(التوبہ: ۵)

یہ سورت مشرکین عرب کے سلسلے میں غضبناک اعلان جنگ ہے، اس میں یہ بھی کہا گیا کہ:

ان کی سابقہ سراپا ظلم وعہد شکنی کی تاریخ کے بعد تمہارے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ ان کے ساتھ کوئی نرمی کا برتاؤ کرو، یا آئندہ ان سے معاہدے کے بارے میں سوچو۔ اب نرمی کی ساری گنجائشیں ختم، تم کو حکم ہے کہ اب تمہاری

تلوار چلے اور رشتہ یا تعلق نام کی کوئی چیز اس کو روکنے والی نہ ہونی چاہیے۔

مگر اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ:

ہاں! معاہدہ اگر روکے تو تھم جانا۔

مشرکین کے شرک کے باوجود اور سراپا ظلم ودشمنی کی تاریخ کے باوجود معاہدے کی پابندی ضروری ہے۔ جن سے تمہارا معاہدہ ہے اگر وہ خود عہد شکنی نہ کریں تو تم ٹھیک ٹھیک معاہدے کی پابندی کرو۔ یہی عین تقویٰ ہے۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِندَ اللّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلاَّ الَّذِيْنَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُواْ لَكُمْ فَاسْتَقِيمُواْ لَهُمْ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. (التوبہ: ۷)

مشرکین کا اب اللہ اور رسول کے ساتھ کوئی معاہدہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہاں جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا مسجد حرام کے پاس، وہ اگر معاہدے کی پابندی کریں تو تم بھی کرو۔ اللہ تقوے والوں کو پسند کرتا ہے۔

آیات کا اصل مضمون مشرکین کے ساتھ سختی برتنے کا حکم ہے، یہیں سے بات شروع ہوئی کہ ان کے ساتھ اب کسی معاہدے کا کیا امکان؟ ابھی یہ بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں آگے مزید یہ کہنا تھا کہ ان مشرکین کے ساتھ اب معاہدہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ان کے دلوں میں دشمنی کی آگ دھک رہی ہے۔ بس چلے تو یہ تم پر بری طرح ٹوٹ پڑیں، نہ رشتہ ان کو روکے اور نہ معاہدہ۔ یہ بددین، دنیا پرست، مکار، فاسق اور ظلم وجارحیت کے مرتکب رہے ہیں۔

كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لاَ يَرْقُبُواْ فِيكُمْ إِلاًّ وَلاَ ذِمَّةً يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَى قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ. اشْتَرَوْاْ بِآيَاتِ اللّهِ ثَمَناً قَلِيلاً فَصَدُّواْ عَن سَبِيلِهِ إِنَّهُمْ سَاء مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ. لاَ يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلاًّ وَلاَ ذِمَّةً وَأُوْلَـئِكَ

هُمُ الْمُعْتَدُوْن (آیت:۸،۹،۱۰)۔

ابھی آگے یہ سب کچھ کہنا تھا، اور مسلمانوں کو برافروختہ کرکے ان سے جنگ کروانی تھی، مگر ایسے موقعے پر اور ایسے دشمنوں کے بارے میں اور ایسے غضبناک کلام کے وقت بھی...... بیچ میں ہی بات روک کر تنبیہ کی گئی کہ "ہاں جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا مسجد حرام کے پاس، وہ اگر معاہدے کی پابندی کریں تو تم بھی کرو۔ اللہ تقوے والوں کو پسند کرتا ہے" اس میں اشارہ ہے کہ اگر معاہدے کی پابندی میں کوتاہی ہوئی تو نہ تم تقوے والے رہوگے اور نہ اللہ کی محبت کے سزاوار۔

ہم گواہی دیتے ہیں کہ یہ شاندار ہدایات برحق ہیں۔ اللہ اکبر۔

وتمت کلمة ربك صدقاً وعدلا.

ربنا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشاھدین

ہم کو اس تعلیم کا جو عملی نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ملتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ کے موقع پر بھی اسلام کی نظر میں معاہدے کی کیا قیمت ہے۔ جنگ بدر میں مکہ والوں کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زائد تھی، ایسے میں ایک ایک آدمی کی اہمیت بہت تھی، حضرت حذیفہ بن الیمان اور ان کے والد حسیل مسلمانوں کے لشکر میں جا ملنے کے ارادے سے آرہے تھے کہ مشرکین کے ہتھے چڑھ گئے، انہوں نے ان کو یہ عہد لے کر ہی چھوڑا کہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شرکت نہیں کریں گے۔ یہ دونوں حضرات چھوٹ کر بدر کے میدان میں آں حضرتؐ سے ملے اور پورا واقعہ سنایا، آپؐ نے فرمایا:

انصرفا، نفی لھم بعھدھم ونستعین الله علیھم۔

واپس جاؤ، ہم عہد کی پابندی کریں گے اور اللہ سے مدد مانگیں گے۔

۱؎ صحیح مسلم ۱۷۸۷

اگر مسلمانوں کی حکومت کا کسی غیر مسلم حکومت سے معاہدہ ہو، اور ایسے آثار نظر آنے لگیں کہ فریق ثانی اچانک دھوکہ دے کر حملہ کر دے گا، تب بھی مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ صرف اندیشے پر کارروائی نہ کر دیں، بلکہ حکم ہے کہ معاہدہ کے خاتمے کا اعلان اس طرح کرو کہ تم نے اس وقت تک ان کے خلاف حملے کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ کی ہو۔ قرآن کی آیت "وامّا تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علیٰ سواء" میں اسی کا حکم ہے۔

اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ سنیے: حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں روم سے جھڑپیں چلا کرتی تھی، ایک مرتبہ ان کا حکومت روم سے ایک خاص مدت تک کا ناجنگ معاہدہ تھا، انہوں نے معاہدے کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس حساب سے فوجوں کو لے کر سرحد کی جانب پیش قدمی شروع کر دی کہ جیسے ہی مدت ختم ہوگی اچانک حملہ کر دیں گے، دشمن تیار بھی نہیں ہوگا۔ ابھی پیش قدمی جاری تھی، اور فوجیں تیز گامی سے منزلیں طے کر رہی تھیں، کہ ایک گھوڑ سوار غبار اڑاتا "اللہ اکبر، اللہ اکبر، وفاء لاغدر" (وفاداری کرو غداری نہیں) کی آواز لگاتا چلا آرہا ہے۔ دیکھا تو یہ صحابی رسول حضرت عمرو بن عنبسہؓ تھے۔ انہوں نے آکر حضرت معاویہ سے کہا: غضب ہے غضب! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ جس کا کسی کے ساتھ معاہدہ ہو وہ اس میں کوئی تغیر و تبدیلی نہ کرے (اور کسی قسم کا اقدام نہ کرے "فلا یحل عقدۃ ولا یشدھا")، یہاں تک کہ اس کی مدت گذر جائے۔ حضرت امیرؓ نے یہ حدیث سنی اور فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ رضی اللہ عنہم[1]۔

دین میں بین الاقوامی معاہدات کا مقام:

اسلامی تعلیمات میں دینی اخوت اور دین کے سلسلے میں مسلمان بھائیوں کی

---

[1] مسند احمد حدیث نمبر ۱۷۰۵۵، سنن ترمذی حدیث نمبر ۱۵۹۰

مدد کا جو غیر معمولی مقام ہے وہ ہر اس شخص کو معلوم ہے جس نے کچھ بھی دینی تعلیم یا دینی ماحول سے استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بڑی مہمیز کرنے والی آیت اس مضمون کے شروع میں گذر چکی ہے، جس میں آزادی اور جنگ کی استطاعت رکھنے والے مسلمانوں میں حمیت و غیرت پیدا کرنے کے لیے مکہ کے دبے کچلے مسلمانوں کی آہ وزاریوں اور عورتوں اور بچوں کے نالہ وشیون کا حوالہ دے کر کہا گیا کہ وہ بے چارے رات دن دعا کر رہے ہیں کہ اللہ کسی نجات دہندہ کو بھیجے جو انہیں ان ظالموں کے چنگل سے آزاد کرائے۔ کیا یہ دل فگار نالے بھی تم میں قتال کے لیے جوش پیدا نہیں کرتے؟ آؤ اب ان کی مدد کے لیے جہاد کرو۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا (النساء۔۷۵)

مظلوم مسلمانوں کی مدد قرآن کی نظر میں اتنی ضروری ہے۔ اس کے باوجود قرآن صاف کہتا ہے کہ اگر کسی ایسی غیر مسلم ریاست میں جس کے ساتھ تمہاری ریاست کا معاہدہ ہے کچھ مسلمان بھائیوں پر ظلم ہو رہا ہے، اور ان کا دین آزمائش میں ہے، وہ تم کو مدد کے لئے بلاتے ہیں تو تم ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ تمہیں معاہدے کا پاس رکھنا ہے۔ مدد کرنی ہے تو پہلے معاہدہ ختم کرو۔

آیت مع ترجمے کے ذیل میں ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ (الانفال۔۷۲)

جو لوگ ایمان لائے مگر ہجرت کر کے (تمہاری ریاست کے شہری نہیں بنے) تو تم پر ان کی "ولایت" (حمایت و مدد) والے رشتے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ الا یہ کہ وہ ہجرت کر کے تمہارے ملک آ جائیں، ہاں اگر وہ دین کے سلسلے میں (ظلم کے شکار ہوں اور) تم کو مدد کے لئے پکاریں تو تم پر مدد کرنے کی ذمہ داری ہے۔ مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو۔ اور اللہ دیکھ رہا ہے جو تم کر رہے ہو۔

یہ ہے اسلامی اصولوں کے ساتھ جہاد۔

جہاد کے بارے میں ہمیں کسی قسم کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جہادی تعلیم اسلام کا وہ باب ہے جو اس کی حقانیت کی روشن دلیلوں میں سے ہے۔ ایک طرف انسانیت کی ایک شدید ضرورت کو پورا کرنے کے مقصد کی بلندی ہے۔ دوسری طرف اللہ کی رضا کی نیت کی پاکیزگی ہے۔ اور تیسری طرف مجاہدانہ اخلاقیات کا حسنِ جہاں آرا و جہاں زیب۔ نورٌ علی نور۔

یہ جہاد دنیا کو زیبائش و آرائش بخشنے کے لیے ہی فرض کیا گیا ہے۔ اس کو کیا نسبت اس فساد و فتنہ اور غدر و دغا سے جس پر مغربی تہذیب کے زیر سایہ موجودہ بین الاقوامی سیاست کا نظام قائم ہے۔ ایک ریاست دوسری ریاست سے معاہدوں میں ہاتھ بھی ڈالتی ہے، سفارتی تعلقات بھی قائم کرتی ہے اور پھر اپنی ایجنسیوں کے ذریعہ قتل و خونریزی کے واقعات بھی کراتی ہے۔ انسانیت کو مغربی تہذیب نے جو الم ناک "تحفے" دیے ہیں ان میں یہ خفیہ ایجنسیوں کا نظام بھی ہے۔

مگر اس وقت کچھ ناسمجھ مسلم نوجوانوں کو جہاد کے نام پر معاہدات کی پامالی کا سبق دینے لگے ہیں، یہ ان میں ایسا اشتعال پیدا کرتے ہیں کہ شریعت تو ٹوٹتی ہے ہی، اللہ کے حدود تو پامال ہوتے ہیں ہی، ساتھ ہی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو بھی شدید

نقصان پہنچتا ہے۔ یہ نادان اسلام کے دوست نہیں، اور ان میں سے بہت سوں کو تو اسلام دشمنوں نے خوب کام کی چیز سمجھ کر پالا پوسا اور استعمال بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ کی دو شخصیتوں ابوحمزہ المصری اور عمر البکری کا تذکرہ تو ہمارے الفرقان کے صفحات میں بار بار آ چکا ہے۔ انہوں نے برطانیہ میں نوجوانوں کو اشتعال دلانے کا کام عین برطانوی ''حمایت وحفاظت'' میں خوب کیا۔

معاصر دنیا میں معاہدے کی بعض شکلیں:

ایسوں کی نادانیوں ہی کی وجہ سے کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جو شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس کا ویزا لے کر جاتا ہے تو وہ جس وقت ویزا اپلائی کرتا ہے اس وقت ہی وہ وہاں کی حکومت سے معاہدہ کرتا ہے کہ کسی کی جان ومال کے لیے خطرہ نہیں بنے گا، اور قانون کی پابندی کرے گا۔ پھر دوران سفر نہ جانے کتنی مرتبہ وہ تحریری طور پر یہ اطمینان دلاتا ہے۔ اب اس کے نزدیک وہ کیسی ہی اسلام دشمن اور ظالم ریاست کیوں نہ ہو اس کے لیے وہاں کے شہریوں کا مال وجان محترم ہیں۔ اس لیے کہ اس نے جانتے بوجھتے معاہدہ کرکے اپنی طرف سے اطمینان دلایا ہے۔ اس کے لیے اس کا کوئی جواز نہیں کہ وہ اسلام کے مقدس نام پر ''غدر'' اور ''نقض عہد'' کا ارتکاب کرے۔ اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے (چاہے نیک نیت سے ہی کرتا ہے) تو وہ گناہ ہی کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من امن رجلاً علی نفسه فقتله أعطی لواء الغدر یوم القیامه (مسند احمد ۲۱۴۴۲)	جس نے کسی کو اپنی طرف سے محفوظ ہونے کا اطمینان دلایا اور پھر قتل کر دیا، اس کو قیامت میں (ذلیل کرنے کے لیے) غداری کا جھنڈا تھما دیا جائے گا۔

صحیح ابن حبان[1] میں اسی حدیث کی ایک صحیح سند سے بیان کردہ روایت میں یہ تصریح ہے کہ چاہے وہ مقتول غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح کا ایک معاہدہ Citizenship شہریت کا معاہدہ ہے۔ آج کل کی غیر مسلم ریاستوں میں جو مسلمان رہتے ہیں اور وہاں کی شہریت اختیار کیے ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی ریاست اور اسکے عام شہریوں کے ساتھ ایک واضح معاہدہ کیا ہوا ہے۔ عام معاہدوں سے یہ معاہدہ اس اعتبار سے اہم ہوتا ہے کہ سارے معاہدوں کی کوئی نہ کوئی انتہا ہوتی ہے، مگر یہ لامحدود مدت تک کے لیے ہوتا ہے۔ انسانی تمدن کی تاریخ میں ہمیشہ ہی شہریت کو فرد اور ریاست کے درمیان ایک معاہدے کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ریاست اور شہری، اور خود آپس میں شہریوں کی جماعت ایک دوسرے کے تئیں ذمہ دارانہ معاہدے کے حامل سمجھے جاتے رہے ہیں، جس میں وہ سب ایک دوسرے کے جان اور مال کو اپنی طرف سے امان دیتے ہیں۔ ہمیشہ سے شہریت کی بنیاد یہی واضح معاہدہ ہوتا آیا ہے کہ سارے شہری ایک دوسرے کے مال اور جان کا احترام کریں گے۔ آپ اگر آج یہ اعلان کر دیں کہ میں کسی کی بھی جان کا احترام اپنے اوپر فرض نہیں مانتا، اور میرے ملک کے انسان میرے لیے "مباح الدم والمال" یعنی ان کی جان یا مال لے لینا میرے لیے حلال ہے، تو آپ کو وہ ملک فوراً باغی قرار دے دے گا۔

لیکن اب جدید دنیا میں تو یہ شہریت ایک بڑا وسیع معاہدہ بن گیا ہے، ریاست کی ذمے داریاں بھی بڑھ گئی ہیں اور فرد کے تعہدات (Commitments) بھی۔ اس بنا پر یہ بالکل طے ہے کہ جو مسلمان کسی غیر مسلم ملک کا شہری ہے اس کو اپنے اس ملک سے مسلمانوں کے ساتھ کیسے ہی دشمنانہ رویہ کی شکایت ہو، وہ جب تک اس کی

---

[1] حدیث ۵۹۸۲

شہریت کو لیے رہتا ہے اس وقت تک اس کے لیے اس ملک کے خلاف یا اس کے کسی عام شہری کے خلاف کسی قسم کی جنگ وقتال کے قسم کی کارروائی کرنا جائز نہیں۔ اس کے اوپر ظلم ہو رہا ہو تو وہ ظالم سے بس ظلم کا بدلہ لے سکتا ہے۔ ہاں وہ اگر اس کی شہریت ترک کر دیتا ہے اور اس ملک کو چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے تو اس کو اختیار ہے۔

رسول اللہؐ اور آپ کے صحابہؓ جب تک مکہ مکرمہ میں رہے اپنے آپ کو مکی ریاست کا شہری مان کر رہے۔ اور اہل مکہ کی ساری زیادتیوں کے باوجود آپؐ اور مسلمانوں کا رویہ وہاں کے غیر مسلم شہریوں کے ساتھ ایسا ہی تھا کہ کوئی عام شہری اپنے کو ان کی جانب سے خطرے میں نہیں سمجھتا تھا۔ ایک آدھ واقعات جو کسی مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان لڑائی یا زخمی کرنے کے ملتے ہیں وہ انفرادی لڑائیاں تھیں جو کسی بھی ایک ریاست کے دو شہریوں میں ہو سکتی ہیں اور ان میں مظلوم کا زیادتی کرنے والے کے خلاف اقدام غیر قانونی نہیں ہوتا۔ ہاں جب آپؐ نے مکہ چھوڑ دیا تو معاہدہ ختم ہو گیا۔ اور مکہ والوں کو مہاجر مسلمانوں سے معاہدے کا تحفظ حاصل نہیں رہا۔ اور اسی طرح مہاجر مسلمانوں کو مکہ کے لوگوں سے بھی تحفظ حاصل نہیں رہا۔

افسوس! یہ شرعی "حدود" (قوانین) جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی صریح غیر مشکوک سنت سے ثابت ہیں ان کا ہمارے یہاں مذاکرہ نہیں ہوتا۔ اور نتیجۃً ہم عصر حاضر کی صورتِ احوال میں اس کی تطبیق نہیں کر پاتے۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگ نہایت غیر محتاط بلکہ شرعی ضابطوں کو توڑنے والی رایوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ غلطیاں صرف وہ نوجوان کر رہے ہوتے جنہوں نے اس دور کے ظالموں کی چیرہ دستیوں سے عاجز آکر "تنگ آمد بجنگ آمد" کا مظاہرہ کیا ہے، تو کوئی زیادہ تعجب نہ ہوتا۔ مگر جب علمی قسم کے اداروں اور رسائل ومجلّات کی طرف سے یہ بے احتیاطیاں ہوتی ہیں تو حیرت ہی نہیں افسوس اور قلق بھی ہوتا ہے۔

کچھ مغربی اخبارات نے گذشتہ سال ۲۰۰۸ء میں جب وہ مشہور زمانہ ملعون کارٹون شائع کیے تو ہمارے دینی رسالوں میں اس پر مضمون نکلے۔ اور بہت سے دینی رسالوں میں گذشتہ تاریخ کے کئی ایسے واقعات نقل کیے گئے جن میں اہانت رسول کے کسی مجرم کو کسی پر جوش مسلمان نے خود ہی قتل کر دیا تھا۔ اور اس پر تحسین و آفریں کے ساتھ مبارک باد اس انداز میں دی گئی کہ گویا یہی اسوہ ہے دنیا بھر میں اہانت رسول کے مجرموں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کا۔ اور اگر ہو سکے تو یہی کر دینا شریعت کا حکم ہے۔

قانون میں اہانت رسول کا مجرم قتل کی سزا کا مستحق ہو سکتا ہے، مگر نہ جانے ان لوگوں کو یہ کیوں یاد نہیں رہتا کہ یہ سزا عدالت اور حکومت دے گی، جس کسی نے خود یہ کام کیا اس نے بہر حال قتل ناحق ہی کیا۔ اس لیے کہ حدود کے نفاذ کے لیے اس کی ولایت (Authority) شرط ہے، جو کسی فرد کو اللہ کی شریعت نے نہیں دی ہے۔ ایسا ناقص علم، دین اور اہل دین کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔ قرون اولی میں کسی مجرم کو اس طرح کی سزا (کسی بھی عالم کے فتویٰ کے تحت) حکومت اور عدالت سے ماوراء نہیں دی گئی۔

مثال کے طور پر دیکھیے اسی کارٹون چھپنے کے واقعے کے ضمن میں ایک مضمون نگار نے لکھا:

> مجھے ایک اور اسی طرح کا واقعہ یاد آ رہا ہے جو ڈنمارک میں پیش آیا تھا، ہالینڈ کے ایک آرٹسٹ نے ایک ماڈل کے برہنہ جسم پر (نعوذ باللہ) قرآنی آیات تحریر کر کے اسے آرٹ کا ایک شاہ کار نمونہ قرار دیا، مگر آفریں ہے وہاں پر رہائش پذیر مراکش مسلمان پر کہ جس نے اس آرٹسٹ کو کئی لوگوں کی موجودگی میں جہنم رسید کر دیا اور عدالت میں یہ کہا اگر کسی نے دوبارہ ایسی گھٹیا حرکت کی تو وہ دوبارہ بھی یہ قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا۔

خالص شرعی اعتبار سے اس نوجوان کا یہ عمل، افسوس کہ، بالکل غلط تھا، مگر پھر بھی کچھ لوگوں کی طرف سے غیر مشروط تحسین کا مستحق ٹھیرایا گیا۔ اس نوجوان کی اللہ مغفرت کرے، اس کی محبت اسلام کی عظمت اپنی جگہ، مگر اس کے لئے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ ایک ایسے ملک میں جس کے ساتھ اس کی ریاست کا معاہدۂ امن ہے، پھر اس نے بھی ویزا لے کر یہ معاہدہ کیا ہے کہ اس ملک کے شہریوں کے جان و مال کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گا، اور اس کے قانون کی پابندی کرے گا، شریعت نے اس کو اس کی قطعاً اجازت نہیں دی تھی کہ وہ اس دوہرے معاہدے کو توڑے اور شریعت کی اصطلاح میں ''غدر'' اور ''نقض عہد'' کے عظیم گناہ کا مرتکب ہو۔

اشتعال بھی کیسا عقل کا دشمن!

شرعی پہلو سے قطع نظر ان لوگوں کو آنکھوں سامنے کی یہ حقیقت نظر نہیں آرہی کہ اس زمانے میں ان حرکتوں کے جواب میں مسلمانوں کا پر تشدد ردعمل خود ان کے اپنے لیے کس قدر نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے؟ ان ظالموں کا تو آج تک ہم کچھ بگاڑ نہیں پائے، یا اپنی ہی پولیس کی گولیاں اور ڈنڈے کھائے، یا پوری دنیا میں ایک مذاق بن گئے۔ ہر کچھ دنوں کے بعد کوئی ہمارا تماشہ دیکھنے کے لیے اس طرح کی حرکت کر دیتا ہے، اور بس دھما چوکڑی شروع۔ ارے! کچھ کرسکیں تو زور لگایئے، ورنہ:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد۔

سمجھ داری کا تقاضہ تو یہ ہے کہ دشمن کی چال کو الٹ دیا جائے نہ کہ اس کے ہتھیاروں کی دھار تیز کی جائے۔ ان شیطانوں کا مقصد دنیا میں خصوصاً مغرب میں مسلمانوں سے نفرت پیدا کرتے رہنا ہے۔ پر تشدد اقدامات ان کا مقصد ہی تو پورا کرتے ہیں۔

فصل سوم

جنگ کی ضروری تیاری

امت اسلامیہ کا وجود بڑی قیمتی شے ہے، اور جنگ یقیناً جان جوکھوں کا کھیل۔ اس لیے ایک طرف اگرچہ اس کی تعلیم دی گئی کہ اللہ کے بھروسے پر جان لڑا دی جائے، مگر دوسری طرف یہ بات بھی عقل عام کی رو سے ضروری ٹھیرائی گئی کہ پھر بھی دیکھ لیا جائے کہ اپنی حربی صلاحیت، ساز وسامان، اور ایمانی واخلاقی اور نظم وضبط کی حالت کسی بھی حد تک مقابلے کی ہے، یا بظاہر اسباب بالکل طے ہے کہ نتیجہ آخرکار یہ کہنے کی شکل میں ہی نکلنا ہے کہ:

مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

اگر بظاہر اسباب بالکل طے ہے کہ سوائے ناکامی اور شکست وریخت کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں لگنا تو عام حالات میں جنگ سے بچنا، یعنی حالات کے سازگار ہونے کا انتظار ہی فرض ہوگا۔ ''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'' کے لیے ہمیں قرآن وسنت میں کوئی نمونہ نہیں ملتا، ہاں حربی پوزیشنوں میں زبردست فرق کی کوئی نظیر اگر ملتی ہے تو بس بدر کے 'یوم الفرقان' میں جو قرآن کی سورۂ دخان کی روشنی میں قریش مکہ کے سرداروں کے لیے اللہ کا عذاب (یوم البطشۃ الکبریٰ) تھا۔ مگر اس طرح کی مدد کے انتظار سے پہلے ''فضائے بدر'' پیدا کرنے اور امت کے عمومی حال اور اُن کے ایمان وکردار میں کسی کم از کم درجہ میں بھی نسبت اور مشابہت کا اطمینان کر لینا

ضروری ہے۔

یہ تعلیم خود قرآن نے ہمیں دی ہے کہ جنگی پوزیشن کا خیال کیا جائے گا۔ پہلے جب سابقین اولین کا لشکر تھا تو کہا گیا کہ ایک کے مقابلے دس کا بھی حساب ہو تو تم ہی فاتح ہو، شرط یہ ہے کہ تم "صابرون" یعنی جمنے والے ہو، اسی کو آج کی اصطلاحی زبان میں (High Morale) کہتے ہیں۔ پھر جب سابقین اولین کے ساتھ دوسرے مسلمان بھی آگئے تو اس فرق میں واضح کمی کی گئی، اور کہا گیا کہ اب تمھارا ایمانی حال پہلے جیسا نہیں رہا، اس لیے اللہ تم کو آسانی دیتا ہے۔ اب اگر تمہارے مقابلے دشمن کی پوزیشن دگنی ہوگی تو تم فاتح ہو جاؤ گے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ. الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ. (الانفال ٦٥-٦٦)

ظاہر ہے کہ پہلے اگر مادی طاقت صرف تعداد سے گھٹتی اور بڑھتی تھی، تو اب اس میں بہت سی دیگر ایسی چیزیں زمانے کے ساتھ ٹکنالوجی کی شکل میں پیدا ہوگئی ہیں جو طاقت کے توازن میں زبردست فرق پیدا کرتی ہیں، بلکہ وہ ایسا فرق پیدا کرتی ہیں جو تعداد کا بڑے سے بڑا فرق پیدا نہیں کرسکتا۔ اور دوسری چیز یعنی "صبر" اخلاقی طاقت (morale) اور ایمانی حالت میں بھی اِس زمانے میں عہد صحابہ سے اچھے حال کی توقع تو کی نہیں جاسکتی۔

لہذا اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جہاں حربی پوزیشن اور جنگی طاقت میں ایک اور دو

سے زیادہ کا فرق ہو (چاہے وہ تعداد کی شکل میں نہ ہو بلکہ اسلحہ کی کیفیت وکمیت کی شکل میں ہو) وہاں مقابلہ کرنا اور بہرحال جنگ کرنا فرض کے درجے کی چیز نہیں رہے گی۔

لیکن اگر مسلمانوں کی قیادت سنجیدگی کے ساتھ اپنے علم وتجربہ کی بنیاد پر اور دشمن کی عیاشی، بزدلی، کمزور اخلاقی حالت اور جذبے کی سردی کا اندازہ کرکے یہ سمجھتا ہو کہ وہ ایک لمبی جنگ میں دشمن کو تھکا سکتی ہے اور اس کو پسپائی پر مجبور کرسکتی ہے، تو یہ یقیناً نہایت قابل تعریف عزیمت اور قابل رشک ایمان کا فیصلہ ہوگا۔

قرآن مجید میں اوپر ذکر کی گئی آیتوں سے پہلے یہ حکم بھی آچکا ہے کہ تمہاری ایمان وعزیمت کی حالت جب بہتر تھی تو دشمن کے دس گنا ہونے پر بھی تم ہی کو فاتح ہونا تھا۔ قرآن نے اس کا سبب دشمن کفار کی "ناسمجھی" یعنی زندگی کی حقیقتوں اور مقاصد حیات سے بے خبری کو بتایا تھا۔

بہرحال قرآن کی ان آیات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی شریعت میں قتال سے پہلے نہایت حقیقت پسندی کے ساتھ اس کا جائزہ لے لینا ضروری ہے کہ کامیابی کے امکانات معدوم تو نہیں۔

ایک عجیب غلط فہمی:

بعض لوگ اس سلسلے میں سورہ انفال کی مندرجہ ذیل آیت سے عجیب قسم کی غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (الأنفال. ٦٠)

اور تیاری جمع کرو ان کے مقابلے کے لیے جو بھی کرسکو، ہر طرح کی طاقت کے اسباب میں سے، اور گھوڑوں سے، جس سے تم ڈراؤ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو۔

یہ حضرات اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم جو کر سکیں بس وہ کر لیں اور پھر ہم کو حکم ہے کہ مقابلہ کے لیے کود پڑیں۔ ایک ذرا غور کی نگاہ اس بے بنیاد استدلال کی کمزوری کو عیاں کر دیتی ہے۔ آپ دیکھیے، اس میں یہ کہیں نہیں ہے کہ جو کر سکو اس کے بعد انتظار مت کرو، فوراً اللہ کی مدد کے بھروسے کود پڑو۔ اس آیت میں صرف تیاری کا حکم ہے کہ اس میں کوئی کمی نہ کی جائے یہ تمہارا فرض ہے۔ آیت کا مقصد صرف اتنا ہی ہے، اس کو اس سے کوئی تعلق نہیں کہ کتنی تیاری پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کب تک تیاری کی جائے گی اور طاقت میں کس درجے میں توازن کی شکل پیدا ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔

لیکن بہرحال اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کی مدد کا قانون معطل ہو گیا۔ اب اہل ایمان اس کی مدد سے مایوس ہو جائیں۔ ہرگز نہیں، اگر اہل ایمان عمومی سطح پر ایمان اور عبدیت کی زندگی اختیار کر لیں اور اللہ کے دین کی مدد و نصرت کو اپنا اصل مطمح نظر بنا لیں، اور اس راہ کی جدوجہد میں اپنے بس بھر سب کچھ کر ڈالیں تو ان سے اللہ کا پختہ وعدہ ہے کہ وہ دنیا کے حالات میں اپنی غیب کی طاقت سے ایسی تبدیلی لائے گا جس سے ان کی جدوجہد کے راستے کھلیں گے، اور ان کے ذریعے دنیا کا بگاڑ ختم ہو کر اس میں خیر و صلاح اور انصاف ظاہر ہوگا۔ یہاں اسی پر اکتفا کیجیے، اللہ کی نصرت کے قانون پر ہم آگے کچھ گفتگو کریں گے۔

فصل سوم

جنگ میں حصہ نہ لینے والے
عوام کے جان و مال کی حرمت

جہاد فی سبیل اللہ پر غور کرتے وقت یہ حقیقت ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ جہاد کی فضیلت کا راز نہ کشت وخون میں ہے، اور نہ خونریزی فی نفسہ کوئی اچھی چیز ہے۔ اس کی غیر معمولی فضیلت کا راز نصرت دین کا عظیم مقصد ہے، مجاہد کی عند اللہ محبوبیت کا سبب یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت اور اس کے اجر وثواب کی طمع میں ان عظیم مقاصد کی خاطر خلوص دل سے مال وجان قربان کرتا ہے۔ اسلام کی نظر میں قتل وقتال ایک شر ہے، لیکن ظلم اور ''فتنہ'' اس سے بڑے شر ہیں۔ جہاد کی جنگ دنیا کو ظلم اور ''فتنہ'' وفساد کے عظیم شر سے بچانے کے لیے ہے۔ "والفتنة اكبر من القتل"۔

اس لیے اسلامی شریعت حکم دیتی ہے کہ جنگ میں صرف ان ہی کو مارنا جائز ہے جو جنگ میں حصہ لے رہے ہیں، یا اس کے لیے تیار ہیں۔ محاربین (Belligerents) میں سے جو عملاً مقاتلین (Combatants) ہوں بس ان کو ہی نشانہ بنانا جائز ہے۔ (ہاں جو کوئی جنگ میں اپنے مشوروں اور دیگر خدمات سے شریک ہوگا اس کا بھی یہی حکم ہوگا)۔ بہر حال جنگ میں عملاً حصہ نہ لینے والے عوام کو کوئی نقصان پہنچانا جائز نہیں۔

ایک مرتبہ میدان جنگ میں آپ کو ایک عورت کی لاش ملی، آپ کو فکر ہوئی۔ ناراضگی کے عالم میں فرمایا: (ما كانت هذه لتقاتل) یہ کون سا جنگ کر رہی تھی جو اس کو مار دیا؟ پھر امیر جیش حضرت خالدؓ کو حکم کہلا بھیجا: نہ کسی عورت کو قتل کیا جائے اور نہ کسی مزدور غلام کو[1]۔ عورتوں اور بچوں کے قتل کے ممنوع ہونے کا آپؐ نے بار بار اعلان فرمایا ہے۔ صحاح ستہ میں متعدد صحابہ سے اس سلسلے کی روایات موجود ہیں۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

لا تقتلوا شيخاً فانياً ولا طفلاً صغيراً ولا امرأة ولا تغلوا وضموا غنائمكم واصلحوا ان الله يحب المحسنين۔[2]	نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرنا اور نہ چھوٹے بچے کو اور نہ عورت کو۔ مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا۔ نیکی اور احسان کرنا، اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

آپؐ نے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی طرح عزلت گزین عبادت گزاروں کو بھی قتل کرنے سے منع فرمایا۔ مسند احمد[3] میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ جب کہیں لشکر روانہ فرماتے تو یہ ہدایت فرمادیتے کہ عبادت گاہوں کے لوگوں (یعنی خدام اور عبادت گزاروں) کو قتل نہ کیا جائے۔ امام مالک نے موطا میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت یزیدؓ بن ابی سفیانؓ کو شام کے علاقے کی ایک مہم پر روانہ فرمایا، یہ علاقہ عیسائی تھا۔ روانگی کے وقت حضرت ابوبکرؓ ساتھ میں کچھ دور تک رخصت کرنے گئے۔ خود پیدل اور حضرت یزیدؓ سوار۔ اس پر حضرت یزید نے

---

[1] سنن ابوداؤد ۲۶۶۹ و مسند احمد ۱/۱۵۸: ۵۹۲۳، نیز صحیح بخاری ۳۰۱۵

[2] سنن ابی داؤد ۲۶۱۴

[3] ۲/۲۳

عرض کیا: اے خلیفۂ رسول، یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں یا مجھے اجازت دیں میں اتر کر پیدل چلوں۔ حضرت ابوبکر نے منع فرمادیا، اور کہا: نہ میں سوار ہوں گا اور نہ تم کو اترنے کی اجازت ہے، مجھے اللہ سے ایک ایک قدم پر ثواب کی امید ہے۔ پھر کچھ احکام دیے۔ جن میں یہ بھی تھا کہ:

> تم کو کچھ ایسے لوگ ملیں گے جو کہیں گے کہ ہم نے عبادت کی خاطر دنیا چھوڑ دی ہے، تو ان سے کچھ تعرض نہ کرنا۔ اور میں تم کو دس باتوں کی تاکید کرتا ہوں۔ نہ کسی عورت کو قتل کرنا، نہ بچے کو، نہ بوڑھے ضعیف کو، کسی پھل دار درخت کو بھی نہ کاٹنا۔ کسی آبادی کو نقصان نہ پہنچانا۔ اگر فوج کو غذائی کمی نہ پیش آئے تو بکری یا اونٹ بھی نہ ذبح کرنا۔ نہ کسی باغ میں آگ لگانا نہ ڈبونا۔ عہد شکنی نہ کرنا، مثلہ نہ کرنا......"[1]

امام بیہقی[2] نے اس طرح کے احکام پر مبنی کچھ روایات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نقل فرمائی ہیں اور ان کی اسناد کے کمزور ہونے کے باوجود کثرت اسانید اور آثار صحابہ کی وجہ سے ان کو قوی قرار دیا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا صحیح جواب:

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی پورے قبیلے پر حملہ کیا تھا اور کبھی ان سب کو ہی قید کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ قیدی بنانا جنگ میں حملوں کا نشانہ بنانا ہی ہے۔ اسی طرح آپ نے کہیں کہیں سارے قبیلے کے مال پر بطور غنیمت قبضہ کیا ہے؟

دراصل عہد نبوی میں جہاں کہیں دشمن کی پوری آبادی کو نشانہ بنایا گیا وہاں کے

---

1. موطا ۸۵۸
2. سنن بیہقی: ۹/۹۰

بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ پورے کے پورے قبیلے نے جنگ کی تھی۔ قبائلی معاشرے میں پورا قبیلہ ہی جنگ کرتا ہے۔ عربوں کے یہاں بھی عموماً یہی طریقہ تھا۔ اسی لیے ہمیں نظر آتا ہے کہ پورے قبیلے کے خلاف کارروائی کی گئی۔ عہد نبوی کے بیشتر غزوات کے اس پہلو کو پیش نظر رکھنے سے بہت سی مشکلات حل ہوتی ہیں۔ غزوات نبوی کے مطالعے کے لیے یہ ایک اہم رہنما اصول ہے۔ بہت سے لوگوں کی نگاہ اس مخصوص پہلو کی طرف نہ جانے کی وجہ سے بے شمار اشکالات پیدا ہو گئے۔ اگر اس خاص پہلو کو مدنظر رکھا جائے تو یہ غلط فہمی نہیں پیدا ہو سکتی کہ جنگ سے کنارہ کش بے گناہ عوام کی املاک بھی ضبط کی جا سکتی ہیں۔

جہاں اس کے خلاف ہوا یعنی پوری آبادی نے جنگ میں حصہ نہیں لیا وہاں ہم کو نظر آتا ہے کہ جنگ سے دور رہنے والوں کو پورا تحفظ دیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

مکہ نسبۃً ایک شہری ریاست تھا۔ فتح مکہ میں آپؐ نے عام منادی کر دی تھی کہ جو اپنے گھر میں بیٹھ رہے وہ محفوظ ہے، جو دروازہ بند کر لے وہ محفوظ، جو ہتھیار ڈال دے وہ محفوظ[1]۔ فوجوں کو حکم دیا گیا تھا کہ زخمی کو قتل نہ کیا جائے، اور پیٹھ پھیر کر بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے[2] اور سوائے چند جنگی مجرموں کے کسی سے تعرض نہیں کیا گیا۔ یہ جنگ میں حصہ نہ لینے والے عوام کے جان و مال کے محفوظ ہونے کا اعلان ہی تو ہے۔

اسی طرح صحابۂ کرام کے زمانے میں جن قوموں کے خلاف بھی جنگ کی گئی وہاں یہی اصول برتا گیا کہ جو لوگ جنگ سے دور رہے ان کے مال اور جان محفوظ مانے گئے۔ یہ امت کے قرون اولیٰ کا عام تعامل ہے، اور اس سے زیادہ بڑی دلیل کیا

1۔ صحیح مسلم ۱۷۸۰

2۔ فتوح البلدان: ۵۳/۱

ہو سکتی ہے؟ مسلمانوں کا اپنے مفتوحین کے ساتھ معاملہ ایسا دل موہ لینے والا ہوا کرتا تھا، اور جن علاقوں میں ان کی فوجیں گئیں تھیں وہ اپنے حکمرانوں کے ظلم اور استحصال سے اس قدر عاجز تھے کہ بس منظّم فوجوں نے ہی ان کی کسی قدر مزاحمت کی۔ یہ منظّم فوجیں حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی ہوتی تھیں، جن کے مادی مفادات ان کو سابقہ نظام کی حفاظت کرنے پر آمادہ کرتے تھے۔ باقی ملک کے عوام سے اسلامی فوجوں کو کہیں بھی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، بلکہ بہت سی جگہوں پر تو مقامی لوگ اسلامی فوجوں کا استقبال کرتے نظر آئے۔ اسلامی فوجوں نے ان کے عوام کی جان کو محفوظ سمجھا۔ جزیرۃ العرب کے باہر عراق سے لے کر ایران تک، اور شام سے لے کر مشرقی یورپ تک، اور افریقہ میں مصر سے لے کر مراکش اور الجزائر تک سارے علاقوں کے عوام کا خون اور مال واسباب محترم جانے گئے۔

ان مختلف مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اس سلسلے میں آخری حد تک رحم اور انسانیت نوازی کا قانون رکھتا ہے۔ آج کے زمانے میں جب صرف منظّم فوجیں ہی عموماً جنگ کرتی ہیں، اس لیے رسول اللہؐ کی ان تعلیمات اور صحابۂ کرام کے اس طرز عمل کی بنا پر طے ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے اصولاً صرف فوج اور فوجی تنصیبات ہی جنگی کارروائیوں کا نشانہ بن سکتی ہیں۔ غیر مسلح عوام اور عملاً جنگ میں حصہ نہ لینے والے پوری طرح محفوظ ہونے چاہییں۔

اس سلسلے میں بڑی پریشانی اس وقت پیش آتی ہے جب ہم قدیم اسلامی مآخذ کی اکثریت میں، فقہ کی کتابوں میں، حدیث کی شروح میں اور دیگر کتب میں کثرت سے اس طرح کی تصریحات دیکھتے ہیں کہ دشمن کا ہر عاقل بالغ مرد جو قتال پر قدرت رکھتا ہو وہ ''محلِ قتل'' ہے۔ چوں کہ اوپر ذکر کیے گئے واضح دلائل کی روشنی میں یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ شریعت نے صرف عملاً قتال میں حصہ لینے والوں کو یا اس کی تدبیر

میں دیگر خدمات کے ذریعہ شریک رہنے والوں کو "محل" قتال مانا ہے یعنی قتل کرنے کی اجازت دی ہے، اس لئے علماء کی ان تصریحات کو اسی کی روشنی میں سمجھا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ان کی مراد بھی یہی ہے کہ دشمن ملک کے جنگ سے عملاً کنارہ کش رہنے والے بے شمار بے گناہ عوام کا جان مال محفوظ ہے۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ جنگوں میں اسی پر عمل کیا ہے اور کبھی بھی جنگ میں عملاً حصہ نہ لینے والوں کو قتل نہیں کیا۔

جدید دور میں جب غالباً تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کو بھی یہ شعور نصیب ہوا کہ جنگ کو اخلاقی قوانین اور مہذب ضابطوں کا پابند بنایا جائے، تو ان میں کے بعض کوتاہ بینوں نے بڑھ بڑھ کر اسلامی جہاد پر اعتراض کرنے شروع کئے۔ اسی دور میں مولانا مودودی نے اپنی مفید کتاب الجہاد لکھی۔ مگر نہایت حیرت ہے کہ مولانا جیسا واقف آدمی جو عصر حاضر کی نفسیات اور اعتراضات سے واقف تھا، اس جگہ اسی قدیم تعبیر پر راضی ہو گیا کہ ہر جوان مرد اہل قتال میں مانا جائے گا اور اس کو قتل کرنا جائز ہوگا۔ لکھتے ہیں:

"اہل قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہیں، یا عقلاً وعرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں، یعنی جوان مرد"

آگے ان لوگوں کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں کہ اسلام نے ان کو "قتل کرنے کی اجازت دی ہے"۔ مزید لکھتے ہی کہ "اسلامی قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص جو اہل قتال میں سے ہے (یعنی جوان مرد جیسا کہ مولانا نے پہلے تصریح کی ہے) اسکا قتل جائز ہے"[1]۔

بہر حال جن لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ سارے ہی وہ لوگ قتل کیے جا سکتے ہیں جو

---

[1] الجہاد صفحہ ۲۲۲۔۲۲۴

جنگ میں حصہ لینے کے قابل (Potential Combatants) ہوں، چاہے انہوں نے عملاً جنگ میں حصہ نہیں لیا ہو، انہوں نے احادیث کے پورے مجموعے کو سامنے نہیں رکھا، اور صحابۂ کرام کے طرز عمل پر بھی غور نہیں کیا، اور غلط فہمی کے شکار ہوے۔ یہ بات اسلام کے عام مزاج اور انسان دوستی کے فطری اصول کے بھی خلاف ہے، اور اس کے حق میں کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔

فصل چہارم

۵۔ مال غنیمت کا مسئلہ

لوٹ کی ممانعت

جنگ کے دوران عام لوگوں کا مال چھین لینا قطعاً حرام قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں عام لوٹ کو قطعا حرام قرار دیا۔ ایک مرتبہ جہاد کے سفر میں شدید غذائی کمی پیدا ہوگئی۔ لوگوں نے کچھ بکریاں لوٹ کر ذبح کرلیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب پتہ چلا تو دیگچیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ آپ غصے کے عالم میں باہر نکلے، اپنی کمان سے دیگچیاں پلٹ ڈالیں، غضب کا یہ حال تھا کہ گوشت مٹی میں لتھیڑتے جاتے اور کہتے جاتے تھے: لوٹ کا مال مردار سے کم حرام نہیں ہے[1]۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ جس نے لوٹ مار کی وہ ہم میں سے نہیں[2]۔

حضرت ابوبکرؓ نے شام کے علاقوں کے لئے جب فوج بھیجی تو اس کے سپہ سالار کو بالکل آخری وقت کچھ وصیتیں اس اہتمام سے کیں کہ خود پیدل چلے جاتے تھے اور وہ امیر سوار، ان وصیتوں میں سے ایک اہم وصیت یہ بھی تھی کہ دشمن ملک کے عوام کے جانوروں تک کو ذبح کر کے نہ کھایا جائے، الا یہ کہ شدید غذائی کمی پیش آجائے[3]۔

جہاد کے ذیل میں غنیمت اور غلامی کے موضوعات ہمارے" کرم

---

[1] ابوداؤد ۲۷۰۵، ابن ماجہ ۳۹۳۸

[2] ترمذی ۱۶۰۱

[3] موطا ۸۵۸

فرماویں" کے لیے بڑے مرغوب اور شوق انگیز رہے ہیں۔ مستشرقین نے ان کو معاذ اللہ اسلام کی خونخواری اور اولین مسلمانوں کی طمع کے ثبوت میں خوب پیش کیا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ غلط فہمیوں کے پردوں کو علم و تحقیق کے ہاتھ جہاں اٹھاتے ہیں اسلام کا رخ زیبا اپنی دل کش نورانیت کے ساتھ جلوہ آرا ہو جاتا ہے۔

مال غنیمت کیا ہے؟ جس سے جنگ کی جارہی ہے، اور جس کی جان بھی جنگ میں لے لینا جائز ہے اس کا مال ہی مال غنیمت ہے۔ اسلام سے پہلے جنگ میں اندھا دھند لوٹ مار کا بازار گرم ہوتا تھا۔ ہمیں دنیا کی معلوم تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی حکومت نے اس کو روکنے کی کوئی کوشش کی ہو، یا اس کے روک تھام کے لیے کوئی قانون بنایا ہو۔ آج جنگی قوانین میں لوگوں کے ذاتی مال کی حرمت کا جو تصور پایا جاتا ہے یہ اسلامی تاریخ ہی کی دین ہے۔

مال غنیمت کے سلسلے میں اسلامی قانون کی دو بنیادیں ہیں:

۱۔ اسلام میں مال غنیمت صرف وہ مال ہے جو محارب حکومت یا مقاتلین (Combatants) کی ملکیت ہو۔ اور یہ بھی اسی صورت میں جب جنگ میں ہاتھ آئے، یعنی جنگ سے پہلے یا اس کے ختم ہونے کے بعد مال لینا اسی "لوٹ" کا حصہ شمار ہوگا جو مردار کی طرح حرام ہے۔ اُس زمانے کے انٹرنیشنل لا (قانون بین الاقوام) کی رو سے مقاتلین کو غلام بنانا جائز تھا، لہٰذا ان کی مملوکہ ساری جائداد بھی مال غنیمت کے دائرے میں آتی تھی۔ جب تک مسلمانوں کی آویزش ان چھوٹی قبائلی طاقتوں سے رہی جن کے یہاں حکومت اور منظم فوجوں کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ ساری ہی آبادی جنگ کرتی تھی، یہ سمجھا جاتا رہا کہ سب کا مال اس دائرے میں آتا ہے۔ مثلاً بنو مصطلق اور مدینے اور خیبر کے یہودیوں کا یہی معاملہ تھا، مگر اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ کافی رعایتیں کیں۔ بنو ہوازن کے پورے قبیلے

نے اس طرح جنگ کی کہ میدان جنگ میں اپنی عورتیں بچے اور مویشی تک لے کر آ گئے۔ اس لیے یہ سب کچھ ہی غنیمت میں آیا۔[1]

عہد صحابہ کی جنگوں میں عوام کی املاک کو غنیمت نہیں بنایا گیا:

لیکن جب مقابلہ باقاعدہ فوجوں والی حکومتوں سے ہوا تو وہاں صورت حال دوسری تھی۔ یہاں جنگ صرف حکومت سے تھی، اور براہ راست اس کے حکم ران طبقے اور فوجوں سے تھی۔ عوام کی جس طرح جان محفوظ تھی اسی طرح ان کا مال بھی غنیمت میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اس قسم کے علاقے جب فتح ہونے شروع ہوئے تو مسلمان فوجوں کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جس طرح غزوۂ خیبر میں جو حصے جنگ کر کے جیتے گئے تھے ان کی زمینیں مجاہدوں میں تقسیم کر دی گئی تھیں، اسی طرح سے عراق اور شام کے ان علاقوں کی زمینیں جو جنگ کر کے قبضے میں آئے ہیں تقسیم کر دی جائیں۔ لیکن حضرت عمر نے صحابۂ کرام کے مشورے سے وہ زمینیں ان کے کاشت کاروں کے پاس ہی رہنے دیں، اور ان پر خراج کا ٹیکس عائد کیا، اور اس کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ وہ حکومت کی عام فلاحی اسکیموں میں کام آئے گا۔ عراق میں سب سے پہلے یہ مسئلہ پیش آیا۔ حضرت عمر نے فاتح عراق حضرت سعد بن ابی وقاص کو لکھا:

> فوج نے جو میدان جنگ میں اونٹ گھوڑے یا مال و اسباب پائے ہیں، اس

---

[1] اس کے باوجود اسلامی حکومت نے بعض جگہوں پر مال غنیمت کے نام پر ایک حبہ بھی نہیں لیا، جیسا کہ مکے میں ہوا۔ بلکہ (صحیحین کی روایات کے مطابق) مکہ کے لوگوں کو بلکہ ان کے ان سرداروں کو جنھوں نے عرب میں مخالف محاذ کی قیادت کی تھی اور ان میں سے بہت سے ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، ہوازن کے مال غنیمت کا ایک بڑا حصہ دیا، اور سارے مسلمان اس سے محروم رہے۔

کے چار حصے ان کے درمیان تقسیم کردو، اور ایک حصہ حکومت کے حق میں روک لو۔ زمین اور نہروں کو ان لوگوں (کاشت کاروں) ہی کے پاس چھوڑ دو، تاکہ ان کا لگان حکومت کی تنخواہوں کے کام آئے[1]۔

عراق کی ان زمینوں کے بارے میں لوگ یہ سمجھتے رہے کہ جس طرح خیبر کی زمینیں مسلمانوں کی ملکیت قرار پائی تھیں، اسی طرح ان کے مالکوں کی ملکیت ختم کرکے اِن زمینوں کو بھی اسلامی حکومت کی ملکیت میں لے لیا گیا ہے۔ جب کہ گہرے مطالعے اور جائزے نیز پوری تاریخ کے دوران امت کے تعامل سے پتہ چلتا ہے کہ عراق کی زمینیں کاشتکاروں کی ملکیت میں ہی باقی تھیں۔ دراصل دونوں معاملوں میں چند بنیادی فرق تھے:

الف۔ خیبر جزیرۃ العرب کا حصہ تھا، جس کو غیر مسلموں سے خالی کرانا ہی تھا۔ شرعی طور پر اس کا یہی حکم تھا کہ اس میں غیر مسلموں کی کوئی اجتماعیت نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے ان زمینوں کی ملکیت یہود کے پاس رہنے دینا ممکن ہی نہیں تھا۔ عراق جزیرۃ العرب سے باہر ہے اور اس کی ایسی کوئی شرعی پوزیشن نہیں ہے۔

ب۔ خیبر کی آبادی قبائلی ریاست تھی، قبائلی ریاست میں حکومت کی ملکیت اور افراد کی الگ ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہوتا، ایسی ریاست کی جب کسی سے جنگ ہوتی ہے تو اس جنگ میں عوام اور حکومت میں فرق نہیں ہوتا۔ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ عہد نبوی کے بیشتر غزوات کے اس پہلو کو پیش نظر رکھنے سے بہت سی مشکلات حل ہوتی ہیں۔

خیبر میں سارے ہی لوگوں نے مسلمانوں سے جنگ کی تھی۔ وہ سب دشمن اور سازش کے مجرم تھے۔ اس لیے ان کی جائدادوں پر قبضہ کرنا بالکل مناسب تھا۔ جب

---

[1] فتوح البلدان: ۲۶۵، کتاب الخراج لأبي يوسف: ۱۵

کہ عراق ایران کا ایک بڑا صوبہ تھا۔ جس کا سیاسی نظام ایک مکمل متمدن ریاست کا تھا۔ یہاں کے لوگ پہلے سے ہی ساسانی حکمرانوں سے بیزار تھے، ایرانی حکومت کے استحصال نے ان کو سخت اذیتوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ جب مسلمانوں نے کسریٰ کی فوجوں سے جنگ کی تو وہ شریک جنگ نہیں ہوئے۔ ان کی حیثیت جنگ کرنے والوں کی نہیں تھی۔ بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ استقبال ہی کا معاملہ کیا تھا۔

ج۔ خیبر میں زمینیں عارضی طور پر ہی یہود کے حوالے کی گئی تھیں۔ ان سے صراحت کر دی گئی تھی کہ یہ زمینیں اسلامی حکومت کی ملکیت ہیں، وہ صرف عارضی طور پر اس میں کھیتی کریں، اور جب حکومت چاہے گی علاقہ ان سے خالی کرالے گی[1]۔ اس کے برخلاف عراق کے لوگوں سے نہ صرف یہ کہ ایسی کوئی بات نہیں طے ہوئی تھی، بلکہ اسلامی حکومت نے ان کو ان زمینوں میں مالکانہ تصرفات کرنے (مثلاً فروخت اور وراثت وغیرہ) سے کبھی نہیں روکا۔ اس کا مطلب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت نے ہر دور میں ان کو ان زمینوں کا مکمل طور پر مالک تصور کیا۔

کچھ علماء کو ضرور یہ خیال رہا کہ یہ زمینیں کسی کی ملکیت نہیں ہیں لیکن حکومت نے اور عام مسلمانوں نے اس کو ان کے وارثوں ہی کی ملکیت سمجھا۔ فقہاء احناف کی یہی رائے ہے کہ یہ زمینیں حکومت اسلامیہ نہیں بلکہ وارثان کی ملکیت ہیں۔

تاریخ بغداد کے شروع میں خطیب بغدادی نے اس سلسلے میں بڑی دلچسپ حکایتیں نقل کی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان زمینوں کے بارے میں اگرچہ یہ رائے شروع سے رہی ہے کہ یہ زمینیں کسانوں سے لے کر مسلمانوں کی عمومی ملکیت قرار دے دی گئی ہیں، مگر یہ رائے بھی رہی ہے کہ نہیں! یہ زمینیں ان کے پہلے مالکوں سے لی نہیں گئی ہیں بلکہ وہی ان کے مالک ہیں، صرف خراج کا ٹیکس ان زمینوں پر لگایا

---

[1] صحیح بخاری: ۲۳۳۸، صحیح مسلم: ۱۵۵۱

گیا ہے۔

امام ابوعبید قاسم ابن سلام نے لکھا ہے کہ دونوں رائیں ہمیشہ سے رہی ہیں، دونوں طرف ائمہ ہیں، اگر چہ ایک طرف کثرت ہے[1]۔ لیکن امام قاسم کے برخلاف یہ عاجز (امت کے اس عام تعامل کی بنا پر جس کے بموجب یہ زمینیں ہمیشہ خریدی بیچی اور وراثت میں منتقل ہوتی آئی تھیں) فیصلہ کن کثرت اس جانب مانتا ہے کہ زمینیں سابقہ کسانوں کی ہی ملکیت میں رہیں۔ امام قاسم نے اس سلسلے میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، سفیان ثوریؒ اور محمد ابن سیرینؒ کے نام ہماری اختیار کردہ رائے کے حاملین میں لیے ہیں۔ خطیب بغدادی نے ان میں ابن ابی لیلیٰ اور حفص ابن غیاث کا اضافہ کیا ہے۔ دونوں ہی نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور حضرات حسنؓ و حسینؓ نے عراق کی ایسی زمینیں خریدی تھیں۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو ان زمینوں کا مالک سمجھتے تھے۔

حافظ ابن القیمؒ نے اس سلسلے میں اپنی کتاب احکام اہل الذمۃ میں عراق کی ان زمینوں کے بارے میں فیصلہ کن بحث کی ہے۔ کہتے ہیں کہ امام احمد نے تصریح کی ہے کہ اس زمین کو مہر میں دیا جا سکتا ہے۔ یہ اس بات کے لیے کافی دلیل ہے کہ ان زمینوں کی خرید فروخت ہو سکتی ہے۔ لوگوں کو اس سے شبہہ ہوا ہے کہ صحابۂ کرام کے یہاں اس قسم کی بات کہی گئی ہے کہ "یہ وقف ہے"۔ اس زمین کے وقف ہونے کا مطلب بس یہ تھا کہ اس کو فوج میں غنیمت کے طور پر تقسیم نہیں کیا گیا اور اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا اور اس پر خراج لگا دیا گیا۔ یہ نہیں کہ اس کو سدا کے لیے مسلمانوں پر وقف کر دیا گیا۔ یہ کام نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، نہ حضرت عمر نے کیا اور نہ مسلم حکمرانوں نے کبھی کیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ زمینیں وراثت میں ہمیشہ منتقل ہوتی

---

[1] کتاب الاموال ۲۲۲/۱

رہیں، اور بیچی خریدی جاتی رہیں[1]۔

جدید مغربی مورخین بھی، جنہوں نے اس علاقے کی تاریخ میں اسلامی مآخذ کے علاوہ ایرانی مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے، اسی نتیجے تک پہونچے ہیں کہ مسلمانوں نے زمینیں کاشت کاروں کی ملکیت میں رہنے دی تھیں۔ حالانکہ اگر زمینوں کو اسلامی حکومت کی ملکیت میں لیا گیا ہوتا تو فطری طور پر قدیم ایرانی مآخذ ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اس کو کسی طرح چھپنے نہ دیتے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

> Apart from the Persian elite and the Zoroastrian priests, whose property was confiscated, most of the local people were allowed to keep their possessions and their religion.
>
> (عراق کے) ایرانی حکمراں طبقے اور زرتشتی مذہبی پیشواؤں کے سوا کسی کی املاک ضبط نہیں کی گئیں[2]۔ عوام کو مذہبی آزادی اور ان کی اپنی املاک کو تحفظ دیا گیا۔

عراق کے بعد شام میں ایسا ہی ہوا۔ فتح کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ کے نام فرمان فاروقی پہنچا کہ: زمینیں اُن کے پاس رہنے دو، اور جزیہ عائد کر دو[3]۔ اس کے بعد تو مشرق و مغرب کی فتوحات کا یہی اصول قرار پا گیا، اور ہر جگہ زمینیں مفتوح کسانوں کے پاس چھوڑ دی گئیں، اور خراج کا ٹیکس لگایا گیا۔ آپ امام ابویوسف کی کتاب الخراج یا ابوعبید قاسم بن سلام کی کتاب الاموال میں اس کی بیسیوں تصریحات دیکھیں

---

[1] احکام اہل الذمۃ ۱/۳۵

[2] دراصل یہ مذہبی پیشوا حکومت سے ملے ہوئے تھے اور قرون وسطیٰ کے یوروپین کلیسا کی طرح ان کو بھی بڑی بڑی جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔

[3] کتاب الخراج لأبی یوسف: ۱۵

گے۔ بلاذری کی فتوح البلدان بھی قرن اول کی ساری فتوحات میں امت کا یہی تعامل بتاتی ہے کہ فتح کے بعد زمینیں کسانوں ہی کو دے دی گئیں۔ اس میں مصر کے بارے میں آتا ہے کہ جب یونہ (فسطاط) جنگ کر کے (عنوۃ) فتح ہوا تو لوگ امیر الجیش حضرت عمرو بن العاص کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی کہ اہل شام کی طرح ان کی زمینیں بھی ان کے پاس رہنے دی جائیں، وہ خراج ادا کریں گے، ایسا ہی کیا گیا۔ اور دارالخلافۃ سے اس کی تصویب آئی[1]۔ تفصیل کے خواہش مند حضرات مذکورہ بالا ماخذ سے رجوع کر سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کی ایک اور دلیل، اور بہت طاقت ور دلیل یہ بھی ہے کہ ان علاقوں میں رہنے والوں کی دیگر غیر زرعی، منقولہ اور غیر منقولہ املاک رہائشی مکانات وغیرہ کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ ان کی ہی ملکیت باقی رہے۔ ان کو مال غنیمت کے طور پر نہیں لیا گیا۔ تو زرعی املاک کے ساتھ کوئی الگ رویہ کیوں اپنایا گیا ہوگا؟! اگر غنیمت میں ان کا مال لینا جائز ہوتا تو منقولہ اور غیر منقولہ سب املاک ہی ضبط کر لی جاتیں۔ منقولہ املاک جب نہیں لی گئیں تو یہ اس بات کی کافی دلیل ہے کہ غیر منقولہ املاک بھی نہیں ضبط کی جا سکتی تھیں۔

غرض اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اموال غنیمت کا دائرہ صرف مقاتلین یا حکومت کے مال تک محدود ہے، عوام کی املاک کو فاتح طاقت ضبط نہیں کر سکتی۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا اور اسی پر خلافت راشدہ کے دور میں عمل ہوا۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جہاں پورا قبیلہ جنگ کرتا تھا وہاں اختیار ہوتا تھا کہ سب مال ضبط کر لیا جائے۔

آج کے زمانے میں جب کہ منظم ریاست کا بڑا ارتقا ہو چکا ہے، اور ریاستی

---

[1] فتوح ص: ۲۱۶

املاک اور پرائیویٹ املاک میں واضح تقسیم کا تصور قائم ہے، اس لیے آج کے عرف میں کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے فاتح طاقت حکومتی املاک پر ہی متصرف ہونے کا حق رکھے گی۔ ان عوام کی املاک جنگ میں محفوظ مانی جائیں گی جنہوں نے جنگ میں عملاً حصہ نہیں لیا ہوگا۔

مال غنیمت کے سلسلے میں تاریخ اسلام سے متعلق غلط فہمی پر مبنی یہ اشکال ذہنوں میں بہت الجھن پیدا کرتا تھا کہ مسلمانوں نے عراق وشام وغیرہ میں ساری مفتوحہ زمینوں کو کس جواز کے تحت ضبط کرلیا تھا؟ ہر غیر جانب دارانہ نظر رکھنے والا اس سوال کا حل ضرور چاہے گا۔ حیرت ہے کہ معاصر اور ماضی قریب کے مصنفین نے جن سے بجا طور پر توقع تھی کہ وہ اعداء اسلام کے ان الزامات کی تردید کریں گے اور ان اشکالات کی وضاحت کو ضروری جانیں گے، انہوں نے یہی نہیں کہ وجاحت نہیں کی بلکہ ان کے مزید طاقت ور ہونے کا سامان فراہم کردیا۔ اس اشکال کی صحیح وضاحت کا یہی طریقہ تھا کہ تاریخی دلائل سے ثابت کیا جائے کہ عوام کی املاک مال غنیمت کے دائرے میں کبھی نہیں رہیں۔ الحمدللہ ان صفحات میں محض اللہ کی توفیق و مدد سے جو لکھا گیا ہے وہ اس غلط فہمی کی اصلاح اور مذکورہ اشکال کے حل کے لیے مکمل طور پر کافی اور شافی ہے۔

ظالمانہ جاگیرداری کا خاتمہ:

ساسانی اور بیزنطینی مقبوضات کی زرعی زمینوں کے بارے میں یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ان ظالم حکومتوں نے بدتر اخت جاگیردارانہ زمیں داری کا نظام بنا رکھا تھا۔ اسلامی حکومت کا یہ عظیم کارنامہ تھا کہ اس نے ان وسیع وعریض علاقوں میں صدیوں سے چلے آرہے ظالمانہ جاگیرداری کے نظام کو توڑ کر کاشت کاروں کو زمینیں الاٹ کیں۔ تاریخی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم فاتحین کی یہی انصاف پرور بلکہ

نجات دہندہ پالیسیاں تھیں جس کی وجہ سے ان کا مشرق و مغرب میں ہر جگہ استقبال کیا گیا، اور قیصر و کسریٰ کی فوجوں کے لیے ان کا راستہ روکنا ممکن نہیں رہا۔

ہمارے اسلامی مآخذ میں غالباً یہ پہلو ریکارڈ ہونے سے رہ گیا۔ اس وجہ سے بھی صحیح صورت واقعہ کو سمجھنے میں کمی ہوئی ہے۔ ایک جدید مورخ کہتا ہے:

> زمینیں زیادہ تر حکومت یا اس کے اہل کاروں کی ملکیت میں لے لی گئی تھیں۔ جنہوں نے ان کو بڑی سخت شرائط پر کسانوں کو دے رکھا تھا۔ فصل ہونے ہوان جاگیرداروں کو لگان چاہیے تھا۔ حکمراں وفاداروں کو جاگیروں سے نوازتے رہتے تھے۔ یہ جاگیردار حکومت کو لڑاکے فراہم کرنے کے پابند ہوتے تھے۔ بدلے میں ان کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہر طرح کا سلوک کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ فوجیوں کو بھی اسی طرح زمینیں بانٹی جاتی تھیں۔ بہت قلیل مقدار میں زمین آزاد کسانوں کے پاس تھیں۔ بادشاہ کو زمین ضبط کرنے اور تقسیم کرنے کے مطلق اختیارات تھے۔[1]

ایران کے کسانوں کے متعلق عہد ساسانی کا مستند مورخ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین لکھتا ہے:

> کسانوں کی حالت زمین داروں کے غلام کی سی تھی، ان سے ہر طرح کی بیگار لی جاتی تھی۔ مورخ امیان مارسیلیوس لکھتا ہے مزید ان کو فوجیوں کی خدمت بھی کرنی ہوتی تھی۔ وہ فوجوں کے پیچھے پیادہ بھاگے بھاگے پھرتے تھے، گویا کہ ابدی غلامی ان کی قسمت میں لکھی ہے (ایران بعہد ساسانیان ص ۴۲۴ باختصار)۔

---

[1] ملاحظہ ہو:

Byzantine - Church, Society and Civilization seen through contemporary eyes, by: Deno John Geanokoplos (chicago press 1984) P. 231

ایسی صورت حال میں اگر ابتداءً زمینیں بحق حکومت لے لینے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہوتو بھی وہ زمینی اصلاحات کے مقصد سے کیا گیا ایک قدم رہا ہوگا۔ اور اس کا پورا جواز تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ بعد میں بہر حال یہ زمینیں کسانوں ہی کی قرار پائیں۔

مال غنیمت کے سلسلے میں قانون کی دوسری بنیاد:

قرآن میں مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں عام اصول یہ بتایا گیا ہے کہ جو مال فوجیں لڑ کر لیں اس کے چار حصے مجاہدین ہی میں تقسیم کر دیے جائیں گے، اور ایک حصہ عام حکومتی اور قومی ضروریات کے لیے رکھا جائے گا۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ	اور جان لو کہ جو مال غنیمت بھی تم کو ملا
فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي	ہے اس میں پانچواں حصہ اللہ، اس کے
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ	پیغمبر، پیغمبر کے اقربا اور یتیموں اور
وَابْنِ السَّبِيْلِ (انفال ٤١).	مسکینوں کے لیے ہوگا۔

مگر خود رسول اللہ کا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ آپ کو اسلامی ریاست کے حاکم اعلی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالی کی طرف سے مختلف مصالح کی بنیاد پر اس کے خلاف کرنے کی بھی اجازت تھی۔ یہ ایک فقہی بحث ہے، ہم یہاں اس کی بنیادوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ:

۱- آپ نے فتح مکہ میں کچھ بھی مال غنیمت نہیں لیا۔

۲- پھر ہوازن کا مال ہاتھ آنے کے بعد آپ نے اس کو ایک مدت تک نہیں بانٹا۔ آپ نے خود یہ منشا بیان فرمایا کہ میں انتظار کر رہا تھا اگر ہوازن کے لوگ آجائیں تو میں ان کو ان کا مال واپس کر دوں۔ تو اگر وہ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے آجاتے تو ان کو مال اور قیدی دونوں واپس کر دیے جاتے۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ آپ اس سلسلے میں اختیار رکھتے تھے اور یہ لازمی نہیں تھا کہ مذکورہ تقسیم کی بنیاد پر مال غنیمت کو

ضرور بانٹا جائے۔ پھر جب ہوازن کے لوگ آئے اور مطیعانہ رویے کا اظہار کیا تو آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ چاہیں تو مال واپس لے لیں اور چاہے تو قیدیوں کو چھڑا لیں[1]یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مالِ غنیمت کے سلسلے میں مطلق اختیارات تھے۔ اگر مالِ غنیمت تقسیم کرنا لازمی ہوتا تو آپؐ ان کو یہ اختیار نہیں دے سکتے تھے۔

۳- پھر آپ نے ہوازن کے مالِ غنیمت میں سے مجاہدین میں سے اکثر کو کچھ بھی نہیں دیا تھا۔ اور دیا تھا تو کس کو؟ مولفۃ القلوب کو۔ یہ لوگ میدان کے باہر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے[2]۔ بلکہ ان میں سے بعض (صفوان ابن امیہ کے ماں جائے بھائی کلدۃ ابن حنبل) کی دلی تمنا تھی کہ مسلمانوں کو شکست ہوجائے[3]۔ اور جنگ میں حصہ تو درکنار ان میں سے بڑی تعداد تو اس وقت تک مسلمان بھی نہیں ہوئی تھی[4]۔

ہمارے بعض سیرت نگاروں نے اپنے اس خیال کی بنا پر کہ مالِ غنیمت کی مجاہدین میں تقسیم مستقل قانون ہے، یہ تاویل کی ہے کہ مولفۃ القلوب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کے خمس یعنی اس پانچویں حصے میں سے دیا تھا جو حکومت کا حصہ ہوتا ہے[5]۔ حافظ ابن حجر نے قرطبی کے حوالے سے اس رائے کو نقل کیا ہے اور اس کی کمزوری کو واضح کیا ہے، اور حافظ ابن القیم کی بھی یہ رائے لکھی ہے کہ حنین میں مجاہدین میں مالِ غنیمت تقسیم نہیں کیا گیا تھا[6]۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مذکورہ تاویل واقعے

---

۱ بخاری: ۴۳۱۹

۲ البدایہ والنہایہ ۴/۳۷۷ بحوالہ موسیٰ ابن عقبہ

۳ صحیح ابن حبان ۱۱/۹۵ ومسند ابو یعلیٰ ۳/۳۸۸

۴ طبقات ابن سعد: ۲/۱۵۰

۵ مولانا عبدالرؤف داناپوری، اصح السیر

۶ فتح الباری ۸/۴۸

اور صحیح روایات کے بالکل خلاف ہے۔ بخاری و مسلم کی دسیوں روایات میں اس کی تصریح ہے کہ سارا مال قریش میں اور مولفۃ القلوب میں بانٹ دیا گیا اور انصار کو کچھ بھی نہیں دیا گیا۔ حضرت انس کی روایت میں ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلقاء(مکہ کے نومسلموں)اور مہاجرین کو دیا اور انصار کو نہیں دیا[1]۔ حضرت انس ہی کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: حنین کے دن حضورؐ کو بڑا مال غنیمت ملا، آپؐ نے سب مہاجرین اور طلقاء میں تقسیم کر دیا اور انصار کو کچھ بھی نہیں دیا۔ کسی نے پوچھا آپ موجود تھے حضرت انس نے جواب دیا: میں کہاں جاتا؟[2] (اگرچہ اکثر روایات کے مطابق مہاجرین کو بھی کچھ نہیں دیا گیا تھا، اور یہی صحیح ہے۔) ۔حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم کی روایت ہے: حنین کا مال غنیمت ملا تو حضورؐ نے مال مؤلفۃ القلوب میں تقسیم کر دیا اور انصار کو کچھ نہیں دیا[3]۔ حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش اور اعراب قبائل کو بہت دیا اور انصار کو کچھ نہیں[4]۔ مزید یہ کہ ان مؤلفۃ القلوب کی تعداد مختلف مآخذ سے اگر جمع کی جائے تو بہت زیادہ نکلے گی چالیس تو صرف ابن حجر نے ذکر کیے ہیں۔ اور ان کو دیا ہوا مال یقیناً خمس سے کہیں زیادہ نکلے گا۔

۴-اوپر ذکر کی ہوئی ان مثالوں کے علاوہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف جنگوں میں تقسیم کے وقت (یقیناً اللہ کے دیے ہوئے اختیار ہی سے) اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ اسی گنجائش کی بنا پر خیبر میں آپ نے یمن اور حبشہ سے آنے والے کچھ ایسے لوگوں کو جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے باقاعدہ مجاہدین

---

1. بخاری ۴۳۳۳
2. بخاری ۴۳۳۷، مسلم ۱۰۵۹،
3. بخاری ۴۳۳۰
4. مسند احمد ۱۱۳۲۲

کے برابر حصہ دیا[1]۔ بخاری نے اس حدیث کو خمس کے حکومت کے عام مصالح میں خرچ ہونے کے باب میں نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ حدیث کے الفاظ "أسهم لنا" بتا رہے ہیں کہ ان حضرات کو خمس میں سے نہیں بلکہ مجاہدین کے حصے (اربعۃ اخماس) میں سے دیا گیا تھا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ امام بخاری کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ جب (اربعۃ اخماس) میں امام (حاکم) اپنی صواب دید سے فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے تو خمس میں بدرجۂ اولی اس کو یہ اختیار ہوگا۔

اور اسی اختیار کی بنا پر کبھی آپؐ جنگ کے موقع پر "نفل" کا اعلان فرما دیتے تھے، یعنی کسی کو اس کے کارناموں کی بنا پر الگ سے انعام کے طور پر زائد حصہ دیتے تھے۔ نیز اسی کی بنا پر آپؐ نے قاتل کے لیے مقتول کے ساز و سامان "سلب" کا بھی فیصلہ فرمایا:

سورۂ انفال کی پہلی آیت:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنفَالِ قُلِ الْأَنفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ.	یہ تم سے غنیمت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، کہہ دو: مال غنیمت (کا اختیار) اللہ اور رسول کا ہے۔

ہی مال غنیمت کے سلسلے میں اس کی گنجائش دیتی ہے کہ وہ مجاہدین میں تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن میں "اللہ والرسول" کی تعبیر سے بعض مقامات پر حکومت مراد ہے، اس لیے کہ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں سارے حکومتی اختیارات اللہ تعالی نے جمع کر دیے تھے۔

اسی لیے اگر فوجوں کو لڑے بغیر مال ہاتھ آجائے، تو قرآن نے حکم دیا کہ وہ صرف حکومت کا ہوگا۔

---

1 بخاری ۳۱۳۶

وَمَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ أَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (الحشر ٦-٧)

جو مال دیا ہے اللہ نے فے کے طور پر اپنے رسول کو، اس طرح کہ تم نے اس کے لیے اپنے اونٹ گھوڑے نہیں دوڑائے، اللہ اپنے رسول کو جس پر چاہتا ہے (ایسے ہی) غلبہ بخشتا ہے۔ سو جو مال اللہ اپنے رسول کو فے کے طور پر دے تو وہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کے اہل قرابت اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔

اس آیت نے بتایا کہ جو مال لڑ کر نہ حاصل کیا جائے وہ کل کا کل دینی ضرورتوں اور فلاحی امداد میں خرچ کیا جائے گا۔ اس کو مجاہدین میں بانٹنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

آں حضرت کے اس اسوے اور سورۂ انفال کی پہلی آیت کی روشنی میں غور وفکر کے بڑے امکانات ہیں۔ عہد نبوی میں فوجیں رضا کار ہوا کرتی تھیں، اسلحہ کا انتظام خود مجاہد کرتا تھا، غذائی انتظامات اسی کے ذمے تھے، اور سفر کے وسائل سب اپنے خرچ سے مہیا کرنے پڑتے تھے۔ آج کی تنخواہ اور اعلیٰ مراعات یافتہ (Highly Priveleged) فوجوں کے لیے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے گا۔ اور غور وفکر کے اس عمل میں جدید عام انسانی عرف کا بھی خیال رکھا جائے گا۔

فصل پنجم

۲۔ جنگی قیدی

جنگی قیدیوں کے متعلق رسول اللہؐ نے نہایت نرمی اور حسن سلوک کے احکام دیے تھے۔ قرآن نے جنت کے اعلیٰ مقامات تک پہنچنے والوں کی یہ صفات بیان کی ہیں:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا (الانسان ۸)	اور یہ لوگ کھانا کھلاتے تھے، کھانے کی محبت کے باوجود، مسکین کو، اور یتیم کو اور قیدی کو۔

آنحضرتؐ سے اس سلسلے میں بڑی نصیحتیں مروی ہیں۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں آپؐ نے صحابۂ کرام کو حسن سلوک کی اس طرح تاکید کی کہ لوگوں نے قیدیوں کو اپنے سے اچھا کھانا کھلایا اور خود موٹے جھوٹے پر بسر کی۔ ایک صاحب کا قیدی انسانیت کا یہ نمونہ دیکھ کر شرما گیا کہ گھر والے غربت کی وجہ سے کھجور پر گزارہ کرتے ہیں اور قیدی کو روٹی سالن کھلاتے ہیں۔ غیرت مند قیدی نے کہا بھی کہ یہ کیوں؟ میں کھجور کھالوں گا تم روٹی سالن لو۔ مگر مسلمان نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ہمارے رسولؐ نے قیدیوں کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید کی ہے[1]۔

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں مسلمانوں کے لیے اس وقت

---

[1] سیرت ابن ہشام: ۶۷۵/۱

تک قیدی بنانے کی اجازت نہیں تھی جب تک اچھی طرح دشمن کو مغلوب نہ کر لیا جائے۔ غزوۂ بدر میں اگرچہ مشرکین کو میدان میں شکست ہوگئی تھی لیکن ان کا زور ٹوٹا نہیں تھا۔ وہ بھاگ ضرور گئے تھے لیکن یہ ان کی مکمل شکست نہیں تھی۔ کسی کو بھی یہ گمان نہیں تھا کہ ان کا زور بالکل ٹوٹ گیا ہے اور اب ان میں دشمنانہ کارروائیاں کرنے کی سکت نہیں رہی۔ مکہ والوں نے جب میدان چھوڑنا شروع کیا تو مسلمانوں نے اس خیال سے کہ بھرپور فدیہ ملے گا گرفتاری شروع کر دی۔ اس وقت ایسا تو کوئی انتظام تھا ہی نہیں جس کے تحت دشمن کے مقاتلین کو خاتمۂ جنگ تک قید رکھا جا سکے۔ قرآن مجید میں سخت تنبیہ آئی کہ دشمن کی طاقت کا خاتمہ کرنے سے پہلے قیدی بنا لینے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اس سے اگرچہ تم کو فدیہ کی شکل میں فی الوقت کچھ مل جائے گا مگر دشمن کی طاقت برقرار رہے گی۔ تم کو پہلے میدان جنگ میں اچھی طرح فوجوں کا صفایا کرنا چاہیے تھا، تاکہ دشمن کا زور بالکل ٹوٹ جائے۔ اس موقعے پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ	کسی نبی کے لیے (دشمن کا) اچھی طرح
حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ	خون بہا لینے سے پہلے قیدی بنانا
عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ	مناسب نہیں ہے۔ تم دنیا کا فائدہ
وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. (الانفال ۶۷)	چاہتے تھے، اوراللہ آخرت کا۔

قرآن میں اس سے پہلے ہی الگ سے یہ حکم دیا جا چکا تھا کہ منکرین حق سے جب جنگ ہو تو پہلے اچھی طرح خون بہا کر دشمن کو زیر کر لیا جائے، اس کے بعد قید کیا جائے۔ اور ان قیدیوں کے بارے میں یہ اصولی حکم بطور قاعدۂ عامہ دے دیا گیا تھا کہ ان کو احسان کر کے چھوڑ دیا جائے یا ان کے بدلے میں اپنے قیدی رہا کرائے جائیں یا کچھ مالی معاوضے کے عوض ان کو رہا کر دیا جائے۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ	جب ان منکرین حق سے مڈبھیڑ ہو تو پہلے

الرِّقَابِ حَتّٰى إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ	قتل کرو، یہاں تک کہ جب تم ان کو بالکل
فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا	مغلوب کرلو تو قید کرو، پھر یا تو احسان
فِدَاءً (محمد ۴)	کرکے چھوڑ دو یا فدیہ لے کر رہا کردو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ انفال کی مذکورہ بالا آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مسلمان قیدیوں کا فدیہ نہ لیں بلکہ ان کو قتل کر دیں۔ اور نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ فدیہ لینا دنیا طلبی ہے۔ بلکہ جیسا کہ ہم آگے تفصیل سے واضح کریں گے کہ سورۂ محمد کی آیت نے واضح کیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو (بلا کسی دوسرے موجب قتل جرم کے) قتل کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ قیدیوں کے لئے تو صرف دو ہی امکانات ہیں (۱) یا تو احسان کرکے چھوڑ دینا (۲) یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا۔

لہٰذا جب خود قرآن جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کرنے کو کہہ چکا ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ فدیہ لینا دنیا طلبی ہے۔ قرآن نے جس چیز کو دنیا طلبی کہا ہے وہ مسلمانوں کی یہ غلطی تھی کہ انہوں نے دشمن کو اچھی طرح نقصان پہنچائے بغیر فدیہ کی طلب میں گرفتاریاں شروع کردیں۔ اس نکتے کو ملحوظ رکھنے سے ہم جیسے طالبِ علم کا ایک بڑا اشکال حل ہوتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دشمن کی قوت کے خاتمے سے پہلے قیدی بنانے کی ممانعت کا مقصد مکمل طور پر اس کو زیر کرلینا ہے۔ لہٰذا اگر قیدی بنانے کا نتیجہ یہ نکلے کہ قیدی چھوٹ کر دوبارہ لڑنے کو آئیں تو یقیناً یہی حکم ہوگا اور ایسی صورت میں قیدی بنانا منع ہوگا۔ لیکن اگر کسی ملک کے لیے قیدیوں کو اس وقت تک روکے رکھنے کا انتظام ہو جب تک دشمن مکمل طور پر زیر نہ کرلیا جائے تو اس کے لیے اس کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ وہ دشمن جنگ جوؤں کو قید بنائے اور اس وقت تک قید کرکے رکھے جب تک جنگ نہ ختم ہو جائے۔

فصل ششم

٦۔ غلامی کا مسئلہ

غلامی یقیناً کسی بھی انسان کے لئے ایک المناک حقیقت ہے۔ جو عہد جدید تک انسانی دنیا کے بیشتر علاقوں میں اور کہیں کہیں اپنی بدترین ہولناک ظالمانہ شکلوں میں باقی رہی۔ اسلام کے قانون جنگ کے سلسلے میں جو سوالات سب سے زیادہ ذہنی الجھن کے سبب بنتے ہیں ان میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ اسلام ہمدردی انسان کے اپنے عام مزاج اور نوع انسانی کی تکریم کے اعلانات کے ساتھ کیسے یہ روا رکھتا ہے کہ کسی انسان کو اس درجہ مجبور بنائے کہ وہ اپنی ذات تک کے بارے میں کسی فیصلہ کا اختیار نہ رکھتا ہو اور اس کو خریدا اور بیچا جا سکے؟

اسلام کی غلامی مغرب والی غلامی نہیں ہے:

اس سوال کا جواب جاننے سے پہلے ایک وضاحت کی ضرورت ہے۔

ہمارے زمانے کے ممتاز محقق سرآمد علماء اسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم وطال بقاؤہم نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''تکملہ فتح الملہم'' میں اس سلسلے میں ایک بڑے اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے یہاں جو غلامی تھی وہ اس غلامی سے بالکل الگ چیز تھی، جو یونانیوں، رومیوں بلکہ ماضی قریب تک مغرب میں پائی جاتی تھی۔ مشہور مستشرق گستاؤلیبان نے اپنی کتاب تمدن عرب میں اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ عربوں کی غلامی کے تذکرے کے وقت یونان وروم بلکہ ماضی قریب کی یورپ میں پائے جانے والے ان غلاموں کی طرف ذہن چلا جاتا ہے جو نہ پیٹ بھر غذا پاتے

تھے نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا، ان کے ساتھ بلا مبالغہ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا، گستاولیبان کہتا ہے کہ عربوں کی غلامی کو اس پر قیاس کرنا سنگین غلط فہمی کا باعث ہے۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ مغربی اقوام کی خونچکاں تاریخ سے جو کچھ بھی واقفیت رکھتا ہوگا، غلامی کا نام سنتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ ایک منظر رومیوں کے اعلٰی طبقات کے محلات کا سامنے آتا ہے کہ دعوت میں مہمان آرہے ہیں اور ایک میدان میں چاروں طرف محفوظ کرسیوں پر بٹھائے جارہے ہیں۔ پنجرے میں کئی دن کا بھوکا شیر غضبناک ہورہا ہے، اب ایک غلام لایا گیا اور میدان میں کھڑا کر کے اس پر شیر چھوڑ دیا گیا، دہاڑتے ہوئے شیر جھپٹا، زوردار تالیاں بجیں، قہقہوں کے شور میں غلام نے جان دے دی۔

Gladiators کا ایک کھیل ہوتا تھا، اس کھیل کے لیے باقاعدہ اسٹیڈیم ہوتے تھے۔ امراء کے غلاموں کو اس کھیل کے ذریعے تقریبات میں مہمانوں کے لیے تفریح کا اسطرح سامان کرنا ہوتا تھا کہ کوئی غلام تلوار لے کر میدان میں کودتا اور کسی درندے سے مقابلہ کرتا تھا، شیر جیتے یا غلام، مگر امراء کا طبقہ محفوظ دونوں صورتوں میں ہوتا تھا۔

پھر ابھی آخری دور میں مغرب نے استعمار کے زمانے میں غلامی کے نام پر انسانوں کے ساتھ جس درندگی کا نمونہ قائم کیا ہوا تھا اس کی تفصیلات کے لیے تاریخ کی کتابوں کے علاوہ صرف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کافی ہے۔ اس بربریت کی خیالی تصویریں آج بھی یورپ کے میوزیموں میں Display پر رکھی ہوئی ہیں۔ راقم کو برٹش میوزیم میں ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ سیکڑوں سیکڑوں غلاموں کو زنجیروں میں قید کر کے سمندری جہازوں میں اس طرح ٹھونس کر امریکہ اور افریقہ سے یورپ لایا جاتا تھا کہ ان میں سے بسا اوقات آدھے راستے میں مر جاتے، اور ان کے "انسانیت

نواز'' مالکوں کو کچھ فکر نہ ہوتی تھی۔ مغرب کی اسی تاریخ کا نتیجہ ہے کہ غلامی کا نام سنتے ہی نگاہوں کے سامنے کچھ وحشت ناک منظر سامنے آنے لگتے ہیں۔

دوسری طرف اسلامی معاشرے میں غلام بلا مبالغہ ایک با عزت کردار ادا کرتے تھے۔ وہ یا تو ملازموں کی حیثیت میں ہوتے تھے یا اہل حرفہ میں۔ اور آخر میں تو ان کا خاص کردار حکومت اور فوج کی با عزت اور با تنخواہ ملازمت ہوتی تھی۔ یہاں میں پھر کسی اسلامی ماخذ کے بجائے بریٹانیکا میں غلامی کے موضوع پر موجود مقالے اور آج کل کی مقبول عام انسائیکلو پیڈیا وکی پیڈیا کا حوالہ دوں گا[1]۔

اسلام اور غلامی:

اوپر گزر چکا ہے کہ قرآن مجید نے اسیران جنگ کے بارے میں حکم دیا ہے کہ ان کو یا تو فدیہ کے بدلے یا احسان کے طور پر یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ اور یہی اسلام کا اصل قانون ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی بعض جنگوں میں مفتوح قبائل کے قیدی مردوں کو غلام اور قیدی عورتوں کو باندی بنایا۔ سو اس کا سبب کیا ہے؟ اور یہ کس قانون یا رخصت کے تحت؟ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

قرآن نے غلامی کو اسلام کے اصل قانون جنگ سے خارج کر دیا ہے:

یہاں اس حقیقت کو لازمی طور پر پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ قرآن نے غلامی کا بحیثیت ایک موجود حقیقت کے تذکرہ تو کیا ہے۔ لیکن اس کے قانون جنگ میں (جس کو اس نے تفصیل سے بیان کیا ہے) غلامی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ آپ

---

[1] اس سلسلے میں ملاحظہ ہو مندرجہ ذیل لنک:

http://en.wikipedia.org/wiki/History_of_slavery#Slavery_in_the_Arab_World

غور کیجیے تو اس نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جنگی قیدیوں کے بارے میں مسلمانوں کے لیے اصلاً صرف دو امکانات ہیں۔

۱- احسان کرتے ہوئے چھوڑ دینا۔

۲- یا فدیہ لے کر یا اپنے قیدی کے بدلے میں (جو فدیہ کی ہی ایک شکل ہے) چھوڑ دینا۔

قرآن کے الفاظ میں غور کیجیے:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (محمد ۴)	جب ان منکرین حق سے مڈبھیڑ ہو تو پہلے قتل کرو، یہاں تک کہ جب خوں ریزی کے نتیجے میں وہ بالکل مغلوب ہو جائیں تو قید کرو، پھر یا تو احسان کر کے چھوڑ دو اور یا فدیہ لے کر رہا کر دو۔

اس آیت میں اصل غور طلب لفظ ''اِمّا'' ہے جس کا اردو ترجمہ ''یا تو'' سے کیا گیا ہے۔ علماء جانتے ہیں کہ عربی زبان میں جب کسی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے امکان کو لفظ ''اِمّا'' کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے تو اس میں ان چیزوں کے علاوہ کوئی اور امکان نہیں ہوتا۔ عربی زبان کی رو سے یہ بات بالکل قطعی ہے کہ ''اِمّا'' تخییر ''یعنی دو چیزوں (Alternatives) کے درمیان اختیار دینے کے لیے اس طور پر ہی آتا ہے کہ کلام میں مذکور امور کے علاوہ کسی اور چیز پر عمل متکلم کے منشأ کے خلاف ہوتا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ حضرت حضرت سعد بن عبادہ کے یہاں گئے۔ واپسی میں حضرت سعد نے آپ کی سواری کے لیے گدھا حاضر کیا اور اپنے بیٹے قیس سے کہا حضرت کو گھر تک پہنچا کے آؤ۔ قیس ادباً پیدل چلے، آپؐ نے کہا: آؤ بیٹھ جاؤ، انہوں نے جھجک دکھائی اور اسی میں سعادت سمجھی کہ پیدل ہی پیچھے پیچھے چلیں، آپؐ نے فرمایا: **اِمّا اَن ترکب واما اَن تنصرف** ۔ یعنی یا تو

سوار ہو جاؤ یا واپس جاؤ۔ آپ غور کریں تو اس عبارت کا واضح مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے ان دو کے علاوہ تیسری بات کی اجازت نہیں ہے۔

ایک اور روایت کے الفاظ پر غور کیجیے: حضرت عمر بازار گئے تو دیکھا کہ حاطبؓ بازار سے کافی کم بھاؤ میں منقٰی بیچ رہے ہیں۔ حضرت عمر نے محسوس کیا کہ اس سے عام لوگوں کا نقصان ہو رہا ہے، اس لیے فرمایا:

اما ان تزید فی السعر واما أن ترفع من سوقنا

یا تو قیمت بڑھاؤ، یا بازار سے سامان اٹھالو۔

اس جملے میں غور کیجیے کیا حضرت عمر کی مراد میں اس کی کوئی گنجائش ہے کہ حاطبؓ ان دونوں باتوں کے علاوہ کچھ اور کریں؟ عربی زبان میں ''اِمّا'' کا یہی مفہوم ہوتا ہے کہ متکلم کی بتلائی ہوئی دو یا چند باتوں میں سے ہی کوئی ایک کام کر لیا جائے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی سے یہ کہیں کہ ''أرجوك أن تزورني إما يوم الخميس واما السبت'' (تم یا تو میرے پاس جمعرات کو آنا یا پھر سنیچر کو)۔ اس صورت میں آپ اس کو اختیار دے رہے ہیں کہ وہ چاہے جمعرات کو آئے یا سنیچر کو۔ دونوں دِنوں میں سے وہ جس دن بھی آ جائے وہ آپ کی بات ماننے والا ہی قرار پائے گا۔ لیکن اگر وہ جمعہ کو آ جائے تو یقیناً حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔ اکیلی یہی مثال مسئلے کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

بعض بزرگوں نے یہاں ''اما'' کا مفہوم ''تخییر لا الی جمع'' قرار دیا ہے یعنی سارے اختیارات Alternatives پر بیک وقت عمل کرنے سے منع کرنا۔ لیکن یہ بات بے اصل ہے۔ ہم نے ابھی اوپر جو مثال دی ہے اس سے کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ آپ مخاطب سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم جمعرات اور سنیچر دونوں دن نہ آنا بس ایک دن آنا۔ اب اگر وہ جمعہ کو آ جائے تو کوئی حرج نہیں۔

بالکل یہی بات مذکورہ آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ قیدیوں کے بارے میں صرف دو اختیارات ہیں جن میں سے کسی ایک پر عمل کو لازم ہے۔ "یا تو احسان کر کے چھوڑ دو، یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں اس کا امکان ہی کیا ہے کہ فدیہ اور احسان میں جمع کیا جائے۔ قیدی کو یا فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا یا مفت احسان کر کے۔ دونوں بیک وقت جمع ہو ہی کہاں سکتے ہیں؟ لہٰذا یہاں اِمّا کو "کـخییر لاالیٰ جمع" کے معنیٰ میں کہنا ایک بے معنیٰ بات ہوئی۔

اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح اور بے غبار ہوگئی کہ قرآن کی اس آیت میں جنگی قیدیوں کے لیے صرف ان مذکورہ دونوں باتوں (یعنی بلا فدیہ یا فدیہ پر رہائی) کے علاوہ کسی کی گنجائش نہیں ہے۔

رسول اللہؐ کا عام عمل غلام بنانا نہیں تھا، غلام صرف استثنائی طور پر مجبورا بنایا جاتا تھا:

اسی طرح حدیث کے ذخیرے میں میرے مطالعے کی حد تک غلام بنانے کا تذکرہ بطور قانون نہیں ہے۔ ہاں آپؐ نے کچھ لوگوں کو غلام بنایا ہے۔ لیکن آپ کے زمانے کے غلاموں کی اکثریت آپؐ یا مسلمانوں کے بنائے ہوئے غلاموں کی نہیں تھی، بلکہ اکثر وہ غلام تھے جو پہلے سے چلے آ رہے تھے۔ خود آں حضرتؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے یہ بات بالکل طے ہو جاتی ہے کہ قیدیوں کے بارے میں آپ کا اصل دستور احسان کے طور پر رہائی یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا ہی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جنگوں میں اصلاً اسی پر عمل کرتے تھے۔ آپ نے اکثر جنگوں میں قیدیوں کو فوراً احسان کے طور پر آزاد کر دیا، اور اگر روکا تو اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے۔ اور کبھی مالی فدیہ لیکر ان کو آزاد کر دیا۔

بدر میں کچھ کو احسان کے طور پر اور اکثر سے فدیہ لے کر آزاد کیا۔ صلح حدیبیہ

سے پہلے مکے کے ۸۰ لڑاکوؤں کے دستے نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور سب کے سب گرفتار ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا فدیہ چھوڑ دیا۔[1] مکہ آپؐ نے جنگ کرکے فتح کیا، مگر سب چھوڑے گئے۔ عربوں کے نہ جانے کتنے قبیلے مفتوح ہوئے، اور مسلمان فوجوں نے کسی کو غلام نہیں بنایا۔

ہوازن کے چھ ہزار قیدی پکڑے گئے، ہوازن شدید دشمنی رکھتے تھے، بڑے جوش وخروش سے لڑے۔ پھر بھی آپؐ تقریباً دو ہفتے تک انتظار کرتے رہے کہ وہ اطاعت کا اظہار کریں اور اپنے قیدی چھڑا لیں۔ ایسے دشمن کی طرف سے اطاعت کے اظہار سے پہلے اس کے قیدی چھوڑنے کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر جنگ کے لیے اس کو موقعہ دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے لیے خطرہ بنے۔ اسی انتظار میں کہ ان کی طرف سے اطاعت کا اظہار ہو آپ نے دو ہفتے تک مال غنیمت اور قیدی نہیں بانٹے۔ آخر جب وہ نہیں آئے تو قیدی لوگوں میں بانٹ دیے گئے۔ قیدیوں کو روکے رکھنے کا اور کوئی انتظام نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر تقریباً دو ہفتے بعد ہوازن کے کچھ ذمے دار آئے اور آکر مطیعانہ رویے کا اظہار کیا، اور عفو وکرم کی درخواست کی کہ جانیں اور مال بخش دیے جائیں۔ آپؐ سب کچھ بانٹ چکے تھے، اور ساتھ میں صرف قدیم تربیت یافتہ مسلمان نہیں تھے، بلکہ عیینہ بن حصن اور عباس بن مرداس جیسے غیر تربیت یافتہ بدو سردار بھی تھے، جو مال غنیمت کے حریص تھے۔ آپؐ نے ہوازن کے لوگوں سے کہا: میں نے تمہارا بڑا انتظار کیا، سچی بات کہہ دوں کہ اب میری کچھ مجبوریاں ہیں، تم کو اندازہ ہے کہ میرے ساتھ اس وقت کس قسم کے لوگ ہیں۔ تم مال یا اپنے قیدیوں میں سے کسی ایک چیز کو لے جاؤ۔ (اختاروا احدی الطائفتین اما السبی واما المال۔ ایک چیز لے لو، یا قیدی یا مال)۔ انہوں نے

---

[1] صحیح مسلم ۱۸۰۸

اپنے قیدیوں کو چھوڑنے کی درخواست کی۔ آپ قیدیوں کو بطور غلام بانٹ چکے تھے۔ پھر بھی آپ نے لوگوں سے سفارش کر کے ان کو چھڑا کر دیا[1]۔

اس کے علاوہ حدیث کے ذخیرے میں قیدیوں کی رہائی کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ اسی طرح یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خلفاء راشدین کے دور میں اور بعد میں بھی مسلمانوں نے لوگوں کو پکڑ کر غلام نہیں بنایا۔ نہایت کثیر تعداد میں علاقے فتح ہوئے مگر مسلمانوں نے نہایت ہی قلیل تعداد میں اور بالکل استثنائی طور پر مجبوری کے تحت ہی کسی کو غلام بنایا ہے۔ مصر، شام، عراق، افریقہ، آرمینیا اور ایران کی فتوحات میں بے شمار علاقے یا گاؤں بزور شمشیر فتح ہوئے۔ ان کے لاکھوں لوگوں کو (خصوصاً فوجیوں اور حکومتی عملے کو) غلامی میں لے لینے کا امکان بھی تھا، اور زمانے کے عرف اور مسلّم بین الاقوامی قانون کے تحت جواز بھی۔ اگر مسلمان ان سب کو غلام بنا لیتے تو ان پر تنقید و ملامت بھی نہ ہوتی۔ مگر مسلمانوں نے کسی کو غلام نہیں بنایا۔ آپ تاریخ کی کتابوں (مثلاً فتوح البلدان) کو دیکھتے جائیے، دسیوں مثالیں ملیں گی کہ جو علاقے فتح ہوتے تھے حضرت عمر کا فرمان پہنچتا کہ لوگوں کے اوپر جزیہ لگا دو اور زمین پر خراج۔

لہٰذا رسولؐ اللہ کے اس عمومی عمل اور اسلامی تاریخ اور خصوصاً صدرِ اول کے تعامل سے پتہ چلتا ہے کہ اصل اسلامی قانون قیدیوں کی گرفتاری کے بعد احسان کے بطور رہائی یا فدیہ لے کر چھوڑنا ہی ہے۔ غلامی ایک نہایت نادر استثناء کے علاوہ کچھ نہیں۔

غلامی ایک مجبوری کا حل تھی نہ کہ مستقل دستور:

قرآن سے پہلے دنیا کے کسی قانون میں ہم کو غلامی کی ممنوعیت یا جنگوں میں

---

[1] صحیح بخاری: ۲۳۱۹، ۲۶۰۸

غلام بنانے کی مذمت نہیں ملتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدر اول کے مسلمانوں نے جو کچھ غلام بنائے ہیں اس پر غور کرنے سے پہلے ایک تاریخی حقیقت کی طرف ذرا نظر کر لیجیے۔ اس زمانے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ جب تک دشمن مطیع نہ ہو اور جنگوں کا سلسلہ جاری ہو اس وقت بھی اس کے قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ اس سے تو دشمن کو کمک ملتی رہے گی۔ یہ ایک عملاً ناممکن بات تھی۔ دوسری طرف یہ بھی واضح رہے کہ تمدنی حالت نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ قیدیوں کے لیے جیل وغیرہ کا انتظام ہو اور ان کے مالی بوجھ کو برداشت کرنا حکومت کے لیے آسان ہو۔

لہذا غلامی دراصل اس مجبوری کا ایک نظام تھی نہ کہ اسلام کے قانون جنگ کا کوئی مستقل حصہ۔ اس زمانے میں غلامی ایک تکلیف دہ لیکن واقعاتی حقیقت تھی جس سے مفر نہیں تھا۔ اسلامی شریعت نے اس کو اپنے اصل قانون سے خارج کیا، اور جنگی قیدیوں کے بارے میں اصل قانون یہی بتایا کہ ان کو احساناً یا فدیہ لے کر رہا کیا جائے یا کسی قیدی کے بدلے میں چھوڑا جائے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ دشمن تو غلام بنانے کا دستور رکھے اور مسلمان اس کے قیدیوں کو آزاد کر دیں؟ ایسا کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کے جو آدمی دوسروں کے یہاں قید ہو کر جاتے غلام بنائے جاتے۔ اب اگر مسلمان اعلان کر دیتے کہ وہ غلام بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہی نکلتا کہ ان کے لوگوں کی بڑی تعداد غلام بنالی جاتی اور دشمن کو انکی طرف سے یہ بالکل خطرہ نہیں ہوتا کہ اس کے آدمی بھی غلام بنائے جا سکتے ہیں۔

اس لیے جو نہایت قلیل تعداد میں غلام بنائے گئے وہ حالات کی اسی مجبوری کے تحت ایک استثنائی عمل تھا، اسلام کا اصل قانون نہیں۔

آج کے زمانے میں غلامی کا جواز نہیں:

بہر حال اس تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غلامی کا دستور اسلام کے قانون

جنگ کا حصہ نہیں ہے۔ اسلام نے اس کا کوئی مستقل جواز نہیں رکھا ہے۔ ابتدائی زمانے میں جنگی قیدیوں کو روکے رکھنے کی اس کے علاوہ اور کوئی شکل نہیں تھی۔ اس لیے اس پر عمل کیا گیا تھا۔ یہ ایک مجبوری کا اور استثنائی عمل تھا۔ جدید دور میں جب کہ تمدنی ارتقا نے اس مجبوری کا حل نکال دیا ہے اسلام کا اصل حکم یعنی قیدیوں کو جب تک ضروری ہو قید رکھنا، اور اس کے بعد بدلہ لے کر یا یوں ہی چھوڑ دینا ہی اسلامی قانون ہوگا "فشدوا الوثاق، فإما منا بعد وإما فداءً"۔

ہاں اگر ویسی ہی صورت حال پھر عود کر آئی جیسی قدیم زمانے میں تھی (یا کوئی اور اسی درجے کی مجبوری ہوئی) تو اسی استثنائی عمل کو پھر جواز حاصل ہو جائے گا۔

غلاموں کے حقوق:

پھر اسلام میں غلاموں کو جو قانونی حقوق دیے گئے، اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی جو دینی تعلیمات دی گئیں وہ آج بھی محاسن اسلام کی تصویر ہیں۔ ان میں یہ بھی ہے کہ غلام آزاد کرنا نہایت اعلیٰ درجے کی نیکی قرار پائی۔ اس کی بڑی ترغیب دی گئی۔ اور متعدد موقعوں پر اس کو قانونی طور پر (کفارے کے طور پر) واجب قرار دیا گیا۔

مکاتبت کا قانون جس کے ذریعے ہر غلام اپنے کو آزاد کرا سکتا تھا:

غلامی کے سلسلے کا ایک اہم قانون ایسا بنایا گیا جس کی رو سے جو ہوشیار غلام اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہے وہ ایسا کر سکتا تھا بلکہ حکومت اپنے طور پر اس کی اس کوشش میں مدد کرنے کی پابند تھی۔ قرآن میں حکم دیا گیا کہ اگر کسی کا غلام یا باندی اس سے "مکاتبت" کا مطالبہ کرے یعنی یہ کہ وہ معقول معاوضہ لے کر اس کو آزاد کر دے۔ وہ غلام یا باندی اس رقم کا انتظام کر دے گا، تو اگر غلام یا باندی کے اندر سمجھ بوجھ پائی جاتی

ہو، اور آزاد ہونے کا مطلب گزر اوقات سے بھی محرومی نہ ہو، تو مالک ان کے اس مطالبے کو رد نہ کرے مان لے۔ پھر قرآن نے مسلم سوسائٹی کو حکم دیا کہ سوسائٹی اور حکومت اللہ کے دیے مال میں سے ان غلاموں کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے مالک کو وہ رقم جس پر آزادی کا وعدہ ہوا ہے ادا کر سکیں۔

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْراً وَآتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ آتَاكُمْ

اور تمہارے غلاموں میں سے جو مکاتبت کرنا چاہیں تو اگر تم ان میں خیر (اور سمجھداری کے آثار) محسوس کرتے ہو تو تم ان سے مکاتبت کا معاہدہ کرلو۔ (پھر) ان کو اللہ کے اس مال میں سے (مدد کے طور پر) دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔ (سورۃ النور ۳۳)

حضرت انس کے ایک غلام نے ان سے ''مکاتبت'' کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے تردد کیا۔ غلام ہوشیار تھا، اس نے حضرت عمرؓ کے دربار میں نالش کی۔ حضرت عمر نے بزرگانہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے حضرت انس کو درّہ دکھایا اور ان کو اس پیش کش کو قبول کرنے پر مجبور کیا[1]۔ ہمارے اکثر فقہاء کی رائے تو یہ ہے کہ قرآن کا یہ حکم لازمی نہیں ہے محض فضیلت اور ثواب کی بات ہے۔ لیکن حضرت عمر اور بہت سے ائمہ کی رائے اس کے لازمی ہونے کی ہے۔

حسن سلوک کی تاکید:

ان تعلیمات میں غلام کے ساتھ اس درجے کے حسن سلوک کی تعلیم ہے جس کا تصور بھی کوئی غلاموں کے معاملے میں نہیں کرسکتا۔ کہا گیا کہ آقا و غلام کا معیار زندگی ایک ہونا چاہیے۔ یا کم سے کم اس میں زیادہ تفاوت نہیں ہونا چاہیے۔ جو خود کھاؤ وہ اسے کھلاؤ، جو خود پہنو وہ اسے پہناؤ۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق

حضرت ابوذر نے ایک غلام کو کچھ برا کہہ دیا، رسول اللہؐ شدید ناراض ہوئے۔ کہا: ابوذر تم میں جاہلیت کے آثار باقی ہیں۔ یہ غلام تمہارے بھائی ہیں، اللہ نے ان کو تمہارے زیر دست کر دیا ہے سو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ جو خود کھاؤ وہ انہیں کھلاؤ، جو خود پہنو وہ انہیں پہناؤ۔ وہ کام دو جو بآسانی ہو سکے، ورنہ خود ساتھ لگ کر مدد کرو[1]۔ ان ہدایات میں غلام کی تعلیم و تربیت کی تعلیم بھی تھی، اور ان کو آزاد کر کے اپنے نکاح میں لے لینے کی بھی[2]۔ حدیث کا ذخیرہ ان تعلیمات سے بھرا ہوا ہے۔ اور محدثین نے انکے لیے الگ ابواب قائم کیے ہیں۔

ان تعلیمات کے نتیجے میں مجموعی طور پر مسلم معاشرے میں غلاموں کی حیثیت عملاً ایسی ہو گئی کہ وہ بسا اوقات رشک احرار بن گئے۔ وہ معاشرے کے استاد، معلم، رہنما، مذہبی مصلح، وزیر، فوجوں کے کمانڈر، اور یہاں تک کہ علاقوں کے گورنر تک بنے۔ ہزار ہا ہزار آزادوں کی بھیڑ ان کے پیچھے رہتی تھی۔ بلکہ مسلم تہذیب کے علاوہ شاید کہیں بھی ''خاندان غلامان'' کی سلطنت کی مثال نہیں ملے گی۔ یہ مسلم تاریخ و تہذیب کے درخشاں اوراق ہیں، پلٹیے تو روشنی دیں گے۔

اللہ کی خصوصی توفیق اور مدد سے یہاں غلامی کے مسئلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی روشنی میں جو لوگ غور کریں گے امید ہے کہ وہ ان کے لیے اسلامی شریعت پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کے بارے میں سارے اشکالات کے حل اور شرح صدر کا باعث ہوگا۔ فللّٰه الحمد وله الفضل والمنة۔

---

1. بخاری ۳۰
2. بخاری ۹۷

فصل ہفتم

عمومی تباہ کاری کی ممانعت

اسلام کی عمومی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ جنگ کے دوران قتل عام کرنا، غیر مسلح اور جنگ سے ہاتھ کھینچنے والوں کا خون بہانا، مال واسباب میں آگ لگانا اور عمومی تباہی و بربادی پھیلانے کو وہ کسی طرح پسند نہیں کرسکتا۔

آں حضرتؐ کا ارشاد ہے کہ:

الغزو غزوان فاما من ابتغیٰ وجه الله واطاع الامام وانفق الكريمة وياسر الشريك واجتنب الفساد كان نومه ونبهه اجراً كله. واما من غزا رياء و سمعة و عصى الامام وافسد في الارض فانه لا يرجع بالكفاف[1]	جنگیں دو طرح کی ہوتی ہیں: سو جو اللہ کی رضا وخوش نودی کے لئے جنگ کرے، امیر کی اطاعت کرے، اپنا اچھا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اپنے ساتھی کے ساتھ اچھا معاملہ کرے، اور فساد اور بگاڑ سے بچے تو اس کا سونا جاگنا سب (اللہ کے راستے میں ہے اور) موجب ثواب ہے، مگر جو دکھاوے کے لئے نکلے، امیر کی نہ مانے

---

[1] سنن نسائی ۳۱۳۷۔ مسند احمد ۲۱۵۳۷

اور زمین میں تباہی اور فساد مچائے تو یہی
نہیں کہ اس کو ثواب نہیں ملے گا بلکہ الٹا
گناہ لے کر آئے گا۔

یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ عمارتوں اور کھیتیوں اور باغات کو اور دیگر شہری تنصیبات کی تباہی اسلام کے جنگی قانون میں جواز نہیں رکھتی۔ مگر جنگ کے دوران دشمن کو زک پہنچانے ، اور اس کے گرد قائم حفاظتی حصار کو توڑنے یا کسی دیگر جنگی مصلحت کے لئے اس کے باغات یا عمارتوں یا قلعوں کو تباہ کرنے کی ضرورت ہو تو اس کو ایک ناپسندیدہ مگر ناگزیر کام سمجھ کر کرنا اسی طرح جائز ہوگا جس طرح قتل کرنا اصلا منع ہے، مگر کبھی نہ کبھی دنیا کو عمومی شر و فساد سے بچانے کے لئے ایسا کرنا پڑتا ہے۔

بنی نضیر کے قبیلے نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کیا، اور پھر بدعہدی ہی نہیں کی بلکہ آں حضرت کو دھوکے سے قتل کرنا چاہا، جس کے نتیجہ میں غزوۂ بنی نضیر ہوا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں نے بنی نضیر کے قلعوں کے ارد گرد کے کچھ باغات میں آگ لگائی[1]۔ یہود کی جانب سے اس پر اعتراض کیا گیا، اور غالباً جیسا کہ خود قرآن میں غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ مسلمانوں کے دلوں میں بھی اشکال پیدا ہوا تو یہ آیت اتری:

مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ (الحشر ۵)	تم نے جو "لینہ" (کھجور کے درخت) کاٹے، یا جو چھوڑ دیے تو یہ (سب) اللہ کے حکم اور اجازت سے کیا گیا، اور تا کہ اللہ باغیوں کو ذلیل کرے۔

---

[1] صحیح بخاری ۲۰۳۱، صحیح مسلم ۱۷۴۶

ایک غلط تعبیر جس کی اصلاح ضروری ہے:

یقیناً یہ کارروائی جنگی نقطۂ نظر سے ضرورت کی بنا پر کی گئی تھی۔ کچھ لوگوں کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ شاید یہ عام اجازت ہے۔ یہ خیال یقیناً غلط ہے، اور اس کی تصحیح کی ضرورت ہے۔ عقل وفطرت اس کی اجازت نہیں دیتے کہ عام بے گناہ شہریوں کی املاک کو بے سبب برباد کیا جائے۔ جو اسلام پانی تک کو ضائع کرنے سے روکتا ہے وہ کیسے کھیتیاں جلانے اور املاک کی بربادی کی اجازت دے سکتا ہے؟ اسلام کے قانون جنگ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس کے غلط ہونے کی سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانے میں لشکروں کو رخصت کرتے وقت تاکیدی حکم فرمایا کہ ہرگز پھلدار درختوں اور باغات کو نذر آتش نہ کیا جائے اور نہ کاٹا جائے اور نہ آبادیوں کو اجاڑا جائے[1]، یہ روایت حضرت ابوبکر سے تو ثابت ہے اس کے علاوہ امام بیہقی نے تو اس طرح کے احکام پر مبنی کچھ روایات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نقل فرمائی ہیں اور ان کی اسناد کے کمزور ہونے کے باوجود کثرت اسانید اور آثار صحابہ کی وجہ سے ان کو قوی قرار دیا ہے[2]۔ یہ احکام سارے صحابۂ کرام کے سامنے دیے جا رہے تھے، اور حکومت اسلامیہ کے جنگی قوانین کا اظہار سمجھے جا رہے تھے۔ اس وقت وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے خود بنی نضیر کی جنگ میں باغات میں آگ لگائی تھی اور پیڑ کاٹے تھے۔ اس وقت یہود کی جانب سے جب یہ اعتراض ہوا کہ: یہ تو فساد فی الارض ہے، کہیں نبی ایسا کیا کرتے ہیں؟ تو انہوں نے دیکھا تھا کہ قرآن میں صاف آیت اتری تھی کہ جو کیا گیا وہ بالکل ٹھیک کیا گیا، اور اس میں کچھ غلط نہیں۔

---

1. موطا ۵۸۱
2. سنن بیہقی: ۹/۹۰

حضرت ابوبکر نے جس وقت یہ احکام دیے تھے اس وقت ان صحابہ میں سے کسی کا اس پر کوئی اعتراض نہ کرنا اس بات کی واضح اور غیر مشتبہ دلیل ہے کہ غزوۂ بنی نضیر میں یہ کارروائی جنگی ضرورت کے تحت کی گئی تھی۔ یعنی صورت حال یہ تھی کہ اس سے دشمن پر غلبہ آسان ہونے کی امید تھی، یا اس کے حصار کو توڑنا مقصد تھا۔ شریک غزوہ صحابۂ کرام اس کو ایسا ہی سمجھتے تھے، اور خود حضرت ابوبکرؓ ایسا ہی سمجھتے تھے، اور ان سے بڑھ کر رازداں اور حقیقت شناس کون ہو سکتا ہے؟

ائمۂ اسلام کا موقف:

لہٰذا اس سلسلے میں بنی نضیر کے باغات جلائے جانے سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے ائمہ اور فقہاء نے بھی اس کو اسی طرح سمجھا ہے کہ یہ ایک جنگی ضرورت کے تحت کی جانے والی مجبوری کی کارروائی تھی۔ ورنہ اصلاً یہ ممنوع ہے۔ امام ترمذی امام اوزاعی سے نقل کرتے ہیں کہ "پیڑ کاٹنا اور باغات میں آگ لگانا وغیرہ ممنوع ہیں، حضرت ابوبکر نے اس سے منع فرمایا ہے اور اسی ممانعت پر مسلمانوں کا عمل چلا آرہا ہے"[1]۔

یہ بڑی باوزن دلیل ہے کہ "اسی ممانعت پر مسلمانوں کا عمل چلا آرہا ہے"۔ واقعہ یہی ہے کہ صحابہ وتابعین کے زمانے میں مسلمانوں نے بہت سی جنگیں لڑیں، مگر کہیں بلا کسی خاص جنگی ضرورت کے باغات یا کھیت جلانے یا عمارتوں اور آبادیوں کو نقصان پہنچانے کا ثبوت نہیں ملتا۔ جن ائمہ سے اس کا جواز منقول ہے محققین نے تصریح کی ہے کہ ان کی مراد بھی یہی ہے کہ یہ اسی صورت میں جائز ہے جب یہ جنگی ضرورت بن جائے۔ فقہاء احناف کے سرخیل ابن الہمام کہتے ہیں: یہ جائز ہے جب اس کے بغیر چارہ نہ ہو، اگر اس کے بغیر کام چل سکتا ہو تو یہ ممنوع ہے اس لیے کہ یہ

---

[1] سنن ترمذی کتاب الجہاد، باب فی التحریق والتخریب

''افساد'' بگاڑ پیدا کرنا ہے۔ اس کا جواز بس ناگزیر جنگی ضرورت کی وجہ سے ہے[1]۔ ابن الہمام نے اس مسئلے کی جو حقیقت بتائی ہے اس کو فقہ حنفی کی مشہور کتابوں مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر، البحر الرائق، درر الاحکام اور درِّ مختار میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ اور یہ ہے ہی اتنی واضح اور معقول بات۔ ابن عابدین کہتے ہیں کہ فقہاء کی جواز کی رائے کو ابن الہمام نے اسی شکل کے ساتھ مقید کیا ہے جب ایسا کرنا جنگی ضرورت کی بنا پر ناگزیر ہو، ''البحر'' اور ''النہر'' کے مصنفین نے بھی ان کی اتباع کی ہے۔ ابن عابدین اس رائے کی تحسین کرتے ہوئے کہتے ہیں: ظاہر ہے کہ یہ بڑی اچھی رائے ہے[2]۔

امام احمد بن حنبل ان لوگوں میں سے ہیں جو کھیتیاں وغیرہ برباد کرنے کے جواز کے قائل سمجھے جاتے ہیں، امام ترمذی ان کا قول نقل کرتے ہیں کہ: اس کے جواز کا سبب یہ ہے کہ کبھی کبھی جنگ میں ایسا کرنے کے علاوہ چارہ نہیں ہوتا، بہرحال برباد کرنے اور تباہی پھیلانے کے مقصد سے ایسا کرنا جائز نہیں''۔ فقہ حنبلی کی مشہور کتاب کشاف القناع اور اس کے متن الاقناع میں صراحت کی گئی ہے یہ اجازت صرف جنگی ضرورت کے تحت ہی ہے، یا اس صورت میں ایسا کیا جاسکتا ہے جب دشمن ہمارے ساتھ ایسا کرتا ہو، تو اس کے باغات اور عمارتیں تباہ کی جائیں، گی تاکہ وہ اس مذموم حرکت سے باز آئے[3]۔

امام ابن جریر طبری نے اسی بات کو اس طرح کہا ہے کہ ''تباہ کرنا اور برباد کرنا مقصود نہیں ہے، اور عمداً ایسا کرنا ممنوع ہے۔ لیکن جب جنگ کے دوران اس کی ضرورت پڑ جائے، جیسا کہ طائف میں منجنیق سے سنگ باری کے نتیجہ میں عمارتوں کو

---

[1] فتح القدیر ۵/ ۱۹۷

[2] ردالمحتار (۴/ ۳۳۶)۔

[3] کشاف القناع فصل فی حمیت الکفار

نقصان پہنچا تو یہ جائز ہے"۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری[۱] میں طبری کی اس رائے کو نقل کیا ہے اور آگے جا کر کہا ہے: "وبهذا قال اكثر اهل العلم" یہی اکثر اہل علم کی رائے ہے۔

لہٰذا یہ بات بالکل طے ہے کہ جن فقہاء وعلماء نے باغات میں آگ لگانے یا پیڑ کاٹنے کو جائز قرار دیا ہے اس سے بلا قید جواز سمجھنا حقیقت فہمی سے بعید بھی ہے اور شریعت کے مزاج سے ناواقفی بھی۔ مگر افسوس..........۔

---

[۱] (۱۵۵/۶)

فصل ہشتم

جنگ کے دیگر انسانی قوانین

اسلام نے جنگ کو انسانیت اور انسانی اخلاقیات کا بہر حال پابند کیا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں، جنگ چونکہ قتل و خونریزی سے عبارت ہے، اس لیے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ناجائز اور اصلاً حرام عمل ہے۔ اسلام نے انسانیت کے احترام اور انسانی جان کی حفاظت کی جو عمومی تعلیمات دی ہیں جنگ ان سے ایک استثناء ہے۔ قرآن نے ایک اعتراض کے جواب میں دین الٰہی میں جنگ کے جائز رکھے جانے کا سبب بتاتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ: "الفتنة اکبر من القتل" یعنی جنگ اور قتل و خونریزی سے بھی زیادہ بڑی اور موجب فساد بات یہ ہے کہ دین حق سے لوگوں کو زور و زبردستی سے روکا جائے، اور دین حق پر قائم رہنے والوں کو مبتلائے عذاب و آزمائش کیا جائے۔ یعنی جنگ کے جواز بلکہ اس کے ضروری ہونے کا یہ سبب ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ بھی اصل میں ایک خراب اور بری چیز ہے، لیکن "فتنہ" اور ظلم اتنی خراب چیزیں ہیں کہ وہ جنگ کو جائز اور کبھی ضروری بنا دیتی ہیں۔ اسلام کا یہی مزاج اور دین الٰہی کی یہی روح ہے کہ جنگ جیسی دہشت خیز چیز کو بھی وہ شریفانہ قوانین کا پابند اور انسانی جذبات سے آشنا بناتا ہے۔ یہ قوانین اس قابل ہیں کہ (ایک بزرگ کے الفاظ میں) یہ دنیا میں "جنگ کی اندھیر نگری کو جہادی تہذیب کا عطیہ" جیسے نام سے یاد کیے جائیں۔ اسلام کا مزاج تو یہ ہے کہ:

ان اللہ قد کتب الاحسان علی کل شیء، فاذا قتلتم فاحسنوا القتلۃ واذا ذبحتم فاحسنوا الذبحۃ۔[1]	اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنے کا حکم دیا ہے (یہاں تک کہ یہ بھی حکم ہے کہ) جب تم کسی کو قتل کرو تو بھلی طرح قتل کرو، اور جب تم ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ بھی اصل میں ایک خراب اور بری چیز ہے، لیکن ''فتنہ'' اور ظلم اتنی خراب چیزیں ہیں کہ وہ جنگ کو جائز اور کبھی ضروری بنا دیتی ہیں۔

جس نے اسلام اور رسول اسلام کی سیرت کا کوئی تفصیلی مطالعہ نہ کیا ہو وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ جنگ بھی اخلاق اور انسانیت کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ جنگجو سپاہی کو عدل وانصاف کا درس اور وہ بھی عین عالم جنگ اور وقت پیکار میں، کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ اور خدانخواستہ اگر آزادی انسان اور انسانی حقوق کے پرشور نعرے لگانے والی موجودہ حکومتوں کے جنگی نظام اور فوجی تعلیم وتربیت کے طریقوں کو کسی نے کچھ جانا پڑھا ہے، تب تو وہ یہ خیال کرنے میں کچھ شاید معذور بھی قرار پائے گا کہ جنگ میں انسانیت کا نام لینا کانفرنسوں کی خوش نما اور مکارانہ تقریروں کو زینت بخشنے والی ایک پرفریب ادا کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

مگر اسلام کا معاملہ دیگر ہے۔ یہاں جنگ ملک وقوم کی خدمت اور ترقی کے لئے نہیں ہے۔ مغربی قوموں نے اعلانیہ طور پر اپنی سیاست وحکومت کا مقصد قومی مفادات کا حصول بتایا ہے، اور جنگ کی غرض مفادات کی کشمکش میں غلبہ واستیلاء قرار دینے میں کسی حیا کو مانع نہیں بننے دیا ہے۔ انہوں نے اپنی عام تعلیم گاہوں سے لے کر

---

[1] صحیح مسلم ۱۹۵۵

وزارتوں، دفاعی وسیاسی پالیسی ساز اداروں اور تھنک ٹینکس (Thinks Tanks) تک میں ظلم وحرص اور خود غرضی کا یہی سبق پڑھا ہے۔ پھر فوجوں کو خونخواری اور شدت پسندی کی سان پر چڑھایا جاتا ہے۔ معاصر دنیا میں قوموں کو پہلے قوم پرستی کی جاہلیت کا سبق پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ قومی نظام تعلیم کا مقصد اچھا انسان نہیں اچھا شہری یعنی ملک وقوم کے مفادات کا پرستار وخادم بنانا ٹھیرتا ہے۔ ناجائز جنگیں اور مفادات کیلئے خون بہانا قوم پرستی اور Patriotism کے اس فلسفے کی رو سے جائز ٹھہرتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ ان "مہذب" ممالک کی اکثر آبادی کی فطرت ہی مسخ ہوگئی ہے۔ اور انہوں نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ ہر ملک صرف اپنے مفادات کی خاطر دوسری قوموں پر حملہ کرتا ہے۔ اور فوجوں کو کہاں نرمی، اخلاق اور اصول پسندی کی تعلیم دی جاسکتی ہے؟ اس صورت حال نے اسلام کے اصولوں کی تفہیم مشکل بنادی ہے۔ ایک خالی الذہن آدمی جس نے معتبر مآخذ کے واسطے سے مسلمانوں کے اولین عہد کی تاریخ سے واقفیت نہ پیدا کی ہو یا قریب سے سچے مسلمانوں کو نہ دیکھا ہو، وہ اگر کتابوں اور تقریروں سے اسلام کے ان اصولوں اور تعلیمات سے واقف بھی ہوگا تو وہ اسکو شاعرانہ مہارت اور پرفریب لفاظی ہی خیال کرے گا۔

حال آں کہ اسلام کا معاملہ قطعاً مختلف اور برعکس ہے، یہاں قوم کے عزت وغلبہ کے لئے جنگ حرام ہے، جنگ تو خادم ہے اور اعلیٰ مقاصد یعنی سچائی، عدل وخیر اور اللہ کی عبادت جیسے اصولوں کی پاسداری اصل مطلوب ہے۔

ہمیں اس سلسلے میں قرآن وحدیث میں کافی قانونی تفصیلات ملتی ہیں۔ جن میں جنگ کے وہ سارے طریقے جو خونریزی، تباہ کاری، سنگ دلی، ظلم، اور انسانی وقار کی بے حرمتی کے ضمن میں آتے ہیں صراحت کے ساتھ منع کیے گئے ہیں۔

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

الغزو غزوان فاما من ابتغیٰ	جنگیں دو طرح کی ہوتی ہیں: سو جو
وجه الله واطاع الامام وانفق	اللہ کی رضا وخوش نودی کے لئے جنگ
الكريمة وياسر الشريك	کرے، امیر کی اطاعت کرے، اپنا
واجتنب الفساد كان نومه	اچھا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔
ونبهه اجراً كله. وأما من غزا	اپنے ساتھی کے ساتھ اچھا معاملہ
رياء و سمعة و عصى الامام	کرے، اور فساد اور بگاڑ سے بچے تو
والفسد في الارض فانه لا	اس کا سونا جاگنا سب (اللہ کے راستے
يرجع بالكفاف[1]	میں ہے اور) موجب ثواب ہے، مگر
	جو دکھاوے کے لئے نکلے، امیر کی نہ
	مانے اور زمین میں تباہی اور فساد
	مچائے تو یہی نہیں کہ اس کو ثواب نہیں
	ملے گا بلکہ الٹا گناہ لے کر آئے گا۔

مقتول دشمن کی لاش کی بے حرمتی اور اس کے جسم کا مُثلہ یعنی اعضا کی قطع وبرید کو ممنوع قرار دیا گیا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن یزید انصاریؓ سے روایت ہے کہ:

نهى النبيّ عن النهبىٰ والمثلة[2]	نبی اکرمؐ نے جنگ میں مال لوٹنے اور مثلہ کرنے سے منع کیا ہے۔

رسول اللہؐ کا معمول تھا کہ فوجوں کو روانہ کرتے وقت ان کو جمع کر کے آپؐ ایک رخصتی خطاب فرماتے، اس خطاب میں لازماً ان کو خوف خدا اور تقوی واحتیاط کے طرز

---

[1] سنن نسائی ۳۱۳۷، مسند احمد ۲۱۵۳۷

[2] بخاری-۲۴۷۴

عمل کی تاکید کرتے، اور فرماتے:

اغزوا، ولا تغدروا، ولا تغلوا، ولا تمثلوا[1]	جاؤ جنگ کرو، مگر نہ کسی سے بدعہدی کرنا، نہ خیانت کرنا اور نہ مثلہ کرنا۔

اللہ کا دین اپنے ماننے والوں کے لئے ان طریقوں کا کوئی جواز نہیں بتاتا۔ وہ صاف بتلاتا ہے کہ اگر کسی نے جنگی جوش وغضب میں ایسی حرکتیں کیں تو کبھی وہ "مجاہد" نہیں بن سکتا، اور اس کو جہاد کا وہ اجر وثواب نہیں مل سکتا جس کے لیے اس نے اپنے سر کی بازی لگائی ہے، بلکہ الٹا وہ جہنم کا خریدار ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی جنگوں کا مقصد نہ علاقے فتح کرنا ہوسکتا ہے اور نہ اپنے غلبے کے پھریرے اڑانا۔ بلکہ وہ صرف اس مقصد سے جنگ کر سکتے ہیں کہ اللہ کے دین کی دعوت کے سامنے سے رکاوٹیں ختم ہو جائیں، "فتنہ" کا سلسلہ رک جائے اور حق پرستوں کو انسانیت کی ہدایت و خدمت کا کام کرنے کے مواقع مل جائیں، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۂ رسول صدیق اکبرؓ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد پہلا لشکر روانہ کرتے وقت اس کے امیر حضرت اسامہ بن زید کو رخصت کرتے ہوئے یہ ہدایات دیتے ہیں:

(۱) خیانت نہ کرنا (۲) مال غنیمت مت چرانا (۳) دھوکہ مت دینا اور معاہدے کی خلاف ورزی نہ کرنا (۴) لاشوں کے اعضاء مت کاٹنا (۵) بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو مت مارنا (۶) باغوں کو نہ کاٹنا، نہ جلانا (۷) پھل دار درختوں کو نقصان نہ پہنچانا (۸) اونٹ، گائے اور بکریاں ذبح مت کرنا، الا یہ کہ کھانے کی ضرورت پڑ جائے (۹) راہبوں اور عبادت گاہوں کے خادموں کو مت مارنا[2]۔

امام مالک نے موطا میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت یزیدؓ ابن ابی

---

[1] صحیح مسلم-۱۷۳۱
[2] تاریخ طبری ۲/۲۴۶

سفیانؓ کو شام کے علاقے کی ایک مہم پر روانہ فرمایا، یہ علاقہ عیسائی تھا۔ روانگی کے وقت حضرت ابوبکرؓ ساتھ میں کچھ دور تک رخصت کرنے گئے۔ خود پیدل اور حضرت یزیدؓ سوار۔ اس پر حضرت یزید نے عرض کیا: اے خلیفۂ رسول، یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں یا مجھے اجازت دیں میں اتر کر پیدل چلوں۔ حضرت ابوبکر نے منع فرمادیا، اور کہا: نہ میں سوار ہوں گا اور نہ تم کو اترنے کی اجازت ہے، مجھے اللہ سے ایک ایک قدم پر ثواب کی امید ہے۔ پھر کچھ احکام دیے۔ جن میں یہ بھی تھا کہ:

> تم کو کچھ ایسے لوگ ملیں گے جو کہیں گے کہ ہم نے عبادت کی خاطر دنیا چھوڑ دی ہے، تو ان سے کچھ تعرض نہ کرنا۔ اور میں تم کو دس باتوں کی تاکید کرتا ہوں۔ نہ کسی عورت کو قتل کرنا، نہ بچے کو، نہ بوڑھے ضعیف کو، کسی پھل دار درخت کو بھی نہ کاٹنا۔ کسی آبادی کو نقصان نہ پہنچانا۔ اگر فوج کو غذائی کمی نہ پیش آئے تو بکری یا اونٹ بھی نہ ذبح کرنا۔ نہ کسی باغ میں آگ لگانا نہ ڈبونا۔ عہد شکنی نہ کرنا۔ مثلہ نہ کرنا......"[1]

سفیر کی جان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ اس کے اکرام کی بھی رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ہے۔ آپ ﷺ کا مستقل طرزِ عمل یہ تھا کہ جب بھی کوئی سفارتی مشن آتا آپ اس کے تمام ارکان کو ہدایا سے سرفراز فرماتے۔ مسیلمۃ الکذاب باغی اور مدعی نبوت تھا۔ اس کے دو سفیر آئے، دونوں ارتداد اور بغاوت کے جرم کی بنا پر مستحق قتل تھے۔ مگر آپ ﷺ نے کہا کہ "سفیر کو قتل کرنا جائز نہیں ورنہ میں تم کو قتل کروادیتا" صحابۂ کرام کہتے ہیں کہ پھر یہی اسلامی قانون قرار پایا۔[2]

---

[1] موطا ۸۵۸

[2] مسند احمد ۳۷۵۲، سنن ابوداؤد ۲۷۶۳

مرض الوفات میں آپؐ نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے بعد اسلامی حکومت کے ذمہ داروں کو جو چند وصیتیں بطور خاص کیں، ان میں یہ بات بھی تھی کہ:

واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم[1] | سفارتی وفود کو ہدیے دیا کرنا جیسا کہ میں کیا کرتا تھا۔

مغربی فوجوں کو درندگی کی تربیت:

جدید دنیا نے اپنی وحشیانہ خونریزیوں پر جنگی قوانین، بین الاقوامی دساتیر اور نہ جانے کتنے دیدہ زیب عناوین واصطلاحات کے غلاف چڑھا رکھے ہیں، مگر کہاں عملاً فوجیوں کو انسانیت اور شریفانہ اصول جنگ کی تعلیم دی جاتی ہے؟ یہ قوانین کالجوں کی تعلیم، پرشکوہ کانفرنسوں میں مکارانہ بحث کرنے اور پرفریب گفتگوؤں کے لئے ہیں، اور بس۔

''تقوے اور خوف خدا'' کی جیسی باتوں کو تو سمجھنا بھی عصر حاضر کے ان ''بے چاروں'' کے لیے کہاں ممکن؟ ان کی پرواز تو اسی دنیائے دنی میں ہے۔ مگر کون ہے جو فوجوں کو رخصت کرتے وقت عام انسانی اخلاقیات کا بھی درس دیتا ہے؟ معلوم ومعروف ہے کہ ساری دنیا میں فوجوں کو بے رحمی کی تعلیم دی جاتی ہے، ان کو حیوانیت اور سنگدلی کے اخلاق سکھائے جاتے ہیں، ان کی تربیت کے لئے ایسا ماحول تیار کیا جاتا ہے جہاں ہمدردی اور انسانی اخلاقیات کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ پھر بھی اگر ان کے اندر انصاف پسندی اور انسانیت کی کوئی رمق باقی بچ جاتی ہے، تو اس کو دوران جنگ اپنا اثر دکھانے سے روکنے کے لئے قومی عصبیت اور ملکی وفاداری کی وہ ناپاک اور زہریلی تعلیم کافی ہے، جو گویا فوجی خمیر کا حصہ بنادی جاتی ہے۔

جنگ عظیم کے دنوں میں ایک برطانوی فوجی بریگیڈیر جنرل F. P. Crosier

---

[1] صحیح بخاری-۴۴۳۱

نے اپنی آپ بیتی لکھی تھی، وہ اسی وقت لندن سے A Brass Hat in No Man's Land کے نام سے چھپی تھی، اب انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ اتفاقاً نظر پڑی تو عراق میں امریکیوں کی ناپاکیوں کی تصویر نظر آ گئی۔ یہ تہذیب ایسی ہی درندگی اور خباثت پر مشتمل ہے۔ برطانیہ کا کوئی دشمن جھوٹ بھی بولے اور جھوٹے الزامات لگانے میں حد درجے نفرت سے کام لے تو بھی اس سے برا اور کیا گڑھ گڑھ کر کہہ سکے گا جو ایک سپہ سالار نے خود ہی لکھ دیا ہے۔ ایک افسر کی تقریر کے جملے نقل کرتا ہے:

> You must lose your gentle selves. you must steel your hearts and minds to be callous of life or death. that is war[1]
>
> اپنی انسانیت اور شرافت بھلا دو۔ دلوں کو پتھر کا بنا لو۔ موت اور زندگی کی طرف سے گونگے بہرے بن جاؤ۔
>
> پوری کتاب فوجوں کی درندگی اور گھناؤنے پن کی تربیت سے بھری ہوئی ہے۔
>
> ”ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے سپاہیوں میں خون کی وہ پیاس پیدا کی جائے، بسا دی جائے اور بھڑکائی جائے جس کے بغیر کوئی جنگ نہیں جیتی جا سکتی اور نہ دیر تک جاری رہ سکتی ہے۔“ (صفحہ ۳۷)
>
> میرا کام اس وقت یہ ہے کہ میں ایک ہزار سے زائد نفوس کی ذہنیت جلد سے جلد بدل کر رکھ دوں۔ ان کے دلوں میں پروپیگنڈے کے ذریعے درندگی کو نشوونما دوں۔ دشمن کی سفاکی، زہریلی گیسوں کا استعمال، عورتوں کی عصمت دری وغیرہ کی داستانیں اس درندگی کی نشوونما میں مددگار ہو رہی ہیں۔ (اگرچہ میں ان میں سے بہت ساری روایتوں کو جھوٹ سمجھ رہا ہوں)۔ بات بات پر بلاوجہ مشتعل ہونے کی عادت پیدا کرنی ہے۔ اس

---

1. *A Brass Hat in No Man's Land p.40*

کے لیے فوجی گانے اور باجے سب استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔(ص ۴۲۔۴۳ملخصا)

افسوس مشرق والوں نے بھی نظام حکومت اور فوجی تربیت ان ہی سے سیکھے ہیں۔اب دنیا بھر میں فوجوں کی ایسی ہی تربیت کا رواج ہے۔الا ماشاء اللہ۔

باب چہارم

اہل ذمہ

یعنی اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری

حقوق اور ذمہ داریاں

فصل اول

اہل ذمہ کے عام حقوق

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کی حیثیت بھی ہمارے موضوع ''جہاد'' کا ایک اہم حصہ ہے۔ جہاد کے دیگر بہت سارے مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی بڑی غلط فہمیوں کے نرغے میں ہے۔ عملاً اس موضوع کی اہمیت اگرچہ کوئی بہت زیادہ نہیں، (خصوصاً اس لیے بھی کہ اس وقت کی مسلم ریاستیں اپنی ساخت اور تشکیل کے اعتبار سے عموماً اسلامی نہیں، قومی ریاستیں ہیں، اور ان کو اسلامی ریاست کے مزاج ومنہاج میں ڈھالنا بڑی روحانی اور فکری جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کے موجودہ عمومی دینی حال کو دیکھتے ہوئے یہ منزل بہت دور نظر آتی ہے) لیکن نظریاتی طور پر یہ ایک بڑا اور اہم سوال ہے۔ اس موضوع پر بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے ذہنوں کو اطمینان فراہم کرنے والا ایسا علمی مواد جو پورے طور پر کتاب وسنت سے ہم آہنگ بھی ہو اور عدل کے فطری شعور کے مطابق عقلوں کو مطمئن کرنے کا سامان بھی رکھتا ہو، اسی طرح کمیاب ہے جس طرح اصل موضوع جہاد پر اس قسم کا علمی کام۔

اس باب میں ہم کوشش کریں گے کہ اہل ذمہ سے متعلق شریعت کے عمومی احکام کی کسی قدر اختصار کے ساتھ وضاحت کی جائے، لیکن جو مسائل سالہا سال سے متنازعہ بلکہ معرکۃ الآراء چلے آرہے ہیں ان کی، صحیح شرعی دلائل کے ساتھ ایسی تشریح کی جائے کہ کتاب وسنت رسول سے سر مو انحراف کے بغیر، وہ عدل وحق کے بلند تر

معیار پر نظر آئیں۔

شریعت میں شہریت ایک معاہدہ ہے:

اسلامی شریعت میں شہریت کی بنیاد ایک معاہدہ تصور کیا جاتا ہے گویا ہر شہری ریاست اور معاشرے کے ساتھ معاہدہ میں مربوط ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کو حقوق بھی ملتے ہیں اور ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کا معاہدہ الگ قسم کا ہوتا ہے اور اس کی تفصیلات میں عام انسانی حقوق و فرائض اور اجتماعی ذمہ داریوں کے علاوہ خالص دینی ذمہ داریاں بھی شامل ہیں۔ لیکن ایک غیر مسلم شخص جب اسلامی ریاست کا شہری ہوتا ہے تو اس کے ساتھ معاہدہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات ضرور مد نظر رکھنے کی ہے آج کی دنیا میں مذہبی اقلیتیں ملک کے اصل باشندوں پر مشتمل ہوتی ہیں، ان کی حیثیت ریاست کے مالک کی ہوتی یا کم از کم مانی جاتی ہے۔ اگر کوئی قوم کسی ریاست سے جنگ کرے اور پھر مفتوح بن کر اس میں داخل ہو تو یہ فطری بات ہے کہ اخلاقی اور دینی طور پر اسکے ساتھ انصاف تو ضروری ہوگا لیکن اس کی حیثیت سماجی اور سیاسی طور پر یک بارگی فاتح قوم کے مساوی ہو جائے ایسا عملاً ممکن نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس قوم کے افراد کے لیے یہ دروازے پورے طور پر کھلے رہیں گے کہ وہ ایمانی و اخلاقی تربیت حاصل کر کے ریاست میں تقویٰ کے اصول فضیلت کو حاصل کرے اور بلند سے بلند تر مقام کو پہونچے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی عہد میں مسلم ریاست میں غیر مسلموں کا داخلہ مخصوص تاریخی اسباب کی بنا پر (جن کی طرف ہم اپنی اسی کتاب میں اشارہ کر چکے ہیں) مفتوح بن کر ہی ہوا۔ مگر کچھ مدت ہی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے سماجی انصاف نے یہ عظیم اور دنیا کی تاریخ کا یہ عجیب کارنامہ انجام دیا کہ فاتح عربوں کے بجائے مفتوح قوموں کی بڑی تعداد اسلامی معاشرہ میں علم، فضیلت اور اختیارات میں بلند ترین مرتبوں پہ فائز نظر

آتے ہیں۔

یہ اصلاً تاریخ کا موضوع ہے اس لیے یہاں ہم صرف اتنا اشارہ کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری میں یہ فتوحات ہوتی ہیں، اور دوسری صدی ہجری کی پانچویں دہائی کے بعد سے علم، عزت، حکومتی عہدوں، صنعت، تجارت، تہذیب اور یہاں تک کہ دینی رہنمائی میں بھی آپ کو فاتح عربوں کے بجائے مفتوح قوموں کے لوگ معاشرے میں نہایت فائق و برتر نظر آئیں گے۔ علم حدیث جو اس زمانے کا سب سے معزز علم ہے عجمی نژادوں سے ہی اس کی بزم آراستہ ہیں۔ علم فقہ جو دینی رہنمائی کا خاص ذریعہ ہے بڑی حد تک انہی عجمی علماء کا مرہون منت ہے۔ بین الاقوامی تجارتی مراکز حجاز و نجد نہیں: دمشق، بصرہ، مدائن، اور فسطاط میں قائم ہیں۔ حکومت میں خلافت کا ادارہ اگرچہ عرب ہی رہا لیکن فوج سے لے کر شہری تنظیم ریاست کے ہر شعبے میں یہ عجمی مفتوحین ہی تھے جو مسلم حکومتوں میں مرکزی اور کلیدی مقام پر فائز رہے۔ اسی عدل و انصاف سے ایک نئی اسلامی تہذیب دارالسلام بغداد سے لے کر خراسان اور سمرقند و بخارا تک میں ابھرتی ہے اور ساری دنیا کی فاتح تہذیب بن جاتی ہے۔

مفتوح قوموں کے لیے بھی یہ ایک سعادت مند تاریخی دور تھا اور خود اسلام کے فروغ اور انسانیت کی ہدایت یابی کا یہ کارنامہ اسی وجہ سے انجام پا سکا کہ اسلام کی وہ حقیقی روح مسلمانوں میں مضبوط تھی جو ان کو اہل ذمہ کے سلسلے میں انصاف، فراخ دلی انسانی مساوات اور مواسات کے اصولوں کا ان کو پابند بناتی تھی۔

ذمی کا مفہوم:

اسلامی شریعت کی قانونی اصطلاح میں اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے لئے ”اہل ذمہ“ یا ”ذمّی“ کے الفاظ بولے گئے ہیں۔ ”ذمہ“ کے معنی گارنٹی اور ذمہ داری کے ہیں۔ گویا یہ وہ لوگ ہیں جن کے حقوق اور تحفظ کی ذمہ داری حکومت پر

لازم ہوتی ہے۔

"ذمۃ" عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی لغت کے اعتبار سے اس کے معنی حق، کفالت اور ذمے داری کے ہیں۔ اور اسی معنی میں ذمی کا لفظ ہے، یعنی وہ غیر مسلم جن کی ذمے داری اسلامی حکومت پر آتی ہے[1]۔ یہ "ذمہ" اور "ذمی" کی اصطلاح صاف بتاتی ہے کہ ریاست اور معاشرہ ان لوگوں کے حقوق کی ذمہ داری لے رہے ہیں۔ اور اسلام کی نظر میں غیر مسلم "محکوم باج گذار" نہیں بلکہ ایسے شہری ہیں جن کے حقوق کے تئیں اسلام ریاست کو اپنی مسئولیت اور ذمہ داری کا طاقت ور احساس دلاتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے وفات سے ذرا پہلے اپنے بعد کے خلیفہ کے لئے جو وصیتیں کیں ان میں ریاست کے لئے نہایت قدر واحترام کے لائق "مہاجرین اولین" اور انصار کی حق شناسی کی نصیحت کی اور اس کے معاً بعد یہ فرمایا۔

> واوصيه بذمة الله وذمة رسوله، أن يوفى لهم بعهدهم وأن يقاتل من وراء هم، وأن لا يكلفوا فوق طاقتهم، [2]
>
> میں وصیت کرتا ہوں اللہ و رسول کے ذمہ کا خیال رکھنے کا، ان سے کئے گئے معاہدے کو پورا کیا جائے ان پر کوئی حملہ آور ہو تو ان کی حفاظت کے لیے جنگ کی جائے اور سکت سے زیادہ ٹیکس نہ لگایا جائے۔

اس وصیت میں اہل ذمہ کے حقوق کو "ذمة الله وذمة رسوله" (اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ) کہہ کر جو تقدس اور احترام بخشا گیا ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس تمہید سے واضح ہوتا ہے کہ اہل ذمہ کے ان حقوق میں وہ سارے شہری حقوق آجاتے ہیں جو کسی بھی عادلانہ نظام حکومت میں اس کے شہریوں کو حاصل

---

[1] لسان العرب ۱۲/۲۲۰

[2] صحیح بخاری)

ہوتے ہیں۔ مثلاً:

جان کی حفاظت:

ا۔ جان ومال کی حفاظت کی ذمہ داری ریاست پر ہوتی ہے۔ ریاست اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کی جان ومال کی بالکل اسی طرح حفاظت کرنے کی پابند ہوگی جیسا کہ وہ مسلم شہریوں کے جان ومال کی حفاظت کرتی ہے۔ اوپر حضرت عمرؓ کی وصیت میں بھی اسی اصول کی تاکید کی گئی ہے۔ فقہ اسلامی کی تمام کتابوں میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اہل ذمہ کو ہر طرح کی بیرونی اور داخلی جارحیت سے تحفظ فراہم کرے۔ اگر کوئی ان دشمن طاقت ان پر حملہ آور ہو تو اسلامی ریاست کی ذمے داری ہوگی کہ وہ ان کا بھی اسی طرح تحفظ کرے جس طرح وہ مسلمانوں کا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ:

"علیہ حمایتھم من المسلمین وأھل الحرب وأھل الذمۃ"

حکومت پر ذمیوں کی مسلمانوں، اہل حرب اور ذمیوں سے حفاظت فرض ہے۔[1]

مملکت کے داخلی دائرے میں بھی ان کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا ہے، ان کا قتل خاص طور پر موجب عذاب بتایا گیا ہے۔ حدیث میں صاف اعلان نبوی موجود ہے کہ اگر کسی نے کسی ذمی کو قتل کیا تو اس پر جنت کی خوشبو تک حرام ہے، **من قتل معاھدا لم یرح رائحۃ الجنۃ**[2]۔

---

[1] ملاحظہ ہو: المغنی، کتاب الجہاد، فصل تجب حمایۃ اہل الذمۃ علی الا المسلمین

[2] صحیح بخاری ۳۱۶۶

ذمی کے قصاص کا مسئلہ:

ذمی کی جان اسلام کی نگاہ میں اسی طرح قابل احترام ہے جس طرح کسی مسلم شہری کی۔ لیکن فقہاء وعلماء کی ایک بڑی تعداد اس کی قائل ہے کہ ذمی کے قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اس کی دیت وصول کی جائے گی۔ یہ حضرات حضرت علیؓ کی روایت کردہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، (لا یقتل مسلم بکافر)[1]۔

دوسری طرف امام ابوحنیفہ ان کے اصحاب اور دیگر بہت سے فقہاء اس کے قائل ہیں کہ ذمی کے بدلے میں اسی طرح قصاص نافذ ہوگا جس طرح کسی مسلمان مقتول کے بدلے میں ہوتا ہے۔ ان حضرات کی اصل دلیل یہ ہے کہ شریعت نے مقتولین کے قصاص کے جو احکام قرآن وسنت کے بہت سے نصوص میں آئے ہیں ان میں کہیں ایسی کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ ذمی کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں جائے گا۔ بلکہ وہ صاف ہیں کہ ہر قابل احترام جان کا یہی حکم ہے۔ یہ نصوص قرآن میں بھی ہیں اور سنت میں بھی کثرت سے آئے ہیں۔ ان نصوص میں کثرت سے علی الاطلاق سارے مقتولین کے قصاص کا حکم آیا ہے اور کہیں ذمی کا استثنا نہیں ہے۔ مثلاً قرآن میں قصاص کا قانون بتایا گیا ''النفس بالنفس'' جان کے بدلے جان۔ نیز صاف قانون تعزیر بیان ہوا کہ:

> ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا فلا یسرف فی القتل انہ کان منصورا
>
> جو مظلوماً قتل کیا جائے تو اس کے وارث کو ہم نے (قاتل کو قصاص میں قتل کرنے کا) پورا اختیار دیا ہے، سو وہ قتل کرنے میں کوئی زیادتی (بھی) نہ کرے۔ (ریاست کی جانب سے) اس کی مدد کی جائے گی۔

---

[1] صحیح بخاری، باب کتابۃ العلم

شریعت کی ان جیسی عام دلیلوں کی بنیاد پر ان حضرات کا مسلک بڑا طاقتور نظر آتا ہے جو ذمی کے قصاص میں مسلمان قاتل کے قتل کی رائے رکھتے ہیں۔ دوسری طرف حضرت علیؓ کی مذکورہ حدیث کا سیاق بتلاتا ہے کہ روای جس وقت کی گفتگو نقل کررہا ہے اس وقت حضرت علیؓ کا مقصد اس کے سامنے مکمل حدیث نقل کرنا نہیں تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک مخصوص ذہنیت کے زیر اثر بلکہ سازش کے تحت یہ افواہ اڑائی گئی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کو کچھ ایسے راز بتائے ہیں جو کسی اور کو نہیں بتائے اور دین کی کچھ تعلیمات صرف انہی کو دی ہیں۔ حضرت علیؓ سے کسی نے استفسار کیا تو انہوں نے کہا: نہیں خدا کی قسم نہیں، ہاں اس صحیفہ میں کچھ احکام ہیں، سائل نے پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: دیت کے احکام، قیدیوں کو رہا کرانے کے احکام اور مسلمان کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے[1]۔

روایت کا یہ سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ حضرت علی نے اس صحیفے کی پوری احادیث اور مکمل احکام نقل کرنے کی نیت نہیں کی تھی، بلکہ وہ صرف اور صرف ان احادیث اور احکام کے عناوین نقل کر رہے تھے اور ان احکام کی طرف اشارے کر رہے تھے جو ان کے صحیفے میں تھے۔ ورنہ پورے صحیفے میں یہ مشکل سے ایک سطر تو نہیں ہوگی جو اس روایت میں نقل کی گئی ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ دوسری روایات میں آں حضرت کا یہ حکم کسی قدر مکمل شکل میں آیا ہے، ان میں ہے کہ: **لا یقتل مسلم بکافر ولا ذو عهد في عهده**[2] "نہیں قتل کیا جائے گا کوئی مسلمان کسی کافر کے بدلے اور نہ کوئی ذمی ذمی ہوتے ہوئے"۔ یہ اس سلسلہ کی نسبتہً مکمل حدیث ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی مراد یہ ہے کہ کوئی مسلم یا ذمی کسی کافر (یعنی دارالحرب کے

---

[1] صحیح بخاری: ۱۱۱

[2] سنن نسائی، حدیث: ۴۷۵۳ بسند صحیح

کافر) کے بدلے قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ جس کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہ کرنے کا حکم دیا گیا آگے حدیث میں اسی کافر کے بدلے ذمی کو بھی قتل نہ کئے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔

مصنف عبدالرزاق[1] میں صحیح سند سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ فرمان منقول ہے کہ ذمی کے قتل کی سزا میں قصاص جاری کیا جائے، اور اس پر عمل راوی کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ آخر زمانہ میں سلطنت عثمانیہ نے صدیوں اسی قانون پر عمل کیا۔

بہر حال اس رائے کے حاملین نے حدیث کا یہی مطلب قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک شریعت کے عام احکام سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے، ہماری حدیث وفقہ کی کتابوں میں طرفین کے دلائل کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح ذمی کی دیت کے سلسلے میں روایات کا اختلاف ہے۔ مگر احناف کا مسلک اس سلسلے میں یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں وہ فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ البتہ اس وقت یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انصاف کے بنیادی اور عمومی تقاضوں کے پیش نظر یہی راجح معلوم ہوتا ہے، خصوصاً اس لیے کہ شریعت کا نظام یہ ہے کہ دیت قاتل سے نہیں بلکہ اس کے (عاقلہ) یعنی قبیلے یا دیگر اہل تعلق سے وصول کی جائے گی۔ اگر قصاص میں قتل کا ڈر نہ ہو تو بدبختوں کے لیے ذمیوں کا قتل آسان ہو جائے گا۔

ذمی کے مال کی حفاظت:

شریعت نے اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ اپنے غیر مسلم شہریوں کے مال کا تحفظ، ان کی کمزوری کے پیش نظر، ترجیحی بنیاد پر کرے۔ ظلم اور ظالم کے لئے جو وعیدیں قرآن وسنت میں آئی ہیں ان سب کا اطلاق اہل ذمہ پر ظلم پر ہوتا

---

۱ ۱۰۱/۱۰

ہے۔قرآن نے ظالموں پر اللہ کی لعنت اور جہنم کی وعیدیں سنائی ہیں۔

لیکن چوں کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم کمزور ہو سکتے ہیں، اس لئے خصوصاً ان پر ظلم کرنے والے کے لئے رسول اللہؐ نے الگ سے شدید وعیدیں سنائی ہیں۔ سنن ابوداؤد میں آتا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔

”من ظلم معاهداً ، او انتقصه حقاً، أو اخذ منه شيئاً بغير طيب نفس منه فأنا حجيجه يوم القيامة“

جو کسی ذمی پر ظلم کرے، یا اس کا کوئی حق مارے یا اس سے کچھ بغیر اس کے دل کی خوشی کے لے لے تو یاد رکھے قیامت کے دن میں اس کے خلاف اللہ کی عدالت میں نالش کروں گا۔

مدینہ کے ایک یہودی کے چار درہم حضرت ابن ابی حدرد پر ادھار تھے۔ اس نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ وہ قرض واپس نہیں کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ قرض واپس کرو۔ انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، میں نے اس سے وعدہ کرلیا ہے کہ جیسے ہی کچھ آئے گا دے دوں گا۔ آپؐ نے پھر کہا: اسے اس کا حق واپس کرو۔ انہوں نے پھر عذر کیا، مگر عدالت نبوی نے قرض کی ادائیگی کا حکم برقرار رکھا۔ آخر وہ مجبور ہوئے اور اپنی پگڑی کا تہبند باندھ کر اپنے جسم کے کپڑے اتار کر بیچے اور کسی طرح قرض ادا کیا۲۔

اس سے قانونی سطح پر ذمیوں کے حقوق کے تحفظ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے شام کے فتح ہونے کے موقع پر اس کی عیسائی آبادی کے سلسلہ میں اپنے گورنر فاتح شام حضرت ابوعبیدہ کو خط میں لکھا کہ: خبردار، مسلمان ذمیوں پر ظلم نہ کرنے پائیں، اور ان کا مال ناجائز نہ ہڑپ کیا جائے۳۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ

---

۱ ابوداؤد، حدیث: ۳۰۵۲ ۲ مسند احمد حدیث نمبر ۱۵۴۲۸

۳ فتوح البلدان صفحہ: ۱۴۴

میں اسی قانون پر عمل ہوتا آیا ہے۔

حکومتی امداد و اعانت:

دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلامی نظام سیاست و حکومت میں عوامی بہبود کو ریاست اور حکومت کی ذمہ داری بلکہ مقصد وجود بتایا گیا ہے۔ شریعت نے حکومت کو عوام کی بہتر بود و باش کے انتظامات کا ذمہ دار بنایا ہے۔ زمانے کے تمدن کے لحاظ سے حکومت عوام کی فلاح و بہبود اور ترقی کی ذمہ دار قرار پائے گی۔ ذمی شہری بھی اس سلسلہ میں مسلمانوں کے مثل ہیں۔

قرآن نے سورۂ حج کے آخر میں اسلامی ریاست کے بنیادی کردار کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی انسانی بہبود اور فلاحی کردار کا تذکرہ کیا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ

(الحج: ٤١)

اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اور ایک جگہ حکم دیا گیا ہے کہ غیر مسلم ضرورت مند بھی تمہاری مالی مدد کا مستحق ہے۔ اس کی مالی مدد کی جانی چاہیے۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ کسی کو ہدایت دینا یا نہ دینا یہ تمہارا کام نہیں، اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، تم اس خیال سے کسی کی مالی مدد سے ہاتھ نہ روکو کہ وہ اسلام قبول نہیں کرتا، تم اللہ کے راستے میں جو خرچ کرو گے اس کا بدلہ پاؤ گے۔

لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (البقرۃ:۲۷۲)

اس آیت کا سیاق بتلاتا ہے کہ انسانوں کی مالی مدد کے وقت یہ دیکھنا ضروری نہیں کہ کون اسلام کو قبول کرتا ہے کون نہیں۔ ہر ضرورت مند مستحق ہے۔

امام ابن جریر طبری اس آیت کی تشریح میں کہتے ہیں کہ اس آیت میں حکم دیا گیا کہ غیر مسلموں کو صدقے سے محروم نہ رکھا جائے۔ طبری نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ علماء صحابہ و تابعین نے اس آیت سے یہی معنی اخذ کیے ہیں[1]۔

اسی طرح ایک حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ حکومت سارے ہی عوام کی فلاح اور بہبود کی ذمے دار ہے:

من ولاه الله من امر الناس شيئا فاحتجب عن حاجاتهم وخلتهم وفاقتهم احتجب الله يوم القيامة عن حاجته و خلته وفاقته

جس کسی کو اللہ تعالیٰ انسانوں کی کسی جماعت کا حکمراں بنائے اور پھر وہ اپنے عوام کی پریشانیوں اور غربت کی فکر نہیں کرے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی پریشانی میں اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا یعنی عذاب میں ڈال کر بھول جائے گا[2]۔

حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابوبکر کے زمانے میں حیرہ فتح کیا۔ اس کی اطلاع دینے کے لئے مرکز خلافت کو جو خط لکھا اس میں لکھا کہ "میں نے ذمیوں کو یہ حق دیا ہے کہ ان میں جو بوڑھا و بیکار ہو جائے، یا کسی پر کوئی آفت آ جائے، یا کوئی مالدار غریب ہو جائے تو اس کا جزیہ (ٹیکس) معاف کر دیا جائے گا، اور اس کا اس کے اہل و عیال کا تکفل حکومت کے بیت المال سے کیا جائے گا"[3]

---

[1] تفسیر طبری، ۳۰/۶۳

[2] سنن البیہقی الکبریٰ: ۲۰۰۴۵

[3] الخراج، ابو یوسف، صفحہ: ۱۴۴

حضرت عمر نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو غربت سے بدحال دیکھا تو کہا: ہم نے تمہارے ساتھ یہ تو کوئی انصاف نہیں کیا کہ جوانی میں تم نے ریاست کو ٹیکس دیا، اب جب تم کمانے سے معذور ہو تو ہم تمہاری کوئی فکر نہ کریں۔ پھر اس کے لیے حکومت سے مستقل وظیفہ جاری کیا۔ (انساب الاشراف: ۳ر۲۱۴)۔ حضرت عمر کا یہ ارشاد صاف طور پر اس کا اظہار ہے کہ ریاست کو ٹیکس دینے کے نتیجے میں غیر مسلم اپنی مدد اور کفالت کے اسی طرح حقدار ہوتے ہیں جس طرح مسلمان۔

ابوعبید نے اپنی کتاب الاموال میں روایت ذکر کی ہے کہ حضرت عمر ابن عبد العزیز نے اپنے زمانے میں مشرقی مفتوحات کے دارالحکومت بصرہ کے گورنر مردِ صالح عدی ابن ارطاۃ کے نام حکم نامہ لکھا کہ اہل ذمہ کے ضعیف اور نادار لوگوں کے لیے حکومت کے خزانے سے مستقل وظائف کا انتظام کی جائے۔

اس دور میں خاص طور پر اس کی ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں قرآن وسنت میں جو احکام اور ہدایتیں آئی ہیں ان کے عموم میں ذمی کس طرح داخل ہیں اس کو بتفصیل بتایا جائے۔ مگر افسوس اس دور میں جو تحریریں اس سلسلے میں آئی ہیں وہ اس سے خاموش ہیں۔

حسن سلوک کی تاکید:

اس کے علاوہ خاص طور سے تاکید کی گئی کہ اہل ذمہ کے ساتھ شریفانہ حسن سلوک کیا جائے۔ رسول اللہؐ نے صحابۂ کرام کو وصیت فرمائی کہ جب مصر فتح ہو تو اس کے باشندوں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، اور اس حسن سلوک کو واجب قرار دینے والے دو اسباب کا تذکرہ فرمایا، ایک ذمی ہونے کی حیثیت سے ہم وطنی کا رشتہ، دوسرا حضرت اسماعیل کا ننھیال مصر میں ہونا[۲]۔

---

[۱] ۱ر۱۱۵ [۲] صحیح مسلم ۲۵۴۳

ظاہر ہے کہ پہلا سبب تو بہر حال ہر ذمی اور مفتوح کو حاصل ہے۔

غالباً مفتوح اہل ذمہ کی فطری کمزور حیثیت اور مذہبی بیگانگی کی رعایت کا ہی پہلو ہے کہ علامہ ابن عابدین کہتے ہیں کہ علماء کے نزدیک ذمی پر ظلم زیادہ بڑا گناہ ہے[1]۔ اسی ذیل میں فقہاء لکھتے ہیں کہ "مسلمان کو جو حق حاصل ہیں وہی ذمی کو بھی، یہاں تک کہ اس کی غیبت تک کرنا حرام ہے"[2]۔

ترقی کے مساوی امکانات:

مسلم ریاست میں ہر غیر مسلم شہری کے لئے تجارت وکسب اور ترقی وتعلیم کے مساوی امکانات ہونا ضروری ہیں۔ فقہاء اسلام نے اس سلسلہ میں صاف تصریحات کی ہیں کہ ان کو اس سلسلہ میں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ بلکہ عہد عمری کی تاریخ ہم کو ان بے شمار اقدامات، اسکیموں اور مہموں کی خبر دیتی ہے جن کا مقصد مفتوح علاقوں اور ان کے باشندوں کی اقتصادی ترقی سے تھا۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے، لیکن حکومت اسلامیہ اہل ذمہ کی اقتصادی ترقی کے لیے کس قدر ہمدردانہ اور فراخدلانہ پالیسی پر گامزن تھی اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مصر میں، جو اس وقت اسلامی ریاست کے تابع ایک غیر مسلم آبادی کا ملک تھا، اور اس کی کھیتی تو سو فی صد اہل ذمہ ہی کے ہاتھ میں تھی، ایک لاکھ بیس ہزار مزدور مستقل سردی گرمی ہر موسم میں نہریں کھودنے اور آب پاشی کے لیے تالابوں اور نالیوں کی کھدائی پر لگے رہتے تھے۔ اور حکومت ان کی تنخواہ دیتی تھی[3]۔

اسلامی ریاست اہل ذمہ کی اقتصادی ترقی اور بہبود کے لیے کتنا خرچ کرتی تھی صرف اس واقعے سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

1۔ (رد المحتار: ۳۵۱/۴) 2۔ (حوالۂ بالا)

3۔ المواعظ والاعتبار للمقریزی: ۹۶/۱، نیز حسن المحاضرۃ للسیوطی: ۵۱/۱

فصل دوم

مذہبی آزادی

مذہبی آزادی اسلام کے بنیادی اصولوں میں ہے۔ فطرت انسان اس حق کو تسلیم کرتی ہے، اور جابر معاشروں میں بھی سلیم الفطرت لوگ اس مسلمہ انسانی حق کو ثابت مانتے ہیں۔ اولین زمانوں میں رسول اسلام اور مسلمانوں نے غیر مسلم معاشرے میں اسی فطری حق کی بنیاد پر ہی آزادی اختیار مذہب کا مطالبہ کیا تھا۔ اور قرآن نے عربوں کے مذہبی جبر اور فتنہ کو ہی وہ عظیم ظلم بتایا تھا جس کی بنیاد پر ان سے جنگ کی جا رہی تھی۔

اسلام ہر زمانے میں دنیا کے ہر معاشرے سے مطالبہ کرتا ہے کہ یہ فطری انسانی حق بہر حال محفوظ رہنا چاہئے، اور اسی بنیاد پر مسلمانوں کو ہر معاشرے میں اللہ کا پیغام پہنچانے اور باطل ادیان و افکار اور گمراہانہ طریق زندگی سے لوگوں کو روکنے کی کھلی آزادیاں ہونی چاہئے۔

جب مسلمان دوسری ملتوں اور معاشروں سے اس آزادی کے طلب گار ہیں تو یقیناً انصاف کا تقاضا تھا کہ ان کا دین خود سب سے پہلے اعلان کرتا کہ ''لا إکراہ فی الدین'' دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔

دراصل اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں اکیلا حق ہے اس کے علاوہ جو کچھ نظریات، افکار اور جذبات واعمال ہیں سب باطل و ناحق۔ اس کا اعلان ہے کہ وہ اللہ

جل وعلا کا نازل کردہ دین ہے۔ اتنے بڑے دعوے کو وہ دلائل سے ثابت بھی کرتا ہے اور اسی کو روح کائنات اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ بھی بتاتا ہے۔ اس بنیاد پر اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف دعوت وابلاغ اور نصیحت وموعظت ہی پر اکتفا کرے، کسی زور زبردستی سے کام نہ لے اور اعلان کردے کہ جو اس دعوت کو رد کردے گا خداوند جبار اس کو آخرت میں شدید عذاب سے دوچار کرے گا۔ اسی لیے قرآن نے صاف کہہ دیا کہ:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ

(الکہف: ۲۹)

کہہ دو! حق صرف تمہارے رب کی طرف سے (نازل ہونے والا دین) ہے۔ اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی بے انتہا محبت عطا فرمائی تھی۔ آپ کے دل میں شفقت کا سمندر ہر وقت موج زن رہتا تھا۔ آپ کی نہایت شدید خواہش تھی کہ سارے لوگ حق وصداقت کو مان کر اللہ کے دردناک عذاب سے بچ جائیں اور سعادت ابدی کو پا جائیں۔ آپ کی یہ شدید خواہش کبھی کبھی ایک بے قرار جذبے کی شکل اختیار کر لیتی۔ ایسے ہی ایک موقعے پر قرآن نے رسول اللہ کو مخاطب کر کے کہا:

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (یونس:۹۹)

کیا تم لوگوں پر زبردستی کرو گے کہ وہ مومن بن جائیں؟؟

فقہاء نے اسی اصول کے پیش نظر صاف صراحتیں کی ہیں کہ اسلام قبول کرانے کے لیے کسی قسم کا دباؤ جائز نہیں ہے۔ ابن قدامہ مقدسی نے امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ کے حوالے سے صراحت کی ہے کہ اگر

بالفرض زبردستی کسی کو اسلام پر مجبور بھی کیا گیا تو بھی اس کا اسلام معتبر نہیں ہوگا[1]۔

اسلام پر مذہبی جبر کا الزام؟

یہ نہایت جھوٹا الزام ہے کہ اسلامی تاریخ کے کسی دور میں بھی زبردستی لوگوں کو مسلمان بنایا گیا۔ اس الزام میں صداقت کا کوئی ذرہ بھی نہیں۔ مگر مستشرقین اور مشرق و مغرب کے ان کے شاگردوں نے اس الزام کو بارہا اور ہر بار بلا ثبوت لگایا ہے۔ ستمبر ۲۰۰۶ء جب پوپ بینیڈکٹ نے جرمنی میں اپنا وہ بدنام زمانہ لیکچر دیا جس میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر یہ جھوٹا الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے متبعین کو تلوار کے ذریعے اسلام پھیلانے کی تعلیم دی۔ پوپ کا بیان دینا تھا کہ ساری دنیا میں اس الزام کی ایک گونج نہیں گرج سنائی دینے لگی۔

اسی وقت ایک اسرائیلی سابق ممبر پارلیمنٹ اور ایک یہودی دانشور یوری آونیری نے اس نامعقول الزام کا زبردست جواب : "Mohommad's Sword" کے نام سے لکھا جو مغربی ذرائع ابلاغ میں متعدد زبانوں میں چھپا تھا۔ راقم سطور نے اسی وقت انگریزی سے اس کا اردو ترجمہ الفرقان بابت دسمبر ۲۰۰۶ء میں کیا تھا۔ مقالہ کی خاص اہمیت کی وجہ ایک یہودی کے قلم سے آں حضرتؐ کے دفاع کے علاوہ یہ خاص بات ہے کہ اس میں عیسائی دنیا کو خصوصاً کیتھولک پوپ کو ان کی ماضی کی تاریخ کا آئینہ دکھایا گیا ہے اور مسلمانوں کی تاریخ عروج میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیسا فراخ دلانہ انسانی معاملہ کیا گیا اس کے شاندار شواہد پیش کیے گئے ہیں۔ یہ الزام چونکہ دہرایا جاتا رہتا ہے اس لیے اس مقالے کے کچھ اقتباسات ذیل میں دیے جارہے ہیں:

...... پوپ نے کہا ہے کہ محمد نے اپنے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ان کے

---

[1] المغنی: ۹۶/۱۰

مذہب کو تلوار کی دھار سے پھیلائیں۔ پوپ کے نزدیک یہ ''مخالف عقل و منطق'' (Unreasonable) ہے۔ تلوار سے جسم مطیع ہو جاتا ہے روح و عقل نہیں جھکتے۔

پوپ نے اپنے دعوے کو مضبوط کرنے کے لیے ساری دنیا میں صرف ایک بیزنطینی بادشاہ کے قول سے استدلال کیا ہے۔ جس کا تعلق ان کے حریف و مخالف مشرقی چرچ سے تھا۔ اس کی حکمرانی کا دور چودھویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ تھا، شاہ مینوئیل دوم پیلیولوگس کی طرف منسوب ہے کہ اس نے ایک نامعلوم ایرانی مسلمان دانشور سے ایک گرما گرم بحث میں کہا: مجھے دکھاؤ محمد نے کیا نئی بات کہی ہے۔ تم کو ان کے یہاں صرف بدی اور غیر انسانی چیزیں ہی ملیں گی۔ مثلاً ان کا حکم کہ ان کا مذہب تلوار کے ذریعہ پھیلایا جائے۔

یہاں تین سوالات اٹھتے ہیں (۱) مینوئیل دوم نے یہ بات کیوں کہی ؟ (۲) کیا اس نے واقعی ایسا کہا تھا؟ (۳) پوپ نے اس کو اس وقت کیوں نقل کیا؟

جس وقت مینوئیل دوم نے اپنی یہ تحریر لکھی تھی وہ اس وقت ایک دم توڑتی سلطنت کا سربراہ تھا۔ وہ ۱۳۹۱ میں تخت نشین ہوا، عظیم سلطنت روما کے صرف چند صوبے ہی اس وقت اس کے پاس بچے تھے۔ اور اس بچے کھچے پر بھی ''عثمانی خطرہ'' منڈلا رہا تھا۔ عثمانی ترکوں نے نہر دانوبے کے ساحلوں تک اپنے پرچم لہرا دیے تھے۔ بلغاریہ اور شمالی یونان ان کے زیر تسلط آ چکے تھے۔ مشرقی رومن سلطنت کو بچانے کے لیے دو بار یورپ کی فوجیں آئیں مگر عثمانی سیلاب کے آگے کوئی باندھ رکتا نہیں تھا۔ مینوئیل کی موت کے بس چند برس بعد کی بات ہے کہ قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) ترک گھوڑوں کی ٹاپوں

سے گونج رہا تھا، یہ ٹاپیں ایک عظیم سلطنت کی زائد از ہزار سالہ تاریخ کے اختتام کا اعلان تھیں۔
مدد حاصل کرنے کے لئے اپنے عہد حکومت میں مینویل نے یورپ کی راجدھانیوں کے بڑے چکر کاٹے۔ اس نے چرچ کو ایک مرتبہ پھر متحد کرنے کا وعدہ کیا۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس نے اپنی یہ مذہبی تحریر اس لیے لکھی ہوگی کہ وہ عیسائی ممالک کو عثمانی ترکوں کے خلاف بھڑکا کر اپنے دفاع کا سامان کرے۔ مقصد خودغرضانہ تھا، مذہب سیاست کے لیے استعمال کیا جارہا تھا۔
اس پس منظر میں یہ اقتباس جس لیے اس وقت لکھا گیا تھا، اسی مقصد کے تحت اِس وقت پوپ کے ذریعے نقل کیا گیا ہے۔ موجودہ دور کے بادشاہ (Emperor) جارج بش کی مدد ہی اس کا اصل مقصد ہے۔ جو عیسائی دنیا کو "بدی کے محور" (مسلمانوں) کے خلاف متحد کرنے میں جی جان سے لگا ہوا ہے۔......
کیا مینویل کی بات میں سچائی کا کوئی حصہ ہے؟
خود پوپ کو اندازہ تھا کہ وہ کچھ غلط کہہ رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی سورہ ۲ کی آیت ۲۵۶ میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ مذہب کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ (پوپ کی سنگین غلطی یہ آیت ۲۵۶ نہیں ۲۵۷ ہے۔ یاد رہے کہ کیتھولک چرچ پوپ کو معصوم عن الخطا کہتا ہے۔)
پھر قرآن کی ایسی صاف بات کیسے نظر انداز کی جاسکتی ہے؟ پوپ کو لگا کہ اتنی صاف اور غیر مبہم آیت کے موجود ہوتے ہوئے ان کی بات مضحکہ خیز نہ بن جائے۔ اس لیے انہوں نے یہ تاویل کی کہ یہ آیت اس وقت کی ہے جب محمد کمزور تھے، بعد میں انہوں نے تلوار کے زور

سے تبلیغ کرنے اورلوگوں کومسلمان بنانے کے احکام دیے تھے۔
مگر! ذرا رکیے۔ قرآن میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے۔ ہاں محمد نے اپنے مخالف قبائل، یہودیوں، عیسائیوں اور عرب کی دیگر جماعتوں کے خلاف جنگ کا حکم دیا تھا۔ جب وہ اپنی ریاست قائم کر رہے تھے۔ مگر اس کا مقصد تلوار سے اسلام پھیلانا نہیں تھا۔
مسیح کہتے ہیں کہ 'بیج اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے'' آیئے دیکھیں اسلام کے بیج نے جو مسلمان پیدا کیے کیا انہوں نے تلوار کے زور سے اپنی مفتوح قوموں سے اسلام قبول کروایا؟ جب وہ طاقت کے اعتبار سے اس پوزیشن میں تھے کہ وہ تلوار کے زور سے اپنی مرضی مسلط کر سکیں کیا اس وقت انہوں نے زبردستی اپنا مذہب پھیلایا؟
یقیناً اور بلاشبہ انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ اس جرم سے پاک ہے۔ مسلمانوں نے صدیوں یونان پر حکومت کی۔ کیا یونانی سب کے سب مسلمان ہو گئے؟ کیا کسی نے ان کو مسلمان بنانے کی کوشش بھی کی؟ بلکہ اس کے بالکل برخلاف عیسائی یونانیوں کو عثمانی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں سے نوازا گیا۔ بلغاریہ، ہنگری، سربیا، رومانیہ اور یورپ کی دوسری قومیں ترکوں کے زیر اقتدار رہیں، اور وہ اپنی عیسائیت پر برقرار رہیں۔ کسی نے ان کو اسلام پر مجبور کیا؟ اگر بوسنیہ اور البانیا کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تو سب جانتے ہیں کہ یہ ان کا اپنا آزادانہ قومی انتخاب تھا۔
۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے یروشلم فتح کیا، اور اس کے مسلمانوں اور یہودیوں کا قتل عام کیا۔ اس سے پہلے فلسطین ۴۰۰ سال مسلمانوں کے قبضے میں رہ چکا تھا، مگر اس کی اکثریت عیسائی باقی رہی۔ ان چار صدیوں میں ان پر اسلام مسلط کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

صلیبیوں کے وہاں سے نکالے جانے کے بعد وہاں کی اکثریت نے اسلام قبول کیا۔

اسی طرح کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں پر اسلام تھوپا گیا ہو۔ سب جانتے ہیں کہ مسلم اسپین میں یہودیوں کو جو عروج نصیب ہوا وہ تقریباً حالیہ دور تک ان کو کہیں نہیں حاصل ہوا۔ یہودا اور ہاوی جیسے یہودی شاعروں نے عربی میں اپنے فن کے شگوفے کھلائے۔ اسلامی اسپین میں یہودی وزیر بھی تھے، سائنٹسٹ بھی تھے اور شاعر بھی۔ مسلم طلیطلہ میں عیسائی یہودی اور مسلمان دانشوروں نے مل کر قدیم یونانی فلسفے اور سائنس کی کتابوں کا عربی ترجمہ کیا۔ وہ انسانی تہذیب کا یقیناً سنہرا دور تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا تھا، اگر محمد نے "اسلام کو تلوار سے پھیلانے" اور غیر مسلم کو تلوار کے نوک پر رکھنے کی تعلیم دی ہوتی۔

دوسری طرف عیسائی دنیا کا کیا حال رہا ہے وہ تو مزید اس قابل ہے کہ اس کو کہا جائے اور سنایا جائے۔ عیسائیوں نے جب اسپین کو دوبارہ فتح کیا تو انہوں نے مذہبی دہشت گردی کی حکومت قائم کی۔ سنگدلانہ معاملے نے یہودیوں اور مسلمانوں کے سامنے صرف تین راستے رکھے تھے۔ یا عیسائی ہو جائیں۔ یا سب ذبح کر دیے جائیں یا ملک چھوڑ دیں۔ جن لاکھوں یہودیوں نے اپنا مذہب چھوڑنے سے انکار کیا وہ کہاں گئے؟ ان کو ہجرت کرنا پڑی۔ ان کو مسلم ملکوں میں کھلے دل سے خوش آمدید کہا گیا۔ Shephardi (اسپینی) یہودی مغرب میں مراکش سے لے کر مشرق میں عراق تک اور شمال میں بلغاریہ سے لے کر جو اس وقت عثمانی سلطنت کا حال تھا جنوب میں سوڈان تک کے مسلم علاقوں میں بس گئے۔ کہیں ان پر مذہبی جبر نہیں ہوا۔ ان کو کہیں نسل کشی، اجتماعی ہجرت، مذہبی جبر اور قتل و

خونریزی جیسی ان چیزوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جن کا سامنا ان کو تقریباً ہر عیسائی ملک میں کرنا پڑا۔ ہولوکاسٹ تو اس سلسلہ کی محض ایک کڑی تھی۔

کیوں؟ اس لیے کہ قرآن کھل کر اہل کتاب کے ساتھ اچھے سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ ہر ایماندار یہودی جو اپنی قوم کی تاریخ سے واقف ہے وہ اپنے آپ کو دل کے خلوص کے ساتھ اسلام کا احسان مند مانے گا۔ جس اسلام نے یہودیوں کو پچاس نسلوں تک تحفظ دیا۔ جب کہ عیسائی دنیا نے ان پر لگا تار ظلم کیا اور ایذا رسانی کے تحت رکھا، اور بارہا کوشش کی کہ ان کو "تلوار کے ذریعہ" اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کردیں۔

بہر حال "اسلام کا تلوار سے پھیلنا" ایک بدترین افسانہ ہے۔ جو ان جھوٹی داستانوں میں سے ہے جو یورپ نے مسلمانوں کے ساتھ جنگوں کے زمانے میں گڑھی تھیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ پوپ نے یہ نامعقول بات کیوں دہرائی؟

اس کا بس ایک ہی سبب ہے اور کچھ نہیں۔ اس کو بش اور ان کے ایوانجیلسٹ حامیوں کی اسلام کے خلاف "صلیبی جنگ" کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بش کے آقاؤں کو دنیا کے تیل کے ذخیروں پر قبضہ کرنے کی بے حیا کوششوں کو جواز فراہم کرنے کیلیے کچھ بہانوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ ضرورت پوپ پوری کر رہا ہے۔

تاریخ میں ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا ہے کہ طمع و لالچ کے ننگے شیطانوں کو مذہبی چوغے پہنائے جا رہے ہیں، اور ان کی عریاں ہوسنا کیوں پر تقدس کی مالائیں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا ہے کہ ڈاکوؤں کے شب خون کو مقدس جنگ قرار دیا جا رہا ہے۔

پوپ کی تقریر اسی قسم کی حرکت ہے۔"[1]

عبادت گاہوں کا تحفظ:

اسلام نے اپنی حکومت کے تحت رہنے والے غیر مسلم شہریوں کی جان ومال، عزت وآبرو کے علاوہ مکمل مذہبی آزادی کی گارنٹی دی ہے۔ ان کو اپنے مذہب کے مطابق عقائد رکھنے، عبادت کرنے اور بود وماند کے طریقے اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

رسول اللہؐ نے نجران کی عیسائی آبادی کو ذمی بنایا اور ان کو ہر طرح کی مذہبی آزادی دی، بلکہ ان کے تحریری معاہدے میں اس کی صراحت کی گئی کہ ان کے طریقہ عبادت، ملی قوانین، مذہبی نظام اور عہدوں اور اوقاف میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جائے گی[2]۔

بیت المقدس کے عیسائیوں کو حضرت عمرؓ نے جو تحریری امان لکھ کر دی تھی طبری نے اس کی پوری عبارت نقل کی ہے۔ اس میں جان ومال اور مذہبی مقامات ورسوم یہاں تک کہ صلیبوں تک کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے[3]۔

دو مشکل مسئلے:

یہاں دو مشکل مسائل ہیں جن کی تحقیق کی بھی ضرورت ہے اور ان کو صحیح طور پر سمجھنے کی بھی۔ ان دونوں مسئلوں پر غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا غبار چھا گیا ہے۔ ان پر تحقیق اور تدبر کی نظر نہ ڈالنے سے بڑی الجھنیں پیدا ہوئی ہیں۔

---

[1] (انگریزی میں یہ مقالہ انٹرنیٹ پر اس ایڈریس پر پڑھا جاسکتا ہے:

(zope.gush-shalom.org/home/en/channels/avnery/1159094813

[2] (سنن ابوداود، ۳۰۴۳)

[3] (تاریخ طبری، ذکر فتح بیت المقدس)

۱- پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کیا اہل ذمہ اسلامی ملک میں نئے معابد نہیں بنا سکتے؟

اس سلسلے میں قرآن وسنت پر وسیع نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن اور رسول اللہؐ نے اس سلسلہ میں کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی رو سے اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کو اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر سے روکا جائے۔ خلافت راشدہ کے دور میں حضرت عمرؓ کے زمانے کی فتوحات میں جو لوگ ذمی بنائے گئے ان کو عمومی طور پر عبادت گاہوں کے بنانے کی اجازت دی گئی، صرف ''امصار المسلمین'' میں ان کو اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر سے روکا گیا۔

بڑی تعداد میں لوگوں کو اس سلسلے میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ اسلامی شریعت میں یہ مستقل قانون ہے کہ غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر نہیں کرنے دی جائے، عجب قسم کی موضوع روایتیں ہیں جو قرآن وسنت کے عمومی مزاج وہدایات اور حقیقتِ واقعہ دونوں کے خلاف ہے۔ ہم آگے ان پر کچھ تفصیل سے کلام کریں گے۔

مصنف ابن ابی شیبہ اور امام ابو عبید کی الاموال میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے یہ منقول ہے کہ ''امصار المسلمین'' میں غیر مسلموں کو عبادت خانے بنانے اور شعائر دینی کے علانیہ اظہار کی اجازت نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اور اس جیسی دوسری روایات جو یہ بتاتی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں غیر مسلموں کو ''امصار المسلمین'' میں اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر سے روکا گیا تھا، ان میں سے کوئی بھی روایت ثابت نہیں ہے۔ فقہاء اس سلسلے میں حضرت ابن عباس سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک سائل کے جواب میں یہ فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کے بسائے ہوئے شہروں میں اہل ذمہ اپنی عبادت گاہیں تعمیر نہیں کر سکتے۔ حضرت ابن عباس سے یہ روایت یہ بھی صراحت نقل کرتی ہے کہ البتہ ان کے قدیم

وجدید شہروں میں یہ حکم نافذ نہیں ہوگا۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ کی المصنف[1] میں ہے۔ مگر اس کا مدار حنش نامی جس راوی پر ہے وہ متروک ہے۔ ابن قدامہ نے اس کو مسند احمد کی طرف منسوب کیا ہے مگر یہ اس میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شروط عمریہ کے نام سے بھی یہ رائے ملتی ہے۔ ہم آگے شروط عمریہ کی سندی حیثیت پر کلام کریں گے[2]

لہٰذا پہلی بات تو یہی ہے کہ حضرت عمر کے دور میں ایسی کوئی ممانعت ہونا ثابت ہی نہیں۔ لیکن اگر ایسا بہت ہی محدود دائرے میں ہوا بھی تو اس کو غلط طور پر سمجھا گیا، اس لیے یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

۱- ان روایات میں صراحت ہے کہ اس سے صرف وہ شہر مراد ہیں جو مسلمانوں نے نئے بسائے۔ ابن قدامہ نے اسی مسئلے کی تفصیل کے طور پر اس بات کی تصریح کی ہے۔ ''امصار المسلمین'' اس زمانے میں مفتوح ملک کی وہ نئی آبادیاں کہلاتی تھیں جو مسلمان اپنی فوجی چھاؤنیوں اور انتظامی مرکز کے طور پر بناتے تھے۔ کوفہ و بصرہ اور مصر میں فسطاط ایسے ہی شہر تھے۔ واضح رہے کہ پورے کے پورے مفتوح علاقے (یعنی عراق سے لے کر شام و مصر اور شمالی افریقہ کے علاقے) غیر مسلموں کے ہی تھے، انہوں نے ایک عرصے کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ یہ سارے علاقے وہ تھے جہاں غیر مسلموں کو عبادت گاہوں کی تعمیر اور شعائر دین کے اظہار کی عام اجازت تھی[3]۔ ان میں گنتی کے چند شہر تھے جو مسلمانوں نے نئے بسائے تھے۔ افسوس کہ لوگوں نے پہلی غلطی تو یہ کی کہ ''امصار المسلمین'' کا مطلب مسلمانوں کے شہر سمجھا۔

---

[1] ۶۳۴/۷

[2] تفصیل کے لیے التلخیص الحبیر اور نصب الرایہ بیہقی کی سنن کبریٰ اور دیگر کتابیں ملاحظہ ہوں۔

[3] مصنف ابن ابی شیبہ: ۶۳۴/۷

حالاں کہ یہ خالصۃً ایک اصطلاح تھی جس کا مطلب صرف وہ شہر تھے جو فتح کے بعد مسلمانوں نے نئے بسائے تھے۔ اور جن کو سیکورٹی اور دیگر وجوہات سے اپنے لئے خاص کرلیا تھا۔ باقی علاقوں کے بارے میں یہ حکم نہیں۔ ہمارے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مفتوح ممالک کی قدیم آبادیوں اور غیر مسلموں کی نئی بستیوں میں ان کو اپنے عبادت خانے قائم کرنے سے نہیں روکا جائے گا۔ چاہے ان میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہی کیوں نہ آباد ہو[1]۔

حضرت خالد بن الولیدؓ نے شام کے مفتوح علاقے ''عانات'' کے لوگوں کے بارے میں لکھا تھا کہ:

ولهم أن يضربوا نواقيسهم في اى ساعة شاؤا من ليل أو نهار، إلا في أوقات الصلاة وان يخرجوا الصلبان في أيام عيدهم.

ان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دن رات جب چاہیں اپنے ناقوس بجائیں، سوائے نماز کے اوقات کے، اور اپنی عید کے دنوں صلیب کے جلوس نکالنے کا حق حاصل ہے۔

۲- دوسری غلط فہمی یہ ہوئی اور خدا جانے اس کا سبب کیا تھا کہ ضعیف روایات میں آنے والے اس انتظامی اور خالص انتظامی فیصلہ کو شرعی حکم سمجھ لیا گیا۔ ان روایات کے بموجب اہل ذمہ کے حق میں یہ فیصلہ صرف ایک انتظامی فیصلہ تھا۔ ان ضعیف روایات میں بھی اس کی کسی شرعی بنیاد کا تذکرہ اور حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ یعنی ضعیف روایات میں بھی ان احکام کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ صحابہؓ کرام کے عہد حکومت میں ایسا کسی شرعی دلیل کی بنیاد پر کیا گیا۔ یہ غلطی صرف اسی مسئلہ میں نہیں ہوئی بلکہ ذمیوں کے سلسلے کے بہت سے احکام سیکورٹی کے مقصد سے اور حکومت اور

---

[1] بدائع: ۱۱۳/۷

مسلمانوں کو کسی دھوکے سے بچانے کے لئے دیئے گئے تھے لوگوں نے ان کو شریعت اور قانون سمجھ لیا۔

اس سلسلے میں اصل بات یہی ہے کہ، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، رسول اللہؐ سے ایسا کوئی حکم ثابت نہیں ہے کہ غیر مسلموں کو عبادت گاہوں کی تعمیر سے روکا جائے گا۔ چند بے اصل قسم کی روایتوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو ایسا کچھ نہیں بچتا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں یہ حکم دیا گیا ہو یا حکومت کی یہ عام پالیسی رہی ہو یہ بھی ثابت نہیں ہے۔

اگر مسلمانوں کے زیر اقتدار اور اسلامی حکومت کے زیر سایہ مشرک کے مراکز بننا جائز نہیں ہوتے، اور، جیسا کہ بعض حضرات کا دعویٰ ہے، یہ چیز ایک اسلامی حکومت کے مقصد وجود کے منافی اور اس کے لئے ناقابل برداشت منکر ہوتی تو اس میں ''امصار المسلمین'' اور دیگر آبادیوں میں کیا فرق؟؟ آپ اس بنیادی اور اہم سوال پر غور کریں گے تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ احکام صرف امن عامہ اور کسی فساد و بدامنی سے بچنے کے مقصد سے دیئے گئے تھے۔ اسی لئے تاریخی روایات میں آیا ہے کہ احکام دیئے گئے تھے کہ ذمی مسلمانوں کی آبادیوں میں اپنے مذہبی جلوس نہ نکالیں، نماز کے اوقات میں ناقوس نہ بجائیں خنزیر لے کر مسلمانوں کے علاقوں میں نہ جائیں، امام یوسف کی کتاب الخراج اور تاریخ طبری میں صاف صراحتیں ہیں کہ یہ ممانعتیں مسلمانوں کے مجمع اور احاطوں کے اندر ہیں۔

یقیناً حضرت عمر اور خلفائے راشدین کے احکام کی حیثیت سنت متبوعہ کی ہے، مگر علم و حکمت اور فقہ و دانائی کا تقاضہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ کون سے احکام سیاست و انتظام کے مقصد سے دیئے گئے ہیں اور وہ سیاسی اور انتظامی صورت حال کے بدلنے سے خود بخود بدل جائیں گے، اور کون سے احکام کی حیثیت شرعی قوانین کی

ہے۔انتظامی اور سیاسی مصالح پر مبنی حکموں کو شرعی اور قانونی حیثیت دینا خود ایک طرح کی تحریف ہے۔

یقیناً اور بلاشبہ غیر مسلموں کو اسلامی ممالک میں اپنی بے ضرر عبادت گاہیں بنانے کی اجازت دینا جائز ہے۔ رسول اللہؐ نے اس سے کبھی منع نہیں فرمایا۔ اس سلسلہ میں جو روایتیں لوگ ذکر کرتے ہیں وہ اگر کچھ مستند حیثیت رکھتی ہیں تو صریح نہیں ہیں بلکہ ان میں ایسی کوئی بات کہی ہی نہیں گئی ہے۔ اور اگر وہ صریح اور واضح ہیں تو بے اصل اور موضوع ہیں۔

یہ خوب لطیفہ ہے کہ آپ کسی کو مسلم ممالک میں اپنی عبادت گاہوں تک کے بنانے کی اجازت نہ دیں، اور پھر یہ دعویٰ کریں کہ ہم ان کو مذہبی آزادی دیتے ہیں۔ کیا پوری کی پوری قوم کو ایسے دباؤ میں رکھنا ''اکراہ'' نہیں ہے؟؟ عالم عرب کے بعض خود ساختہ علماء اور ''اسلامی مفکرین'' اور غلو کے شکار لوگوں نے باقاعدہ یہ مہم چھیڑی ہے کہ عرب ممالک خصوصاً مصر و شام کی عیسائی آبادیوں کے عبادت گاہیں ڈھانا (بلکہ اور بھی ناگفتہ بہ اہانت آمیز اقدامات) مسلمانوں کا دینی فریضہ ہیں۔ کس قدر بے حیا خود غرضی کی بات ہے کہ یورپ میں جانے والے مسلمان وہاں اپنے لئے عبادت گاہیں قائم کریں، گرجے مسجدوں میں تبدیل کرنے کی اجازتیں مانگیں، اور ان کے قیام میں حکومت سے مراعاتیں لیں، اور اپنے ملکوں میں مطالبے کریں کہ گرجے اور عبادت گاہیں ہرگز نہ قائم کی جائیں!!

غیر مسلموں کی اہانت نہیں کی جائے گی:

ایک غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو ذلیل کر کے اور دبا کے رکھا جائے۔

اس سلسلے میں جس آیت کو پیش کیا جاتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلاَ يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْن

(سورۂ توبہ آیت:۲۹)

اہل کتاب جو کہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہوکر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں۔ (ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اس آیت میں جنگ کی انتہا کی شرط بتائی گئی ہے کہ وہ" وھم صاغرون" کی حیثیت قبول کریں،"صاغرون" عربی مادہ Rout "ص، غ، ر" سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس مادہ کے بعض الفاظ میں ذلت کے معنی آتے ہیں، اور اسی بنیاد پر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اسلامی ریاست میں ذمیوں کو کمتر اور حقیر بنا کر رکھا جائے گا۔

آیت جزیہ کا صحیح مفہوم:

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس لفظ میں تابع ہوجانے اور بڑائی اور تکبر چھوڑ دینے کے معنی بھی آتے ہیں۔ مشہور امام لغت ابن منظور نے لکھا ہے کہ صغار عظمت کی ضد ہے (لسان العرب، مادہ ص غ ر)۔ محقق علماء نے یہاں اسی معنی کو مراد لیا ہے۔

امام شافعی الام میں فرماتے ہیں:

وإذا أخذ منهم الجزية أخذ ها بإجمال...... ولم يقل لهم قبيح والصغار أن يجري عليهم الحكم لاأن يؤذوا[1]

ذمیوں سے جزیہ خوبصورتی اور نرمی سے لیا جائے......ان سے کوئی بری

---

[1] الام: ۴/۲۲۰ طبع دارالفکر

بات نہ کہی جائے۔قرآن میں جس ’’صغار‘‘ کا تذکرہ ہے اس کا مطلب بس یہ ہے کہ ان کے اوپر ریاست کے قوانین کا نفاذ ہو، نہ کہ یہ کہ ان کو ستایا جائے۔

کچھ خراسانیوں نے اہل ذمہ کو ذلیل کرنے کی بات کہی تو امام نووی اور دیگر فقہاء نے اس کو باطل و بے اصل بات کہا، مغنی المحتاج میں ہے:

یہ طریقہ باطل ہے، اور اس کو مستحب یا ضروری کہنا اس سے زیادہ غلط[1]

ابن القیم کہتے ہیں:

الصغار هو التزامهم لجريان احكام الملة عليهم، واعطاء الجزية، فان التزام ذلك هو الصغار[2]

آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ ’’صغار‘‘ یہ ہے کہ وہ مسلم حکومت کی قانونی برتری تسلیم کرلیں اور جزیہ ادا کریں، بس ان کو قبول کرلینا ہی ’’صغار‘‘ ہے۔

مگر یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اس سب کے باوجود یہ کہنا مشکل ہے کہ ’’صاغرون‘‘ کا لفظ تحقیر و ذلت کے مفہوم سے بالکل خالی ہے اور اس کے معنی صرف مسلمانوں کی حکومت کو قبول کرلینا ہیں۔ بلکہ عربی زبان کے اہل ذوق تصدیق کریں گے کہ ’’صغار‘‘ میں ذلت کا مفہوم ضرور ہے۔

لیکن اس کے باوجود صحیح بات یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے وفادار غیر مسلم شہریوں کو ذلیل کرنا شریعت کا حکم نہیں ہے، بلکہ اس کے خلاف ہے۔ یہاں اصل بات جس کی طرف توجہ نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم آیات کے تاریخی پس منظر شان نزول نیز سیاق قرآنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس آیت پر غور کی نگاہ ڈالتے

---

[1] مغنی المحتاج شرح المنهاج، فصل فی الامان

[2] أحكام أهل الذمة: ١/٤١

ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس میں اسلامی ریاست کے اطاعت گزار اور وفادار غیر مسلم شہریوں کی تذلیل کا حکم نہیں ہے، بلکہ آیت اس وقت نازل ہو رہی ہے جب دشمن جنگ کر رہا ہے اور اس نے ابھی اطاعت قبول نہیں کی ہے۔ آیت محارب وتوسیع پسند اور متکبر رومی طاقتوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی، (جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں)۔ اس سیاق میں اور جاری جنگ کے ماحول میں حکم دیا گیا ہے کہ ''ان رومیوں سے جنگ کرو، اور اس وقت تک کرتے رہو جب تک یہ جھک کر اور ذلیل ہو کر تمہاری اطاعت و باج گذاری قبول نہ کرلیں''۔ یعنی یہ محارب دشمن کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اس کو ''صغار'' اور ذلت پر اتارو، نہ کے ریاست کے عام غیر مسلم شہری کے بارے میں۔ یعنی محارب طاقت جب جھک جائے شکست تسلیم کر کے اطاعت قبول کرلے تو اب عام شہریوں کے لئے یہ صغار اور ذلت کا حکم باقی نہیں رہے گا، اسلامی ریاست کے شہری بننے سے پہلے جب جنگ جاری تھی تو کہا گیا تھا کہ اس وقت تک ان سے برسر پیکار رہو جب تک یہ ذلت کے ساتھ سر تسلیم خم نہ کر دیں۔

لہذا اگر اس بنیادی نکتے کو ذہن میں رکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ اس آیت میں محاربین کی تذلیل وتحقیر کا پہلو تو ضرور ہے۔ اور ہر قوم اپنے دشمنوں، خصوصاً جنگجو دشمن کے خلاف فوجوں اور عوام کے درمیان اسی قسم کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ پھر جب یہ جنگ عام جنگ نہ ہو، راہ حق کے لئے جاں بازی اور اللہ کے دین کے دشمنوں سے کشمکش ہو، تب تو یہ بڑا اہم اور ضروری پیغام ہوتا ہے کہ ''ان بدبختوں اور ظالموں کے تکبر کو خاک میں ملانے تک جنگ کرو''۔ یہیں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے بے ضرر غیر مسلم شہری اس ''حکم صغار'' میں مراد نہیں ہیں۔

اس تفسیر کی خالص علمی وفنی تعبیریوں کی جائے گی کہ ''حتی'' حکم قتال کی

غایت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اور قتال کی انتہا صغار کے ساتھ جزیہ قبول کر لینا ہے، نہ کہ جزیہ دینا۔ یہی وجہ ہے کہ بالاتفاق جیسے ہی محارب قوم جزیہ پر راضی ہو گی قتال رک جائے گا، وہ عملاً جزیہ دینے تک نہیں چلے گا۔ ہمارے مفسرین نے یہاں اس کی صراحت کی ہے کہ قتال کی انتہا کے طور پر جو "جزیہ دینا" کہا گیا ہے اس سے مراد "جزیہ دینے پر راضی ہو جانا" ہے (حاشیہ: "حتی یعطوا أی یقبلوا أن یعطوا" تفسیر ابوسعود وروح المعانی، سورہ توبہ آیت: ۲۹)۔ لہذا یہ "وھم صاغرون" جزیہ پر راضی ہونے کے وقت کا حال ہے نہ کہ جزیہ دینے کے وقت کا، اب اس آیت کا یہ مفہوم ہوا کہ محارب اور جنگ کرنے والی حکومت سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک وہ جھک کر ذلیل ہو کر شکست تسلیم نہ کر لے۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ آیت غیر مسلم شہریوں اور اہل ذمہ کے لئے مستقل "صغار" کا حکم نہیں بیان کر رہی ہے۔ ان شاء اللہ اہل علم کے لئے اب کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا۔

رسول اللہؐ کا اسوہ:

ابن القیمؒ نے اس آیت کی تشریح میں پہلے تو ان لوگوں کے بعض اقوال نقل کئے جو ذمیوں کی تحقیر کو اس حکم کا تقاضا سمجھتے ہیں، پھر ان کے اس خیال کی تردید میں کہتے ہیں:

> وهذا كله مما لا دليل عليه ولا هو مقتضى الآية، ولا نقل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا عن الصحابة انهم فعلوا ذلک، والصواب فی الآية ان الصغار هو التزامهم لجريان احكام الملة عليهم، واعطاء الجزية، فان التزام ذلک هو الصغار[1]

ان سب باتوں کی کوئی دلیل نہیں ہے، نہ یہ آیت کا مطلب ہے نہ رسول

[1] (احکام أهل الذمة: ۱/۲۱).

> اللہؐ اور صحابہ کرام نے ایسا کیا، آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ ''صغار'' یہ ہے کہ وہ مسلم حکومت کی قانونی برتری تسلیم کرلیں اور جزیہ ادا کریں، بس اس کو قبول کرلینا ہی ''صغار'' ہے۔

علامہ ابن قیم نے یہاں قرآن وحدیث کے نصوص کی تفسیر کے ایک نہایت بنیادی اصول کی طرف اشارہ کیا ہے، رسول اللہؐ کی سنت اور صحابہ کرام کے عمل سے الگ کر کے قرآن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی، حروف والفاظ کے مجموعوں اور جملوں اور فقروں کی تفسیر وتشریح میں نہ جانے کیا کیا غلط فہمیاں ہوسکتی ہیں، تعبیر وتشریح اور Interpretation کے نام پر بائبل میں کس طرح تحریف ہوئی ہے وہ اس کی مثال ہے۔ قرآن کی حفاظت کا ایک معجزاتی پہلو یہ ہے کہ آیات واحکام قرآنی کی تشریح اور اس کے حدود ومعیار کو متعین کرنے کے لئے ہمارے پاس رسول اللہؐ کا اسوہ ہے۔ اور اس اصول کی بنا پر ہم قطعی طور پر اور پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت کی تشریح میں یہ تصور اور اس پر مبنی ہر رائے بالکل غلط ہے کہ اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری ذلیل بنا کر رکھے جائیں گے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس کے بالکل خلاف ہے۔

رسول اللہؐ کے زمانے میں اسلامی ریاست میں بسنے اور اس کی اطاعت قبول کرنے والے غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ آپؐ نے ان کے ساتھ عملاً جو برتاؤ کیا، ان کی جو قانونی حیثیت اور سماجی مقام اپنے طرز عمل سے متعین فرمائے، وہ ہی در اصل شریعت کا قانون اور مسلم ریاستوں کے لئے رہنما پالیسی ہے۔

حدیث کی کتابوں اور سیرت ومغازی کی معتبر روایات کا اتفاق ہے کہ رسول اللہؐ کے ماتحت جو اولین اسلامی ریاست قائم ہوئی تھی، اور جو سدا کے لیے اسلامی ریاست کا رول ماڈل اور کامل ترین نمونہ ہے، اس میں ریاست کے عام شہریوں کی

اہانت اور تذلیل کا قصد نہیں کیا گیا۔

مکہ فتح ہوا تو مکی سرداروں کی ایک تعداد نے اطاعت قبول کی لیکن اسلام نہیں لائے، آپ نے ان کو تحفوں سے نوازا یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئے اور اسلام کے جاں نثار بنے۔

فتح مکہ کے بعد ہی نجران نے اطاعت قبول کی، نجران جنوب عرب میں رومی حکومت کے تابع عیسائی آبادی والا ایک منطقہ تھا۔ یہ لوگ باقاعدہ جزیہ دینے والے ذمی قرار پائے۔ ان کا وفد مدینہ منورہ آیا، ذمیوں کے اس وفد کے ساتھ رسول اللہؐ نے جو معاملہ فرمایا وہ تاریخ وسیر اور حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ آپؐ نے ان کو اپنی مجلس میں ٹھہرایا، انہوں نے اپنی عبادت کرنی چاہی تو صحابہ نے روکنے کا ارادہ کیا، مگر آپؐ نے صحابہ کو منع کیا اور عیسائیوں نے مسجد نبوی ہی میں اپنی عبادت کی[1]۔

سن سات ہجری کے بعد کا واقعہ ہے، اور ہو سکتا ہے کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہونے کے بعد کا ہو، یعنی بہر حال اسلام کے مدینہ میں قوت وقدرت حاصل کرنے کے بعد کا واقعہ ہے، کہ مدینہ کے ایک طاقتور مشرک شخص سے حضرت بلال نے کچھ قرض لیا۔ وہ قرض اسلامی ریاست کی بعض ضروریات (غرباء کی امداد) کے لئے رسول اللہ کی ایماء پر لیا گیا تھا، اس تاجر نے خود ہی حضرت بلال سے کہا تھا کہ اس قسم کی ضروریات کے لئے کسی اور کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے تم مجھ سے لے لیا کرو۔ اچانک ایک دن عین اذان کے وقت تاجروں کے ایک گروہ کے ساتھ آدھمکا اور حضرت بلال سے نہایت ترش روئی اور بدتمیزی سے مخاطب ہوا: او حبشی! تجھے یاد ہے؟ بس چار دن بچے ہیں! اگر وقت پر قرض ادا نہیں ہوا تو تجھے پکڑ کر بکریاں چرانے پر لگا دوں گا‘‘۔ بے چارے ڈر گئے، حضورؐ کے پاس پہنچے اور قصہ کہہ سنایا، اور چند دنوں کے لیے فرار ہونے

---

[1] دلائل النبوۃ بیہقی: ۵/ ۳۹۰

کا ارادہ کیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد فدک سے کچھ مال آ گیا اور حضرت بلال نے قرض ادا کیا[1]۔

یہ واقعہ عہد نبوی میں ذمیوں کو دبا کر اور ذلیل کر کے نہ رکھے جانے کا واضح ثبوت ہے۔

زید بن سعنہ ایک یہودی مذہبی عالم تھے، مالدار اور باحیثیت و مشہور۔ ان کے اسلام لانے کا بڑا موثر قصہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے۔ ان سے رسول اللہؐ نے کچھ قرض کا معاملہ کیا، وہ جان کر وقت پورا ہونے سے پہلے آ پہنچے اور مجمع عام جب آپؐ صحابہ کرام کے ساتھ ایک جنازہ میں تھے آپؐ کے کپڑے پکڑ کر کہا: محمد! قرض نہیں واپس کرو گے؟ مجھے تمہارے پورے خاندان کا حال معلوم ہے۔ حضرت عمرؓ شدت غضب سے سرخ ہو گئے، چیخ اٹھے کہ: او خدا کے دشمن! میرے سامنے تیری یہ مجال؟ دیکھ! اگر خوف خدا دامن گیر نہ ہوتا تو تیرا سر دھڑ سے جدا ہو چکا ہوتا"۔ آں حضرتؐ سکون و ضبط کی تصویر بنے رہے، آپؐ نے حضرت عمر کی طرف نظر اٹھائی، دیکھا اور کہا: عمر! حق تو یہ تھا کہ تم مجھ سے جلد ادائیگی اور اس سے خوش معاملگی کو کہتے۔ جاؤ، قرض بھی دے دو اور الگ سے میری طرف سے کچھ ہدیہ بھی۔ عمر کی تلوار تو رک گئی، مگر اخلاق نبوی کی اس تلوار نے زید بن سعنہ کو قتل کر ڈالا۔ فوراً اسلام قبول کیا اور حضرت عمر سے تنہائی میں بتایا کہ میں نے یہ حرکت بس امتحان اور پرکھنے کے لئے ہی کی تھی[2]۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں اس روایت کی توثیق کی ہے۔

عہد نبوی کا ایک اور واقعہ جس سے غیر مسلم شہریوں کا مدینہ میں ہر قسم کے دباؤ سے آزادی اور حکومتی اہانت و تذلیل سے محفوظ ہونے کا پتہ چلتا ہے حدیث کی متعدد

---

1. سنن ابوداؤد، ۳۰۰۰
2. صحیح ابن حبان، ۲۸۸/۱

کتابوں میں آیا ہے۔ آپؐ کے پاس شدید گرمی گاڑھے کے دو کپڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا، پسینہ سے وہ کپڑے بوجھل ہو جاتے۔ ایک یہودی کپڑے کے تاجر کے یہاں شام سے بہتر کپڑا آیا ہوا تھا، حضرت عائشہ نے کہا: ادھار منگوا لیجئے، آپ نے کسی کو بھیجا، تاجر بد طینت ہی نہیں بدزبان بھی تھا۔ کہنے لگا: جانتا ہوں محمد مال ہڑپ کرنا چاہتے ہیں، آپؐ نے بس اتنا فرمایا: جھوٹا، جانتا ہے کہ میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور سب سے بڑھ کر امانت دار ہوں[1]۔

حدیث کے ذخیرہ میں اس سلسلے کے واقعات بہت سے ملتے ہیں، اسلامی ریاست اپنے وفادار غیر مسلم شہریوں کو کس نظر سے دیکھتی ہے اس کی سب سے تفصیلی مثال ہم کو اس تحریری دستور کی دفعات میں ملتی ہے جس کی بنیاد پر مدینہ کی ریاست کا قیام عمل میں آیا تھا، تاریخ وسیر کی کتابوں سے اس دستور اساسی کی دفعات میں مدینہ کے یہود کے حقوق و ذمہ داریاں متعین کی گئی ہیں، یہ دستور صاف صراحت کرتا ہے کہ رسول اللہ کی سربراہی میں ایک ریاست کا قیام عمل میں آچکا ہے، یہود کی حیثیت اس میں محکوم شہریوں ہی کی ہے، جزیہ کا نام نہیں ہے۔ لیکن زکاۃ کا نام بھی نہ ہونا بتاتا ہے کہ نام اس وقت تک طے نہیں ہوئے تھے۔ ورنہ ریاست کے لئے یہود کی مالی ذمہ داریاں طے کی گئی ہیں، اور ان سے مشترکہ طور پر دفاع میں حصہ لینے کا بھی عہد لیا گیا ہے جو جزیہ کے قائم مقام ہے۔

یہ دستور ابن اسحاق واقدی، ابن سعد اور دیگر اصحاب سیر کے یہاں تفصیل سے ملتا ہے، حدیث کی کتابوں میں اس کے متفرق اجزاء آئے ہیں۔

بہر حال یہ دستور صاف اور واضح ہے کہ اولین اسلامی ریاست نے غیر مسلم شہریوں کی عزت نفس کو کسی طرح مجروح کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ دنیاوی

---

[1] سنن نسائی، باب البیع الی الاجل المعلوم، و مسند احمد ۲۵۱۸۴

حقوق واختیارات میں وہ مسلمانوں کے برابر نظر آتے ہیں۔ یہ دستور اور اوپر مذکور مثالیں حافظ ابن القیمؒ کے اس بیان کی تصدیق ہیں کہ ”ذمیوں کی تذلیل کا تصور نہ آیت سے اخذ کیا جاسکتا ہے اور نہ رسول اللہؐ کا اور صحابہ کرام کا ایسا عمل تھا“۔

قرآن کی عمومی تعلیمات:

آیت جزیہ کے صحیح معنی طے کرنے کے لیے خود قرآن کی عمومی تعلیمات پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن نے ایک ایسی صورت میں جس کا اصل موضوع مسلمانوں کو دشمن کفار سے لاتعلقی اختیار کرنے پر زور دینا تھا صاف کہا کہ:

لَا یَنۡهٰـکُمُ اللّٰـهُ عَنِ الَّـذِیۡنَ لَمۡ یُقَـاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡـرِجُوۡکُـمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ۔ (الممتحنہ)

اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف و برابری کا معاملہ کرنے سے نہیں روکتا جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور تم کو اپنے گھروں سے نہیں نکالا۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ظالم اور جنگجو قسم کے لوگوں کے علاوہ تمام غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی وہ تعلیمات جن میں احسان و مدد اور تکریم انسانی کی عمومی ترغیب دی گئی ہے باقی رہیں گی۔ علم و فہم اور سلیم العقلی کا تقاضہ ہے کہ نصوص کو مجموعی طور پر لیا جائے نہ کہ کسی ایک پر سرسری اور سطحی نظر رکھی جائے اور حکم کے مقصود و مدعا کو نظر انداز کر کے اور پس منظر سے آنکھیں موند کے اس کی حرفی تفسیر کی جائے اور باقی نصوص کو بھول جایا جائے۔

”شروط عمریہ“ کا مسئلہ:

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب عراق و شام اور افریقہ کے وسیع و عریض

علاقے فتح ہوئے اور بڑی تعداد میں قومیں ذمی بنیں اور تاریخ شاہد ہے کہ خوشی خوشی ذمی بنیں اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے خلاف لڑیں۔ تاریخ کی بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اس وقت ان پر کئی ذلت آمیز احکام لاگو کیے گئے، مثلاً پرانی عبادت گاہوں کی مرمت وتجدید نہیں کی جائے گی۔ سر کا اگلا حصہ منڈائیں گے، زین کس کر گھوڑے پر نہیں بیٹھیں گے، مسلمانوں کے لئے کھڑے ہوا کریں گے۔ جس مسلمان کے ساتھ تجارت میں شرکت کریں گے فیصلہ اسی مسلمان کے ہاتھ میں ہوگا، وغیرہ۔ یہ سب بے اصل اور موضوع قسم کی روایتیں ہیں۔

اس سلسلہ میں جو اصل اور سب سے مشہور روایت ہے، جس میں آتا ہے کہ اہل شام نے خود اپنی طرف سے لکھ کر یہ شرطیں قبول کی تھیں، یہ روایت بالکل موضوع ہے۔ ابن القیمؒ نے اپنی کتاب میں اس کو تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور اس کی پوری تشریح کی ہے۔ اس کی سند میں ایسے روای بھی ہیں جن کے بارے میں محدثین نے، وضاع، کذاب، خبیث، عدو اللہ جیسے الفاظ کہے ہیں[1]۔

یہی روایت ایک اور سند سے خلال نے (جو امام احمد کے صاحب زادے عبداللہ کے شاگرد ہیں، انہی عبداللہ کے حوالے اور سند سے نقل کی ہے، ابن القیم نے احکام اہل الذمۃ میں نقل کر کے اس کو اعتبار بخش دیا ہے، ان کی سند میں بعض راویوں کا نام "من أهل العلم" کہہ کر مبہم رکھا گیا ہے۔ بعض علماء نے اس کو مسند احمد کی ان روایات میں سے گمان کیا ہے جو امام احمد کے صاحب زادے عبداللہ کے اضافوں میں سے ہیں۔ مگر مجھے یہ روایت مسند میں باوجود تلاش بسیار کے نہیں ملی۔ ابن القیم نے یہ روایت تین حوالوں سے نقل کی ہے یہ تینوں ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ایک

---

[1] اس سند سے یہ روایت بیہقی کی سنن (۲۰۲/۹) میں ہے شیخ البانی نے اس پر اپنی کتاب إرواء الغلیل (۱۰۳/۵) میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔

مستقل باب "ذکر ما اشترط صدر هذه الامة عند افتتاح الشام" کے عنوان سے قائم کرکے نقل کی ہیں، ابن عساکر کے یہاں اس کی ایک مزید سند ملتی ہے، ان چار میں سے دو تو وہ ہیں جن پر ہم اوپر کلام کر چکے ہیں مزید دونوں بھی نہایت کمزور ہیں، ایک میں نامعروف راویوں کے علاوہ عبداللہ بن احمد ابن ربیعۃ ابن زبر ہیں جو نہایت مخدوش راوی ہیں[1]۔ دوسری بھی نامعروف راویوں کی سند سے آئی ہے۔

یہ اس روایت کے ظاہری قسم کے عیوب ہیں۔ لیکن اہل نظر محدثین کے نقطۂ نظر سے اس کا اصل اور سب سے بڑا ایک اور عیب ہے، اور وہ یہ کہ فن حدیث کے تنقیدی نظام میں اگر کوئی واقعہ غیر معمولی قسم کا ہو اور اس کی طرف توجہ و نظر کا ملتفت ہونا فطری ہو، پھر وہ نہایت نایاب قسم کی روایت میں آتا ہو، عام طور پر علماء و راویان حدیث اس کو روایت نہ کرتے ہوں تو محدثین اس کو نہایت مخدوش مانتے ہیں۔ یہ ایک بالکل فطری حقیقت ہے کہ اگر ایسی غیر معمولی شرائط پر کچھ علاقے فتح ہوتے تو ان کو کثیر تعداد میں راوی نقل کرتے۔ ایک طویل عرصے تک ان روایت کا چھپا رہنا جب کہ ان کے شہرت کے ساتھ منقول ہونے کے اسباب بہت تھے یہ خود ان کے بے اصل ہونے کی دلیل ہے۔ زیر نظر روایت کا یہی سب سے بڑا عیب ہے۔ یہ خلال سے پہلے کسی مصنف و جامع حدیث کے یہاں نہیں ملتی، بلکہ خلال کی کتاب احکام الملل جس کے حوالے سے یہ نقل کی گئی ہے پتہ نہیں اب موجود بھی ہے یا نہیں۔ حالانکہ اس کے مندرجات ایسے عجیب قسم کے اور اس قدر متوجہ کرنے والے ہیں کہ اس کو علما ضرور نقل کرتے۔ وہ تمام محدثین و مورخین جنہوں نے ان فتوحات کی تاریخ لکھی مثلاً طبری، بلاذری اور واقدی وغیرہ اور وہ محدثین اور فقہا جنہوں نے اہل ذمہ کے مسائل پر قانونی دفعات مرتب کیں مثلاً امام ابو یوسف، ان میں سے کسی کے یہاں یہ روایت

---

[1] لسان المیزان ۲۵۳/۳

نہیں ملتی۔ ہمیں اس کا تذکرہ عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ کے مصنف میں بھی نہیں ملتا جن میں نہایت تفصیل سے اہل ذمہ کے قانونی حقوق وذمہ داریوں پر روشنی ڈالنے والے آثار وواقعات لکھے ہیں۔ ملتا ہے تو کہاں؟ خلال کی نامعروف کتاب الجامع لاحکام الملل کے حوالے سے ابن قیم کی کتاب میں، اور خلال کے بھی زمانوں بعد تاریخ دمشق میں۔ صدیوں یہ معاہدہ اہل علم کی نظر سے اوجھل رہا۔ یہ خود اس کو آخری درجہ ضعیف ٹھیرانے والی بات ہے۔

محدثین کے یہاں کسی روایت کا یہ عیب کہ باوجود واقعے کے غیر معمولی ہونے اور نقل وروایت پر آمادہ کرنے والے اسباب کے پائے جانے کے اس کو عام طور پر نقل نہ کیا جائے اور وہ نہایت نادر یا کمزور روایتوں میں پایا جائے اور حدیث کی اہم کتابیں اس سے خالی ہوں، کسی روایت کا یہ عیب محدثین کے یہاں اس کو بے اصل اور موضوع قرار دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

ہم یہاں ایک مثال کے ذریعے محدثین کے اس اصول کی وضاحت کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں وہ روایت نقل کی ہے جس کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ ایک مرتبہ سوتے رہ گئے اور عصر قضا ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے سورج واپس آیا اور حضرت علیؓ نے نماز عصر ادا پڑھی۔ ابن کثیر نے متعدد روایات اس سلسلے کی نقل کیں اور ان پر تنقید کی۔ اپنی بحث میں انھوں نے دو جگہ اس روایت کا یہی مذکور عیب بتایا۔ ایک مقام پر کہتے ہیں:

> کوئی عقل والا کیسے سوچ سکتا ہے کہ یہ اہم واقعہ حضرت علی نقل کریں اور ان کے ..... فلاں فلاں معروف شاگردوں کو اس کی ہوا نہ لگے اور دوسرے غیر معروف اس کو روایت کریں؟ پھر ائمۂ حدیث: مالک، صحاح ستہ اور معروف سنن اور صحاح وحسان اور مسانید کے مصنفین کا اس کو نقل نہ

کرنا اس کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ اس لیے کہ (راویوں کے بقول) یہ واقعہ علانیہ ہو رہا ہے اور اس کے نقل اور روایت کیے جانے کے قوی اسباب کثرت سے موجود ہیں۔ اس کے باوجود یہ واقعہ صرف منکر اور ضعیف سندوں سے نقل ہو رہا ہے، یہ اس کے بے اصل ہونے کی بڑی دلیل ہے[1]۔

اس سے پہلے بڑی وضاحت سے اس قاعدے کو بیان کرتے ہیں:

ومثل هذا الحديث لا يقبل فيه خبر واحد اذا اتصل سنده، لأنه من باب ما تتوفر الدواعي على نقله فلا بد من نقله بالتواتر والاستفاضة لا اقل من ذلك.

یہ حدیث ایسی بات روایت کر رہی ہے جس کے نقل و روایت کیے جانے کے اسباب کثرت سے موجود ہیں، ایسے واقعات میں صحیح و متصل خبر واحد بھی نہیں قبول کی جائیگی، اس طرح کے واقعات میں تو شہرت و تواتر ہی درکار ہے[2]۔

اس روایت کے متن میں ہمیں کثرت سے ایسی داخلی شہادتیں ملتی ہیں جو کسی صاحب نظر مؤرخ کی نگاہ میں اس کے مشتبہ بنانے کے لیے کافی ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ روایت بتاتی ہے کہ یہ سخت اور ذلت آمیز شرطیں خود مفتوح علاقوں کے عوام نے اپنے اوپر نافذ کی تھیں۔ بھلا کہیں مفتوح کی شرطوں پر معاہدے ہوا کرتے ہیں؟؟ شرطیں ہمیشہ فاتح کی طرف سے لکھی جاتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس سے پہلے حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں دوسرے علاقوں میں اس سے کہیں زیادہ آسان اور سہل شرطوں پر لوگوں کو عہد اور اطاعت میں لیا گیا تھا، ہم ان معاہدوں کی بعض تفصیلات اوپر نقل کر

---

[1] البدایہ والنہایہ ۶/۹۲ مختصراً

[2] حوالہ بالا ۶/۸۷

چکے ہیں، تفصیل کا یہ موقع نہیں ابن جریر اور ابن کثیر اور بلاذری کے یہاں یہ معاہدے ملتے ہیں۔ اور شبلیؒ نے ان میں سے کئی الفاروق میں نقل کیے ہیں۔ تو یہ کیا ہوا تھا ان علاقے والوں کو کہ وہ اپنی طرف سے اپنے لیے سخت شرطوں کا مطالبہ کریں؟ پھر حضرت عمر جیسے عادل شخص سے یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ دوسرے علاقوں کی طرح اہل شام سے بھی انصاف کا معاملہ ہی کریں۔ اور مزید یہ کہ تاریخ شاہد ہے کہ ذمیوں کے ساتھ مسلمانوں نے کبھی یہ معاملہ نہیں کیا۔ کس تاریخ میں آتا ہے کہ مسلمانوں نے پکڑ پکڑ کر ذمیوں کے سر کے اگلے بال کاٹے؟

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ یہ شرائط ان مشہور چیزوں میں سے ہیں جو بے اصل ہونے کے باوجود مشہور ہو جاتی ہیں۔

غیر مسلم شہریوں کے لباس کا مسئلہ:

البتہ لباس کے سلسلے میں ہم کو تاریخ و سیر اور امام ابو یوسف کی کتاب الخراج وغیرہ کتب میں متعدد حوالے اس کے ملتے ہیں کہ اہل ذمہ فلاں لباس پہنیں فلاں نہ پہنیں۔ متعدد لوگوں کو یہاں سخت دھوکا ہوا ہے کہ یہ ان کو نیچا بنا کر رکھنے کی پالیسی تھی۔ اللہ جزائے خیر دے شبلیؒ کو، الفاروق میں اچھی طرح اس غبار کو صاف کر دیا۔ متاخرین نے غلط فہمی سے عموماً مسلمانوں اور غیر مسلم ذمیوں کے درمیان لباس کے فرق کو ذلت کے اظہار کے لئے سمجھا حالانکہ ان کو بس یہ حکم تھا کہ وہ عربوں اور مسلمانوں کا سا لباس نہ پہنیں اور اپنے قومی لباس کو نہ بدلیں۔ اس میں ذلت کا کوئی پہلو نہیں تھا۔

ہم اگر مسئلہ کو اس پہلو سے دیکھیں تو دو باتوں کا علم ہوتا ہے، پہلی تو یہ کہ حکم یک طرفہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کا منصفانہ پہلو یہ تھا کہ خود عرب مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں اور عجمیوں کی نقالی کرنا منع تھا، رسول اللہؐ نے تو پہلے ہی اس سے روکا تھا، حضرت عمر

نے بھی اپنے بعض گورنروں کو ہدایت دی کہ نگرانی رکھیں مسلمان دوسروں کی نقالی نہ کریں۔

دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ ذمیوں کو مسلمانوں کی لباس و ہیئت میں نقالی سے روکنے کی اصل حکمت نہ ان کو ذلیل کرنا تھا اور نہ (جیسا کہ بعض اہل علم نے ماضی قریب میں سمجھا ہے) ان کی قومی خصوصیات کا تحفظ اور محکوم قوم کو احساس کمتری سے بچانا تھا۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں کی قومی خصوصیات کے تحفظ کی کیا پڑی تھی؟ بلکہ یہ ایک انتظامی اور دفاعی حکم تھا، جس کا منشا فاتح طاقت کے اندیشے تھے۔ ایسے علاقوں میں جہاں ایک نئی قوم نے فتوحات کی ہیں اور ابھی پورے طور پر دلوں کو فتح کرنے اور ان کے درمیان اسلام پھیلنے میں فطری طور پر کچھ وقت درکار ہے، حضرت عمر نے یہ احکام جاری کیے کہ ان لوگوں کو اس سے روکا جائے کہ مسلمانوں کی سی ہیئت اختیار کریں۔ تاکہ کسی آدمی کی شناخت ہو سکے۔ یہ اسی طرح کے مقاصد تھے جن کے لیے آج حکومتیں شہریوں کو شناختی کارڈ جاری کرتی ہیں۔ا۔ آج بھی حفاظتی اور امن عامہ کے مصالح کی خاطر مذہب ہی نہیں یہ تک درج کرواتی ہیں کہ اس کارڈ کے حامل شخص کے ماں باپ کی اصل قومیت و نسل اور مقام پیدائش کیا تھے۔ اس وقت ایسے شناختی کارڈوں کا رواج نہیں تھا جن کے ذریعہ کسی شخص کی قومیت و مذہب کا علم ہو سکے لہذا یہ پابندی کہ اہل ذمہ ''اپنا لباس'' ہی پہنیں، دراصل سلامتی اور سیکوریٹی کے ایسے ہی مقاصد کے لیے تھا جن کے لیے آج کی حکومتیں یہ تفصیلات شناختی کارڈوں میں درج کرواتی ہیں۔

اگر اس بے اصل روایت میں آئی ناقابل قبول باتوں اور نامعقول اضافوں سے الگ کر کے صرف معتبر روایتوں کو دیکھیں تو ان کا خلاصہ وہی نکلتا ہے جو حضرت امام ابو یوسف نے اپنی کتاب الخراج میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے

اپنے ان احکام کی علت وحکمت یہی قرار دی تھی کہ "حتی یعرف زیهم من زی المسلمین"[1] یعنی: تا کہ ان کی ہیئت ولباس کا مسلمانوں سے امتیاز کیا جاسکے۔

اپنے قارئین کے لئے ہم ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی یاد دہانی مناسب سمجھتے ہیں کہ ان احکام کی حیثیت شرعی وقانونی ہرگز نہیں تھی، نہ یہ کتاب اللہ میں آئے ہیں، اور نہ رسول اللہؐ نے دیے ہیں۔ حالات کی نزاکتوں، حفاظتی مصالح (Security concerns) اور ریاست کے تحفظ کے مقصد سے حضرت عمرؓ کے زمانے میں نافذ کیے گئے ایک قسم کے سیاسی احکام تھے جو اپنے سیاق وسباق Context کے ساتھ ہی دیکھے جانے چاہئیں۔

---

[1] الخراج: ۱۲۷

فصل سوم

جزیہ

مسلمان جب رومیوں سے جنگ کر رہے تھے، تو جیسا کہ گذر چکا ہے، قرآن کی وہ آیت نازل ہوئی کہ: اب ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھنا جب تک وہ ''جزیہ'' دینا قبول نہ کرلیں۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ۔

(سورۂ توبہ آیت:۲۹)

جزیہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کی منظم حکومتیں مفتوح قوموں اور رعایا پر جو ٹیکس (زمین کے لگان کے علاوہ) ہر ہر آدمی پر لگاتی تھیں اس کو ''جزیہ'' کہتے تھے، علامہ شبلیؒ نے جزیہ پر اپنے مشہور رسالے میں ثابت کیا ہے کہ اس لفظ کی اصل فارسی ''گزیت'' ہے۔ طبری نے اپنی تاریخ میں خسرو نوشیرواں، جو عہد نبوی سے پہلے کا ایرانی بادشاہ تھا، کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے لوگوں کے اوپر جزیہ کا نظام نافذ کیا، اور اس کے اصول وقواعد اور مقدار طے کی۔ علامہ شبلی نے طبری اور ان سے بھی قدیم مورخ ابوحنیفہ دینوری کی الاخبار الطوال (وفات ۲۸۱ھ) سے اس کے حوالے دیے ہیں۔

اہل عرب ایران سے قریبی سیاسی رابطے رکھتے تھے، بلکہ پورا مشرقی ساحل

شمالی یمن کے مشرقی علاقوں تک انہی کے تابع تھے، شمالی مشرق میں حیرہ میں آل منذر کی قدیم عرب سلطنت ایران کے تابع ریاست کے طور پر قائم، اور مستقل عرب وفارس تعلقات کی نگراں تھی، یمن میں کسریٰ کی طرف سے مستقل گورنر متعین ہوتا تھا، عہد نبوی میں اس کا نام باذان تھا[1]۔ سیاسی وجغرافیائی قربتوں کے نتیجے میں ثقافتی لین دین کا فطری عمل ہونا لازمی ہے۔ اسی لئے جب قرآن نے ''جزیہ'' کا لفظ بولا تو کسی کو اسی کے سمجھنے میں مشکل نہیں پیش آئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ بین الاقوامی سطح پر معروف محاصل کا نظام تھا۔

کیا جزیہ اسلام قبول نہ کرنے کی سزا ہے؟

جزیہ کے بنیادی تصور سے جو ہم نے اوپر واضح کیا ہے، یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ جزیہ کسی خاص مذہب کو قبول نہ کرنے کی سزا نہیں تھا۔ اسلام سے پہلے عجم کے حکمراں اس کو اپنے ہم مذہبوں سے بھی لیتے تھے۔ طبری نے نوشیرواں کے تذکرے میں اس کے نظام کی کچھ تفصیلات لکھی ہیں۔ اس میں کوئی مذہبی تفریق نہیں تھی، بلکہ اس میں حکمراں طبقات اور جنگوں میں شرکت کرنے والوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ خود نوشیرواں کے حوالے سے اس کی یہ حکمت منقول ہے کہ جو لوگ جنگوں میں حصہ لیتے ہیں وہ ان کی خدمت کرتے ہیں جو کھیتی اور کاروبار کرتے ہیں۔ لہذا عام لوگوں کو ریاست کی امداد اپنے مال سے کرنی چاہئے۔

غرض جزیہ اس وقت کا ایک عام بین الاقوامی قانون تھا۔ دنیا کا تمدنی وفوجی سپر پاور فارس اس پر عمل کرتا تھا، اسلام نے بھی یہی تصور باقی رکھا۔ بس اس فرق کے ساتھ کہ مسلمانوں پر زکاۃ کی جو عبادت فرض کی گئی، اور صدقات کی عبادت کا جو نظام رکھا گیا، اس کا ایک اہم مقصد ریاست کا تحفظ اور جہاد فی سبیل اللہ کی تقویت بھی تھا۔

---

[1] تاریخ طبری

لیکن زکاۃ چونکہ خالص عبادتی و مذہبی روح رکھتی ہے اس لئے غیر مسلموں کو اس کا پابند کرنا ناجائز تھا، اس لئے ان کو ریاست کی اجتماعی ضروریات کے سلسلے میں ایک بڑی معمولی چیز کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اور وہ جزیہ کا ٹیکس ہے۔

حضرت عمر نے یہ ضابطہ جاری کیا تھا کہ جزیہ صرف ان لوگوں پر ہوگا جن کو اسلامی ریاست اپنے تحفظ میں لے گی، اور وہ جنگی خدمات انجام نہیں دیں گے۔ جن لوگوں سے جنگی خدمات کا مطالبہ کیا جائے گا وہ خود بخود جزیہ سے مستثنی قرار پائیں گے۔ عراق کے افسران حکومت کے نام آپ نے ہدایت بھیجی کہ

" ليستعينوا بمن احتاجوا إليهم من الأساورة ويرفعوا عنهم الجزاء"

سابق حکومت کے کارندوں میں سے جن کی ضرورت ہو مدد لی جائے اور ان کا جزیہ معاف کردیا جائے۔

آذربائجان کے لوگوں کے بارے میں حکم فاروقی تھا کہ جو ایک دفعہ کسی معرکہ میں حصہ لے گا اس کا سال بھر کا جزیہ معاف ہو جائے گا۲۔

آرمینہ اور جرجان کے لوگوں کو یہ وعدہ لکھ کر دیا گیا کہ یہ لوگ ضرورت پڑنے پر جنگ میں حصہ لیں گے تو ان کا جزیہ معاف ہو جائے گا۳۔

جرجومہ کا شہر فتح ہوا تو ان لوگوں نے شرط رکھی کہ ہم سے جزیہ نہ لیا جائے ہم مسلمانوں کی مدد کریں گے تو یہ بات مان لی گئی۴۔

امام عامر شعبی جن کی ولادت ۲۰ھ اور وفات پہلی صدی کے خاتمہ پر ہوئی

---

۱ تاریخ طبری: ۴۸۲/۴

۲ طبری ۵۴۰/۴

۳ طبری ۵۴۱/۴

۴ الفاروق بحوالہ فتوح البلدان: ص: ۱۵۹

ہے فرماتے ہیں کہ:

ادرکت الأئمة الفقيه منهم وغير والفقيه يغزون بأهل الذمة فيقسون لهم ويضعون عنهم جزيتهم"[1]

میں نے فقیہ اور غیر فقیہ ہر قسم کے حکام کو دیکھا ہے کہ وہ غیر مسلم شہریوں کو جنگ میں شریک کرتے تھے اور ان کا حصہ غنیمت میں لگاتے تھے اور جزیہ معاف کر دیتے تھے۔

اسی بنا پر اب اکثر علماء کا گویا اتفاق سا ہو گیا کہ جزیہ حفاظت کا بدلہ اور فوجی خدمات کا معاوضہ تھا۔

ہماری رائے:

اس کم علم کو اس حقیقت سے پورا اتفاق ہے کہ حضرت عمر کے زمانے میں جزیہ فوجی خدمات کی ادائیگی پر معاف ہو جاتا تھا، اور وہ صرف جنگ میں حصہ لینے کے قابل لوگوں یعنی جوان مردوں سے لیا جاتا تھا، عورتوں بچوں اور بوڑھوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ اس سے نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ جزیہ فوجی خدمت کا بدلہ تھا۔

غیر مسلم مفتوح اقوام کو جنگ میں حصہ لینے اور ریاست کے دفاع کا فرض انجام دینے کا عموماً پابند نہیں بنایا گیا تھا، اس کی وجہ اولاً تو یہ تھی کہ مفتوحین کو یکا یک وفاداریاں بدلنے پر اس درجہ مجبور کرنا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ خون بہانے پر تیار ہو جائیں ایک نامناسب بات تھی۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک اسلامی ریاست مخصوص عقائد و افکار، اور مخصوص مقاصد کے لئے قائم ایک مشنری اور دعوتی ریاست ہوتی ہے۔ اس کا کام صرف امن کا قیام، شہریوں کی فلاح و بہبود سے آگے بڑھتے ہوئے پوری دنیا میں مخصوص ذوق و مزاج اور عبادت اللہ پر قائم نظامِ زندگی عام

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ: ۵۹۵/۱۷

کرنا ہوتا ہے۔ غیر مسلموں کو اپنی مرضی کے خلاف ایسی ریاست کے لئے خون بہانے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے، اس لئے ان سے صرف انکے جان و مال کا تحفظ کا معاوضہ جزیہ لیا جاتا تھا۔

یہ عاجز اس حقیقت سے اتفاق کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں ایک ذرا مختلف موقف رکھتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جزیا اپنی بنیادی حیثیت میں صرف ایک سادہ سا محصول (ٹیکس) ہے۔ جیسے محصولات ہر حکومت اپنی ملکی ضرورتوں اور سماجی خدمات کی انجام دہی کے لئے لیا کرتی ہے۔ ان کے ذریعہ ہی ملک کے دفاع کی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے، حکومتی عملہ کی تنخواہیں، رفاہ عامہ، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، سنچائی کے انتظامات اور سارے ملکی انتظامات کا کام ان ٹیکسوں کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔ اور ہر فرد معاشرہ اور ریاست کا باشندہ کم و بیش اس بار کا کچھ نہ کچھ حصہ اٹھاتا ہے۔

مسلمانوں پر زکاۃ کی شکل میں جو عبادت فرض ہے اس کا عبادتی پہلو تو یہ ہے کہ بندہ گویا خدائے قدوس کی خدمت میں عقیدت و وفا کی نذر گذارتا ہے۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ اور رفاہ عامہ اور غریبوں کی خدمت کا ذریعہ ہے۔ اُس کی اِس عبادتی حیثیت کی وجہ سے غیر مسلموں پر جزیہ نام کا ایسا ٹیکس نافذ کیا گیا جو عبادتی و دینی رنگ سے خالی ہے تاکہ غیر مسلموں کو کسی دینی قسم کی چیز کا پابند نہ بنایا جائے۔ بہر حال ہمارے نزدیک جزیہ بنیادی طور پر دفاع اور جنگی خدمات کا بدل نہیں ہے، صرف ایک ٹیکس ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانوں میں مسلمانوں پر زکاۃ ہوتی تھی اور غیر مسلموں پر جزیہ۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جنگی خدمات انجام دینے والوں کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ جزیہ فوجی خدمت کا بدل ہے، بلکہ یہ دراصل حکومت کی طرف سے ٹیکس کی معافی کا ایک اعلان تھا۔ جیسا کہ غریب کے لئے اور عورتوں

بوڑھوں اور بچوں کے لئے بھی معافی اس لیے تھی کہ عموماً یہ کمانے والے نہیں ہوتے۔

واضح رہے کہ عہد نبوی میں اور پھر خلافت راشدہ اور ابتدائی صدیوں میں جو جزیہ لیا جاتا تھا وہ مسلمانوں سے لی جانے والی زکاۃ سے کہیں کم تھا۔

جزیہ اور ذمی کے بجائے دوسری اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے:

حضرت عمرؓ کے زمانے میں شمالی عرب کے عیسائیوں میں ایک بڑی طاقت قبیلۂ بنوتغلب کی تھی۔ انہوں نے یہ عرض داشت رکھی کہ ہم کو ایرانیوں (عجم) سے ممتاز رکھا جائے، ہم عرب ہیں، آپ ہم سے صدقہ یا زکاۃ کے نام سے جو چاہیں لیں۔ (یاد رہے کہ جزیہ اصلاً ایک ایرانی نظام تھا۔ اور بنوتغلب عیسائی اور رومی حلیف ہونے کے ناطے ایرانیوں سے قدیم عداوت رکھتے تھے)۔ حضرت عمرؓ نے صحابۂ کرام کے مشورے سے ان کی یہ درخواست قبول کرلی[1]۔ اس طرح بعد کے زمانوں کے لئے گویا یہ اصول طے فرمادیا کہ غیر مسلم شہری جزیہ، ذمی وغیرہ اصطلاحات کے بارے میں غلط فہمیوں کی وجہ سے تردد کے شکار ہوں تو ان ناموں پر اصرار کرنا کوئی ضروری نہیں۔

اس دور کے مسلم ممالک میں جزیہ کیوں نہیں؟

ہمارے زمانے میں مسلم ممالک میں کہیں جزیہ کے نام سے غیر مسلم شہریوں پر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ بلکہ شیخ مصطفیٰ سباعی، شیخ یوسف القرضاوی، شیخ عبدالکریم زیدان، وھبہ الزحیلی اور مصطفیٰ الزحیلی وغیرہ علماء اس کے قائل ہیں کہ آج کی مسلم ریاستوں میں جزیہ نافذ نہیں کیا جائے گا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ شاید اصل وجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک میں غیر مسلم شہریوں پر مختلف قسم کے مساوی ٹیکس نافذ ہیں، جو مسلمانوں پر بھی ہیں، اور جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ان ٹیکسوں کا جزیہ کے نام سے موسوم ہونا

---

[1] السنن الکبری للبیہقی، باب نصاری العرب تضعف علیھم الصدقۃ، الأموال لابی عبید: ۶۹/۱

ضروری نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کے زمانے میں اس کی صاف تصریح کی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم شہری جنگوں میں حصہ لیں تو ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ اور موجودہ زمانے کے مسلم ممالک میں غیر مسلم قومی دفاع کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے پر تیار ہیں۔

جزیہ کی مقدار:

رسول اللہؐ کے زمانہ میں اور خلافت راشدہ کے دور میں الگ الگ وقتوں میں مختلف علاقوں سے الگ الگ شرح کے مطابق جزیہ لیا گیا۔ اور اکثر و بیشتر غریبوں، متوسط الحال لوگوں اور اہل ثروت کے لئے اس کی الگ مقدار رکھی گئی۔ نیز جو نہ دے سکے اس کو معاف کیا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمانے اور حالات کے فرق سے جزیہ کی مقدار حکومت اپنی صوابدید سے طے کر سکتی ہے۔ اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔

باب چہارم

جہاد کے نتائج

فصل اول

جزیرہ نمائے عرب میں

عربوں نے اسلام کے ساتھ ہی دنیا کے اسٹیج پر قدم رکھا۔ اسلام سے پہلے عرب اپنے جزیرہ نما میں گویا بند تھے۔ دینی شعور کے نام پر نہایت سطحی بت پرستی، وہم پرستی، جہالت اور عبد و معبود کا ٹوٹا ہوا رشتہ ان کے پاس تھا۔ شرک اللہ تعالےٰ سے تعلق کے ہر رشتہ کاٹ ڈالتا ہے۔ عرب جس قسم کے شرک میں مبتلا تھے اس کے ساتھ اللہ سے تعلق اور اس کی معرفت کا کوئی ذرہ کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ ان کی زندگی روحانیت کے نور سے بالکل عاری تھی۔ نہ دلوں میں اللہ کی محبت کی روشنی اور نہ کردار میں اس کے خوف کا کوئی نقش واثر۔ عام جاہلیت زدہ قوموں کی طرح ان کو اپنی اس تاریکی کا کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔ جاہلیت کے عرب کی بدامنی اور انارکی زباں زد عام وخاص ہے۔ غربت وفلاکت اور تہذیبی مفلسی اس پر مستزاد۔ شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ شعر وشاعری جاہلی تصورات اور فخر ومباہات کے جذبات پیدا کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ عورت کی مظلومیت اس درجہ تھی کہ کسی گھر میں بچی پیدا ہونا اس کو ایسا شرمندہ کرتا کہ بہت سے قبائل میں یہ ایک معمول کی بات تھی کہ باپ بیٹی کو زندہ درگور کردے۔ جو اس سے بچ جاتی تو عورت ایک پیش پا افتادہ سامان تھی۔

یہ عرب قوم تھی جس میں اسلام آیا، مگر اللہ کے ازلی قانون کے مطابق، اس فاسد سوسائٹی کے لیڈروں نے اپنے تعصب، ظلم پسندی، تکبر اور انانیت کے محرکات

کے زیر اثر اس کی دعوت کا راستہ روکا۔ انہوں نے اللہ کے بندوں کو اللہ کی عبادت واطاعت اور فضائل اخلاق والی زندگی اختیار کرنے سے روکنے کے لیے ظلم وتعدی کے تمام حربے اپنائے۔ آخر عربوں پر اللہ کا فضل ہوا، اور جہاد کے ذریعہ اللہ کے بندوں نے ان رکاوٹوں کو ہٹادیا۔ اور اب عربوں کی ایک بالکل نئی تصویر ابھر کر دنیا کے سامنے آئی۔

جہاں بت پرستی اس مضحکہ خیز حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ سفر میں مٹی کے گول گول بت بنائے جاتے، اور ان کی عبادت ناچ ناچ کر کی جاتی، پھر پیشاب سے اس معبود کی ''عزت افزائی'' کر کے عرب قافلہ اگلی منزل کے لیے روانہ ہوجاتا۔ حلوے کا بت معبود بنتا، پھر وہی لذیذ غذا بھی تھی۔ شیاطین کی عبادت اور سحر کا بازار الگ گرم تھا۔ اس شرک نے ان کو خدا بے زار اور اللہ پر بڑا جری بنا دیا تھا۔ یہ جہاد کی ہی تو برکت تھی کہ عرب اب توحید وخدا پرستی کے اس مرکز کے مقام پر واپس آگیا جس پر اس کو پہنچانے کی دعا سیدنا ابراہیمؑ نے یہ کہہ کر کی تھی کہ:

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ۔ (سورۂ ابراہیم ۳۷)

اے ہمارے رب! میں نے اپنی ذریت کو تیرے قابل حرمت گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں جا بسایا ہے جہاں کچھ اگتا نہیں۔ اے ہمارے رب! (بس مقصد یہ ہے کہ) وہ نماز قائم کریں۔ تو تو ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچیں۔

عرب سے بت پرستی ہی کا جنازہ نہیں نکلا وہم پرستی بھی ختم ہوئی۔ خدا پرستی کا وہ منظر سامنے آیا کہ فرشتے بھی رشک کریں۔ جب ساری دنیا خدا سے دوری میں اور حال مجوری میں مبتلا تھی عرب خدا پرستی کا بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ عرب کے بدوشب زندہ

دار ہو گئے۔ نوجوانوں کی زبانیں اللہ کے ذکر سے تر رہنے لگیں۔ پاک دامانی عربوں کا لباس قرار پایا۔

جاہلیت نے ہمارے زمانے میں خدا پرستی کی قدر باقی نہیں رہنے دی اس لیے کہ جب فطرتیں مسخ ہو جاتی ہیں تو دلوں میں اس خدا پرستی اور محبت الٰہی کی قدر باقی نہیں رہتی۔ لیکن اہل علم و عقل جانتے ہیں کہ اس نور کے بغیر، برقی قمقمے جل سکتے ہیں، دل کی دنیا روشن نہیں ہو سکتی۔ جہاد کی برکت سے ہی عربوں کے دل اس نور سے منور ہو سکے۔

اجنادین میں دشمن قائد قبقلار نے ایک عرب جاسوس کو مسلمانوں کے حال کو جاننے کے لئے بھیجا۔ وہ ایک دن رات مسلم فوج کے درمیان رہا، اس نے آ کر بتایا کہ رات میں ان کو دیکھو تو نمازوں میں کھڑے عبادت میں محو ہوں گے۔ دن میں وہ شہ سوار اور جنگجو دکھیں گے۔ ان کے بادشاہ کا لڑکا بھی اگر جرم کرلے تو قانون کے مطابق سزا سے بچ نہیں سکتا[1]۔ یہ سن کر قبقلار نے کہا اگر یہ حال ہے تو ان کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ کاش مجھے ان سے جنگ نہ کرنی پڑتی[1]۔

---

[1] تاریخ طبری: ۳/ ۴۲۷

: ''ان کے بادشاہ کا لڑکا بھی اگر جرم کرلے تو قانون کے مطابق سزا سے بچ نہیں سکتا'' افسوس! لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل۔ کتنی ندامت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی اس صفت کی کوئی نظیر آپ کو مسلم دنیا میں نہیں ملے گی۔ حکمراں اور ان کی اولادیں کیسے بھیانک جرائم کرتے ہیں مگر ہمارے معاشروں اور ممالک میں ان کو کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔ سارے مسلم ممالک حکمرانوں کے جرائم اور لوٹ کھسوٹ سے لہولہان ہیں اور ہماری اجتماعی حس سب کو برداشت کر رہی ہے۔

دوسری طرف مغرب کا یہ امتیاز ہے کہ (باوجود اپنی دیگر دینی اور اخلاقی خرابیوں کے)۔۔۔۔۔۔۔۔۔

عرب کی سرزمین نے متمدن حکومت نہیں دیکھی تھی (۱) اسی جہاد کے ذریعہ وہ حکومت قائم ہوئی جس نے روم وفارس کی قدیم حکومتوں سے کہیں فائق نظم ونسق قائم کیا۔ عدالتی نظام نے دنیا سے ستائش وتحسین کے قصیدے پڑھوائے، جاہل عرب قوموں کے معلم قرار پائے۔ اور دنیا نے ان کے سامنے زانوِ تلمذ تہہ کیا۔

جہاد نبوی کا حیرت ناک کارنامہ:

عربستان کے اس انقلاب میں جس جہاد وقتال سے کام لیا گیا اس کے جانی ومالی نقصانات حیرت ناک حد تک کم ہیں۔ ایک منصف مزاج انسان کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب وہ ایک طرف یہ دیکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سالہ مدنی زندگی کے دوران عرب میں ایمان واخلاق کی کیسی بہار آگئی، کیسا مثالی امن قائم ہوگیا، انسانی اخوت ومساوات کا کیسا شاندار منظر چشم انسانیت نے دیکھا، اور معاشی واقتصادی انصاف وہمدردی کا کیا عظیم نمونہ سامنے آیا، اور دوسری طرف یہ بھی دیکھتا ہے اس سلسلہ میں جو جنگیں کی گئیں ان کے دوران اس عظیم مقصد کے لئے کس قدر کم جانی ومالی نقصان کی قیمت ادا کی گئی!!!

ہجرت کے بعد جس اسلامی ریاست کا آغاز مدینہ کے ایک چھوٹے سے قصبہ سے ہوتا ہے، وہ دس سال کے اندر سولہ لاکھ مربع کلومیٹر سے زائد رقبہ پر محیط ایک عظیم ملک بن جاتی ہے۔ یوں اس حساب سے کہا جاسکتا ہے کہ عہد نبوی کی اسلامی ریاست روزانہ تقریباً ۴۴۰ کلومیٹر کے حساب سے وسعت پذیر ہوتی تھی۔ اللہ اکبر۔

اس عظیم خطہ زمین میں بلا مبالغہ لاکھوں لاکھ انسان بستے تھے۔ ان زبردست

ان کے حکمران اور ان کی اولاد بھی ان کے قانون کی نگاہ میں ایسے برابر ہیں کہ وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی لڑکی باپ کے وزیر اعظم رہتے ہوئے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی جیسے معمولی جرم کی پاداش میں رات بھر تھانہ میں رہی۔

اور وسیع و عریض علاقوں کی فتح اور ان میں امن و امان قائم کرنے میں اور اوپر مذکور روحانی و اخلاقی و انسانی انقلاب لانے میں دشمن کے ڈیڑھ سو سے بھی کم آدمی قتل ہوتے ہیں اور مسلم فوج کے اس سے بھی کم تقریباً ۱۲۰ ر۔

یہ تاریخی ریکارڈ سے جمع کیے ہوئے اعداد و شمار ہیں۔

اس لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ ہے جنگ نہیں، مگر اس کو اہل تعصب نہیں سمجھ سکتے۔

فصل دوم

ایران وعراق اور بلادِ مشرق میں

جہاد کی تحریک عرب کے جزیرہ نما سے نکلی اور اس نے مشرق میں ایران اور ماوراء ایران کے فارسی مقبوضات کو کسروی حکومت سے آزاد کرادیا۔ ایران کیا تھا، کیا ہوگیا!! ساسانی ایران کی اخلاقی و دینی حالت تاریخ عالم کا ایک عبرت انگیز باب ہے۔ معبودِ آتش نے نفس انسانی کی پاکیزگی کو خاکستر کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اللہ سے کوئی تعلق آگ کی عبادت کے ساتھ کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ اور کیسے آگ کے الاؤ طہارتِ نفس اور گرمیِ دم کا کام کرسکتے ہیں؟۔

نتیجہ صاف تھا۔ ایران فسادِ اخلاق و تمدن کا تاریخی نمونہ بن چکا تھا۔ جس کی تفصیل آرتھر کرسٹن سین (جو ساسانی عہد کے ایران کا مستند ترین مورخ شمار ہوتا ہے) کی کتاب ایران بعہد ساسانیان (مترجم ڈاکٹر محمد اقبال) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آخر مزدکی تحریک نے فطرت انسانی کے لگے بندوں کو بھی توڑ ڈالا۔ مال وزن مشترک قرار پائے اور پورے ملک میں لوٹ مار اور آبروریزی کا بازار گرم ہوگیا۔ بادشاہِ وقت (قباز) کی حکومت نے بھی اس فساد وغلاظت کو سندِ جواز دے دی۔ یہ پانچویں صدی مسیحی کے آخر اور چھٹی صدی کے شروع کا واقعہ ہے۔ ایران بعہد ساسانیان کے مصنف نے اس عذاب کی تفصیل دی ہے جو ایرانیوں نے خود مول لے لیا تھا۔ تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ ملک کے مقبول عام اخلاقی معلم نے جب ساری عورتوں کو

سارے مردوں کے لیے حلال اور مال کی لوٹ مار کو جائز قرار دے دیا ہوگا اور حکومت وقت نے بھی اس کی موافقت اور تائید کر دی ہو تو کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہوگی!!

اخلاقی فساد کا یہ عالم کہ ایرانی مرد اپنی سگی بہنوں اور بھانجیوں بھتیجیوں تک سے شادی کرتے تھے۔ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین نے ایرانی بادشاہوں اور وزراء وافسران کے ایسے حیا سوز جرائم کی کئی مثالیں دی ہیں۔ چھٹی اور ساتویں صدی کے ایران کے سیاسی وتمدنی فساد کی اصل وجہ ایسے صحیح مذہب سے دوری تھی جو واضح ہدایات دے، اور ایسے اخلاقی محرکات سے محرومی تھی جو ضمیر کو زندہ رکھے اور انسان کو اپنے نفس کو قابو میں رکھنے پر آمادہ کرے۔

ایک طویل عرصہ سے قائم طاقتور حکومت کے حکمراں اور طبقۂ اشراف (Aristocracy) کی سرکش ظلم پسندی اور خواہش پرستی نے ایران کو فساد انسانیت کی حیرت ناک مثال بنا دیا تھا۔ شاہی خاندان خدا کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ عوام کی حیثیت بادشاہوں اور زرتشتی مذہبی طبقے کے سامنے غلام کی تھی۔ ان کا کام صرف حکومت کو ٹیکس دینا اور امراء کے طبقے کی بیگار کرنا تھا۔ ٹیکسوں کا عجب حال تھا۔ ساسانی حکومت کے ٹیکسوں نے عوام کو بری طرح بدحال کر رکھا تھا۔ خصوصاً عراق کا تو خون چوس لیا گیا تھا۔ ان ظالمانہ ٹیکسوں کے سب سے زیادہ شکار کسان ہوتے تھے جن سے نہایت ظلم اور سختی کے ساتھ مقررہ مقدار وصول کی جاتی تھی۔ چاہے قحط پڑے اور فصل خراب ہو ان کو مقررہ مقدار دینی ہی تھی۔ ان ٹیکسوں سے جنگوں کا پیٹ بھرا جاتا جن کی گویا ساسانیوں کو لت پڑ گئی تھی۔ اور جو کسی بھی امپیریلسٹ طاقت کے بقا کی ضرورت بن جاتی ہیں۔

یہی ٹیکس طبقۂ امراء اور شاہی خاندان کی عیاشیوں کی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ آرتھر کرسٹن سین کے بیان کے مطابق طیفون (مدائن) پر جس وقت مسلمان

فوجوں نے حملہ کیا، اور بادشاہ یزدگرد نہایت عجلت اور پریشانی میں شہر چھوڑ کر بھاگا، اس وقت بھی اس کے ساتھ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویے، ایک ہزار شیروں کے رکھوالے، ایک ہزار باز اوران کے لڑانے والے اور خدم وحشم کی زبردست بھیڑ تھی۔ اور وہ اس حال میں بھی افسوس کرتا تھا کہ یہ بھی کچھ تعداد ہے؟[1]

یہ تھا فارسی علاقوں کا حال۔ مسلمانوں نے جب ان علاقوں کا رخ کیا تھا تو ان کے اعلیٰ قائدین ہی نہیں، عام افراد کے ذہن میں بھی یہ مقصد صاف تھا کہ وہ ایک نجات دہندہ مشن اور ایک ''ربانی جہاد'' کے لیے عازم جنگ ہیں۔ جنگ قادسیہ کے موقع پر مسلمانوں کا ایک وفد سپہ سالار اعظم رستم کے پاس مذاکرات کے لیے گیا۔ اس کے قائد حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے تقریر کے دوران اور بعد میں دوسرے وفد کے قائد اور ایک عام فرد فوج حضرت ربعی ابن عامرؓ نے صاف اس عزم کا اظہار کیا کہ ہم اس ظالم حکومت اور استبدادی طبقاتی نظام سے عوام کو نجات دلانے اور ان کو اللہ کی عبادت اور دین حق کی دعوت دینے آئے ہیں۔ اور واقعۃً اس امت کی ایسی تربیت ہو چکی تھی کہ وہ قوموں کے لیے خدائی رحمت کی پیامبر اور نجات دہندہ مانی جائے۔

اور ایسا ہی ہوا ایران کی قسمت بدل گئی۔ آتش پرستی کی جگہ ایران خدا پرستی اور روحانیت سے آشنا ہوا۔ صحیح دین توحید اور اسلامی شریعت و نظام اخلاق کے سائے میں ایران کی تربیت ہوئی۔ اور زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہم کو ایران مشرق میں روحانیت اور تزکیۂ اخلاق کا عظیم مرکز نظر آتا ہے۔ فارسی امپائر کے علاقے اسلام کے زیر سایہ ایسے کندن ہوئے کہ وہ ایک مخصوص اسلامی تہذیب کے بانی بنے۔ ان علاقوں کے باشندے اسلام کے ایسے ممنون ہوئے کہ اپنی قدیم مذہب و قومیت کو انہوں نے بالکل بھلا دیا۔ اسلام اور عربوں سے ان کی محبت نے ان کے لباس، تمدن، معیشت، زبان،

---

[1] ایران بعہد ساسانیان لاہور ایڈیشن ۷۲۳

ہر چیز پر عجیب اثر ڈالا۔ اب فارسی آدھی عربی الفاظ پر مشتمل ہو گئی۔ معیشت کی شکل ہی بدل گئی۔ اور یہ جب ہے کہ جب مختلف تاریخی اسباب کی بنا پر ایران ہمیشہ سیاسی فتنوں اور شکایات کا خطہ رہا۔ مگر اسلام سے ان کی وفاداری غیر معمولی رہی۔ یہاں بسنے والے اسلامی علوم وفنون کے سب سے بڑے خادم بنے۔ اور ایران کے ایک بڑے صوبے بابل (عراق) نے تو عربی زبان ہی اپنالی۔

بجائے رقص وسرود اور مسرفانہ "ثقافتی مظاہر" کے ایران میں نافع علوم اور انسانیت کی صحیح خدمت کرنے والے فنون نے ترقی کی۔ ٹیکس کا نظام کسروی استبداد کے بجائے صحیح اصولوں پر قائم ہوا۔ مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ فارسی علاقوں کے عوام کی معیشت میں بڑا اعتدال آیا۔ کسانوں کو عرصۂ دراز کے بعد رحم دل انتظامیہ سے واسطہ پڑا۔ اسی لیے سیکڑوں سالہ قدیم بادشاہت کو ایک علاقہ خالی کرنے کے بعد کبھی دوبارہ واپس لینے کے امکانات نظر نہیں آئے۔

امویوں کے آخری دور میں یہ فارسی علاقے مرکزِ خلافت کے خلاف ایک زبردست سیاسی تحریک کے مرکز بنے، مستشرقین نے اس کو اہل فارس کی طرف سے فارسیت کے احیاء اور عربیت سے نفرت کی آواز کہا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط تجزیہ ہے۔ یہ تحریک تو خود فارسیوں کی اسلام سے گہری محبت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اس وقت بھی ان کی اس تحریک کی قوتِ محرکہ عربیت سے نفرت یا عربوں کے اقتدار سے بغاوت نہیں بلکہ اسلامی مذہبیت اور رسول وآل رسول عربی سے محبت ہی تھی، نہ کہ فارسی قومیت یا خسروی دور کی یاد۔ اس تحریک کے ہوشیار داعیوں نے پوری تحریک اہل بیت کی محبت کے نام پر چلائی، اور اسی سے لوگوں کے جذبات کو اپیل کیا۔

عراق کا علاقہ جو السواد اور الجزیرہ کے ناموں سے عربی تاریخ میں جانا جاتا تھا، طویل زمانے تک روم وفارس کا میدان جنگ بنے رہنے سے اس کی حالت ایک قابل

کی سی ہوگئی تھی، جس کو حاصل تو سب کرنا چاہتے ہیں مگر صرف لاتوں سے تواضع کرنے کے لیے۔ مورخین نے ذکر کیا ہے کہ روم و فارس کی طویل جنگوں نے عراق کی بری حالت کر رکھی تھی۔ عراق مختلف مذہبی فرقوں کا مسکن تھا۔ مگر تاریخی ماخذ میں اس کی اخلاقی حالت کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ رومیوں کے مقابلے میں ساسانی فارس نے اس کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ مورخین نے ساسانی عہد میں اس خطہ میں ہونے والے مذہبی مظالم کا بالاتفاق تذکرہ کیا ہے۔ عراق کا جنوبی علاقہ (ارض سواد)، جو مسلمانوں کے تحت پہلے آیا، ۶۰۲ء میں ایرانی حملے میں اس کو بری طرح تاراج کیا گیا۔ مگر تاریخ کی چرخی الٹی گھومی اور خسرو قتل کیا گیا۔ ہرقل (بیزنطینی سلطنت کے فرمانروا) نے پلٹ کر جو حملہ کیا تو شہروں کو روندتا اور آبادیوں کو برباد کرتا مدائن تک جا پہنچا۔ عراق اس طرح ایک مرتبہ پھر ایرانی قبضہ سے آزاد تھا۔ مگر ہرقل قسطنطنیہ جا کر عیش و سرود میں مشغول اور پورے خطے کے دوبارہ ایرانیوں کے تحت چلے جانے پر راضی ہو گیا۔ اس دوران شاہی خاندان اور فوجی سرداروں میں خانہ جنگیوں، سیاسی شورشوں اور قدرتی آفتوں نے اس خطے کی تباہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ خطہ پہلے سے ہی جغرافیائی لحاظ سے پست اور شور علاقہ تھا۔ حکومتیں نہروں کے ذریعے آب پاشی اور بارش کے پانی کے نکاس کا انتظام کرتی تھیں۔ ان نہروں پر ہی اقتصادیات کا گویا دارومدار تھا۔ یہ سب کچھ اس بدنظمی اور انتشار کی نذر ہو گیا۔ دجلہ و فرات نے بھی سیلابوں کے ذریعہ غضب ڈھا دیا۔ طاعون الگ پھوٹ پڑا۔ عوام پریشان ہو گئے۔ وہ ایک طرف ان حالات میں گرفتار تھے۔ دوسری طرف حکومت اور اس کے اہلکاروں کی عیاشی اور پر عشرت زندگی ہر اندازے اور قیاس سے آگے جا چکی تھی۔ آرتھر کرسٹن سین نے ایرانی امراء کی عیش پرستی کی نہایت حیرت زدہ کرنے والی تفصیلات اپنی کتاب کے نویں باب میں نقل کی ہیں۔ ایک ایک کلاہ (ٹوپی) کی قیمت لاکھوں میں تھی۔ مذہبی طبقہ بھی امراء

کے ساتھ اس پرعشرت زندگی اور دولت اندوزی میں شریک تھا۔

ان عیاشیوں کے لیے لوگوں پر سخت جابرانہ محصول لگائے جاتے تھے۔ یہی عراق کہلانے والا علاقہ سب سے زرخیز علاقہ تھا، اسی کے کسان عیاشی کی اس خندق کو اپنے خون پسینے سے بھرتے تھے[1]۔

مورخین کا اتفاق ہے کہ اسی بنا پر اس خطہ کے لوگوں نے مسلم حملہ آور فوج کا عمومی استقبال کیا تھا۔ برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

> The Muslims on the whole, were welcomed in Mesopotamiah as deliverers from the foreign yoke of the persains.

> میسوپوٹامیہ (عراق کا قدیم نام) میں مجموعی طور پر مسلمانوں کا فارسیوں کی غیرملکی غلامی سے نجات دلانے والوں کی طرح استقبال کیا گیا[2]۔

عراق کی حالت میں مذہبی اور اخلاقی طور پر جو غیر معمولی تبدیلیاں آئیں وہ تو ایک پوری کتاب کا موضوع ہے۔ عراق کی بڑی آبادی عیسائی تھی، یہودیوں کی بھی بڑی تعداد تھی۔ زردشتی مذہب ایران کا سرکاری مذہب تھا۔ اوران سارے ہی مذاہب کی ایمانی واخلاقی حالت جیسی خراب تھی اس کا اجمالی علم اکثر لوگوں کو ہے۔

جہاد کے بعد اس ملک میں اسلام آیا، ایمان آیا۔ خدا پرستی کی جیوت جاگی۔ فتوحات کے ایک عرصہ بعد عراق کے باشندوں نے اسلام قبول کیا، ان کو اسلام اور مجاہدین کو دیکھنے کا قریب سے موقع ملا۔ مگر دھیرے دھیرے عراق میں خدا پرستی اور ایمان کے باغ لگ گئے۔ اخلاق کی کھیتی ہری ہوگئی۔ عراق سے علم وتہذیب کی

---

[1] (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مقالہ:

(The history of Mesopotamiah, The Sasanin Period)

[2] (حوالۂ بالا)

سوغات ساری دنیا کو ملی۔ یہی عراق مشرق میں اسلام کے نور ہدایت کے پھیلنے کا مرکز بنا۔ اسلامی تاریخ میں عراق کو کیا مقام حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خلافت بنو امیہ کے زمانے ہی سے عراق اسلامی تہذیب کے ایک مرکز کے طور پر ابھرنے لگا تھا۔ اور بتدریج وہ اس کا مرکز اعظم بن گیا۔ صرف تاریخ بغداد کے مطالعے سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ عراق کی سرزمین پر کیسا زبردست انسانی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ کوفہ و بصرہ اور بغداد و موصل کے بیچ علم و ہدایت اور اصلاح وارشاد کے کیسے کیسے شمس و قمر ضیا پاشی کر رہے تھے۔

اقتصادی میدان میں عراق ایک زبردست اصلاح کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس علاقے میں زمینوں کی تقسیم اور تحصیل Revenue کا نظام نہایت جابرانہ تھا۔ ایران بعہد ساسانیان کا مصنف جگہ جگہ اس ظالمانہ نظام کا تذکرہ کرتا ہے، جس میں کسانوں کی حالت زمین داروں کے غلام جیسی تھی۔ وہ زمین داروں اور حکومت (جو بڑی مقدار میں زمینوں کی مالک تھی) کے پیچھے بندھے ہوئے اور ان کے رحم و کرم پر رہتے تھے۔ ٹیکس اور محصولات کی کثرت سے بسا اوقات یہ بھاگ کھڑے ہوتے تھے[1]۔ حضرت عمرؓ نے ساری زرعی زمینوں کی از سر نو پیمائش کرائی، خراج مقرر کیا اور زمینوں کو کسانوں کے پاس ہی رہنے دیا۔ یہ کسان پہلے زمینداروں کے بندھوا مزدوروں کی حیثیت رکھتے تھے اب آخر کار وہی اس کے مالک تصور کیے گئے۔

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۴۲۴

فصل سوم

مصر و شام میں

ایران و عراق ہی کی طرح شام و مصر میں اسلامی جہاد کے عظیم نتائج سامنے آئے۔ یہ دونوں علاقے بیزنطی حکومت کے زیر اقتدار تھے، جو کہنے کو عیسائی مذہب رکھتی تھی، مگر عیسائیت اس وقت عموماً تحریف کا شکار ہو کر شرک اور رومن تثلیث کا لباس پہن چکی تھی، جس نے اس کی روحانیت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ مذہبی اور کلامی فرقہ بندیوں نے ایسی شورش پیدا کی تھی کہ لوگ عاجز آ چکے تھے۔ مصر و شام میں اس شورش کے نتیجہ میں جو فسادات ہوئے ان میں بلا مبالغہ لاکھوں انسان ہلاک ہوئے (A.J. Butler. The Arab's. Conquest of Egypt P. 196)۔ حکومتوں نے بھی اس سلسلے میں بدترین مذہبی جبر کا نمونہ پیش کیا۔ اور مخالف فرقوں پر طرح طرح کے مظالم کیے۔ ہرقل کے ایماء و اشارہ پر عیسائی کیتھولک پیشوا کائرس Cyrus جو Monophysite (یعنی حضرت عیسیٰ کی واحد الوہی فطرت کا قائل) تھا، مصریوں پر جو Miaphysite (یعنی حضرت عیسیٰ کی فطرت کے بیک وقت الوہیت و بشریت کی جامع ہونے کے قائل) تھے، زبردست جبر و تعذیب کا نشانہ بناتا تھا۔ آں حضرت ؐ نے ہرقل کو جو خط لکھا اس میں اس مذہبی جبر و تشدد پر تنقید کی تھی اور اس کے انجام بد سے ڈرایا تھا[1]۔

باوجود اس کے کہ شام کے علاقے قدرتی وسائل سے نہایت مالا مال تھے اور

---

[1] بخاری باب بدء الوحی

مصر بھی ایک زرخیز ملک تھا، مگر مورخین نے سوائے زمین داروں اور شہری امراء کے، عوام اور عام کسانوں کی مفلوک الحالی اور اقتصادی مظلومیت کی لرزہ خیز داستانیں بیان کی ہیں۔ الفرڈ بٹلر جو مصر میں اسلامی فتوحات کا مورخ ہے، لکھتا ہے کہ مصر میں رومن حکومت کی پالیسی کا محور صرف لوٹ اور حکام کی دولت اندوزی کے علاوہ کچھ نہیں تھا (سابقہ حوالہ ص ۶۳)۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں Egypt کے موضوع پر مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ رومی حکومت کے دور میں غریب غریب تر ہوتا جارہا تھا، اور دولت سمٹ کر امراء اور اہل ثروت کے ہاتھوں میں جمع ہوتی جارہی تھی۔

شام میں رومیوں نے شہروں کو حصار بند کردیا تھا۔ غریب طبقہ بس دن میں مزدوری کے لیے ان میں آسکتا تھا، اور شام کے دھندلکے کے ساتھ ان کو شہر سے نکلنا ہوتا تھا۔ باہر وہ کھیتوں میں کام کرتے تھے جو عام طور پر شہری زمینداروں کی ملکیت ہوتے تھے۔ رات کو شہروں کے باہر ڈاکوؤں اور چوروں کا راج اور جنگل کا قانون ہوتا تھا، جس کی حکومت کو کوئی فکر نہیں تھی[1]۔

شام میں یہودیوں کی آبادیاں تھیں، ان کا قتل عام بارہا ہوا۔ یروشلم نہ جانے کتنی مرتبہ آل یعقوب کے خون سے نہایا۔ پھر جب کسریٰ رومیوں کو کچلتا آبادیوں کو تاراج کرتا بیزنطینی دارالحکومت کی دہلیز تک پہنچا تو یہودیوں نے بھی خوب بدلہ لیا۔ عیسائی قیدیوں کو خرید خرید کر قتل کیا، اور پکڑ پکڑ کر قتل کروایا[2]۔

مورخین کا اتفاق ہے کہ ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے ان کو مذہبی آزادی اور معاشی انصاف دیا۔ وہ عرصے سے دونوں سے محروم تھے۔ بریٹانیکا

۱۔ Whitting Phillip. Byzantium, an Introduction. P. 91

۲۔ حوالہ بالا ص ۱۰۲

کے مقالہ نگاروں نے مشرقی (بیزنطینی) رومن سلطنت کے مذہبی خصوصاً فرقہ وارانہ جبر کو مسلمانوں کی فتح کا سبب بتایا ہے۔ اور اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں نے ان کو مذہبی آزادی دی[1]۔

قدیم یورپ کے مشہور پادری و مورخ Michael the Syrian نے لکھا ہے کہ:

> ''رومن حکومت کی برائیوں کو دیکھ کر خدا نے بنی اسماعیل کے لشکر بھیجے تاکہ وہ اہل شام کو آزادی دلائیں.... اگر اہل شام کو مسلمانوں کے ہاتھوں کچھ پریشانیاں اٹھانی پڑیں تو یہ بہت حقیر قیمت ہے جو انہوں نے بیزنطینی حکومت کے جبر وظلم اور خباثتوں سے آزادی کی نعمت عظمیٰ حاصل کرنے کے لئے ادا کی۔''

اولین اسلامی جہادی مہمات کے بارے میں یہ مغالطہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے جبراً مذہبی تبدیلی کرائی۔ مگر جدید منظم تاریخی مطالعات بتلاتے ہیں کہ فتح کے تقریباً پون صدی کے بعد شام کی کل ۶ فیصد آبادی مسلمان تھی، یعنی ۴۰ لاکھ میں تقریباً ڈھائی لاکھ۔ اسلام شام کے علاقوں میں اس کے بعد پھیلا جب نئی نسل نے اسلام کی برکات دیکھیں۔

یہ ہے جہاد اور یہ ہیں اس کے نتائج۔

---

[1] بریٹانیکا مقالہ Byzantine Empire

[2] بحوالہ A.N. Stratos. Byzantiam the 7th century. Vol: 1PP. 602-603 Amsterdam 1968)

باب پنجم

جہاد کی فضیلت

اور دین میں اس کا مقام و مرتبہ

فصل اول

اسلام میں جہاد کی عظیم فضیلت

اور اس کا راز

جہاد کی تعلیم یقیناً محاسن اسلام کا ایک اہم باب ہی نہیں بلکہ وہ اس کی حقانیت کی ایک روشن دلیل ہے۔ انسانی دنیا میں امن وسلامتی، خیر وشرافت، نیکی اور عدل وانصاف کا قیام و بقا ایسی مجاہد جماعت کے وجود سے وابستہ ہے جو ایمان باللہ اور عبادت خداوندی کے اصولوں پر زندگی گذارتی ہو، مومنانہ شان سے آراستہ اور ربانیت کے ذوق سے سرشار ہو، دنیا کے عیش وآرام کے بجائے نعمائے آخرت اس کا مقصود ومطمح نظر ہوں، اور خوف خدا اس کو ہر قسم کے ظلم وزیادتی سے روکنے کے لیے کافی ہو۔ ایسی جماعت کی تیاری بھی جہاد ہے، ہر وہ جد وجہد جس کا مقصد ایسی جماعت کی تشکیل وتربیت ہو وہ بھی جہاد ہے اور ان کا جنگ وقتال بھی جہاد ہے۔ ان مقاصد کے لیے اللہ کے بندے اپنا مال اس کی راہ میں لٹائیں، قربانیاں دیں، جانوں کو سستا کریں اور سربکف میدان جنگ میں اس کی رضا کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کی نیت سے باطل وظلم سے نبرد آزما ہوں تو خداوند قدوس ان کے اس عمل کو اپنی راہ میں جہاد قرار دیتا ہے۔ اور ان کی یہ قربانی اس کو زمین وآسمان کی ساری نیکیوں سے زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ وہ خود آگے بڑھ کر ان کے ان نذرانوں کو شرف قبولیت سے

نوازتا ہے اور اپنی خصوصی رحمت سے ان کو سرفراز فرماتا ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی یہی حیثیت ہے جس کی وجہ سے رسول اللہؐ نے بسا اوقات اس کو سب سے ''افضل و اعلیٰ درجہ کی نیکی'' قرار دیا ہے[1]۔ اور اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللهِ۔ (البقرہ ۲۱۸)	بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے راستہ میں انہوں نے اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت کی اور جہاد کیا وہ اللہ کی (خاص) رحمت کے امیدوار ہیں۔ (یعنی ان کو اللہ کی رحمت ملے گی)۔

اس جہاد کی یہ بھی فضیلت ہے کہ اس راہ میں ایک صبح اور ایک شام کا آنا جانا دنیا اور دنیا میں جو کچھ بھی مال و دولت اور اللہ کی نعمتیں ہیں ان سب سے بہتر اور افضل ہے۔ ''لغدوة أو روحة في سبيل الله خير من الدنيا وما فيها''[2]۔ اس جہاد کا یہ درجہ بھی قرار دیا گیا کہ گھر بیٹھ کر ستر سال کی نمازوں سے بہتر یہ ہے کہ بندہ جہاد میں نکلے[3]۔

اور یہ مژدہ بھی مجاہد کے لیے سنایا گیا کہ سفر جہاد کا غبار جسکی ناک میں گیا اس پر جہنم کی آگ حرام ہے[4]۔ اور جو پاؤں سفر جہاد میں غبار آلود ہوئے ان پاؤں کو دوزخ کی آگ چھو نہیں سکتی[5]۔

صرف یہی نہیں بلکہ قرآن تاکید کرتا ہے کہ جب یہ جنگ دنیا میں حق کے قیام

---

[1] صحیح بخاری: ۲۶

[2] صحیح بخاری ۲۷۹۲

[3] سنن ترمذی ۱۶۵۰

[4] سنن نسائی ۳۰۵۹

[5] صحیح بخاری: ۲۸۱۱

اور خیر و عدل کے بقا کے لیے ناگزیر ہو جائے، اس کے بغیر ظلم و استبداد کی قوتوں کی خونریزیاں تھمنے کا نام نہ لیں، اور وہ خدا پرستی کی دعوت کو دفن کرنے کے درپے ہوں، اس وقت اللہ پر ایمان رکھنے والوں اور اس کی ابدی جنت کے طلبگاروں پر اللہ کی راہ میں جاں بازی کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ:

ان لاتفعلوه تکن فتنة فی الأرض وفساد کبیر (الأنفال ۷۳)	اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ و فساد قائم ہو جائے گا۔

اللہ کی نگاہ میں مسلمانوں کی حیثیت یہی ہے کہ وہ ایسی جماعت ہیں جو اللہ کی عبادت اور بندگی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ان کا یہی مقصد وجود ہے، ان کا اللہ سے یہ عہد و میثاق ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے جدوجہد کریں گے۔ اللہ نے اسی خدمت کے عوض ان سے جنت کا وعدہ کیا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو خدا کے عہد شکن قرار پائیں گے اور اس کے غضب کے حق دار ٹھیریں گے۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً فِيْ التَّوْرٰاةِ وَالإِنْجِيْلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهِ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُم بِهِ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. التَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرّٰاكِعُوْنَ السّٰاجِدُوْنَ الآمِرُوْنَ	نشانیاں یہ ہیں کہ یہ) گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ کے دین کے لیے در بدر پھرنے والے اور سفر کرنے والے ہیں، رکوع و سجود کرنے والے ہیں۔ یہ نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ اور اللہ کی مقرر کردہ ساری حدوں کی حفاظت کرنے والے (یعنی شریعت کی پابندی کرنے والے ہیں) تو اے پیغمبر ایسے ایمان والوں کو

بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (التوبة ۱۱۱-۱۱۲)	(ہماری رضا وخوشنودی اور عظیم اجر وثواب کی) خوش خبری دے دو۔

اسی لیے اعلان کر دیا گیا کہ خدا کے نزدیک سچے ایمان والے وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر، پھر انہوں نے ان کے وعدوں پر شک نہیں کیا، اور اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، وہی تو سچے ایمان والے ہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُوْلٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ. (الحجرات ۱۵)

اور اسی لیے رسول اللہؐ نے جذبۂ جہاد کو حقیقی ایمان کی ضروری شرط قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

من مات ولم یغز، ولم یحدث به نفسه مات علیٰ شعبة من نفاق[۱]	جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ کبھی اس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ اس کی آرزو اور تمنا اس کے دل میں پیدا ہوئی تو وہ نفاق کے ایک حصہ پر مرا۔

---

[۱] صحیح مسلم ۱۹۱۰

فصل دوم

جنگ وقتال کے علاوہ جہاد کی دوسری شکلیں

جہاد فی سبیل اللہ کا اصل مقصد دین حق کی نصرت و مدد، اہل حق کی حمایت اور ظلم وتعدی کی طاقتوں کا طاقت کے ذریعے مقابلہ ہے۔ لیکن اگر کسی زمانے میں اہل ایمان کے لیے دین حق کی نصرت ومدد کی یہ شکل ممکن نہ ہو (یا بالفرض دنیا ظلم اور کفر کے استکبار سے خالی اور پرامن ہو) تو دین کی مدد اور مخالفینِ حق سے مقابلے کی جو جدوجہد زمانے کے حالات میں ممکن ہو اہل ایمان سے اسی کا مطالبہ ہوگا۔ اور وہی اس وقت ان کا "جہاد فی سبیل اللہ" ہوگا۔ اللہ کے جو بندے محض اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے اس جدوجہد میں قربانیاں پیش کریں گے اور دنیا میں دین کے احیاء کی کوششیں کریں گے ان کے لیے اُسی درجے کی فضیلت اور اللہ کی خوشنودی ومحبت کے اُنہی مقامات و درجات کا وعدہ ہے جن کا دوسرے قسم کے حالات میں باطل کے خلاف جنگ میں جانبازی کرنے والوں سے ہے۔

رسول اللہؐ جب مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے اور مسلمانوں کی دشمن طاقتوں سے مسلح جنگ آزمائی کے امکانات پیدا ہو گئے، تو اللہ کے راستہ میں جان ومال کو ستا کرنا اور سرفروشانہ جنگوں میں قربانیاں دینا اس "جہاد" کی اعلیٰ ترین شکل بلکہ تقریباً واحد متعین شکل قرار پائی تھی۔ اور اس سے جی چرانے والوں کو نفاق اور ایمان کی سنگین کمزوری کا شکار گردانا جاتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے جب نصرتِ دین کی

یہ راہ نہیں کھلی تھی، اور مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے اجتماعی اور سیاسی دباؤ کا مقابلہ تھا، ان کو ذاتی زندگی میں بھی اپنے دین پر عمل کرنے کی آزادی نہیں تھی، پروپیگنڈے کے ذریعے ان کو بدنام کیا جارہا تھا، اور وہ اپنے معاشروں میں الگ اور تنہا کر دیے گئے تھے۔ اس وقت ان کا "جہاد" یہ تھا کہ وہ ان حالات کا صبر واستقلال کے ساتھ مقابلہ کریں، کفر وظلم کے دباؤ کے آگے نہ جھکیں، اور اپنے دین پر ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہیں۔ ایسے دور میں اہل ایمان کا اصل مشن اقامت صلوٰۃ اور اللہ پر ایمان والی اور اس کی اطاعت والی پاکیزہ ونیک زندگی گذارنا ہوتا ہے۔

مغلوبیت کے دور کا اصل مشن اور "جہاد":

قرآن مجید کے گہرے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح مدینہ منورہ ہجرت کے بعد اسلامی زندگی کا بڑا مشن دشمنوں کا مقابلہ اور قتال فی سبیل اللہ تھا، بالکل اسی طرح مکہ مکرمہ کے زمانے میں قرآن اسلامی زندگی کا اصل مشن یہ قرار دیتا ہے کہ عزیمت کے ساتھ راہ حق پر جما جائے، اور اس راستے کی مشکلات ومصائب پر بہادرانہ صبر کیا جائے، کفر کے ظلم آمیز مطالبوں کے سامنے نہ جھکا جائے اور ملتِ کفر کی طرف مائل نہ ہوا جائے۔ اس مشکل مشن میں قرآن اقامت صلوٰۃ کو ایمانی زندگی کی اصل بنیاد، ایمانی طاقت وقوت کا سرچشمہ بتاتا ہے اور اس کشمکش میں اسی کو وسیلۂ ظفر قرار دیتا ہے۔

مغلوبیت کے دور کے اصل مشن اور غیر مسلح جہاد کا بیان اور اس سلسلے میں اقامت صلوٰۃ کی تاثیر اور اس کے خاص مرکزی کردار کا یہ موضوع اپنی تفصیلات کے ساتھ پورے قرآن میں پھیلا ہوا ہے۔ ہم اختصار کے پیش نظر چند آیتیں پیش کرتے ہیں۔

سورہ ھود میں اہل ایمان کو اس دور سے متعلق مفصل رہنمائیاں دی گئیں ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کی روشنی میں اس راہ کے نشیب وفراز پر روشنی ڈالی گئی

ہے۔اور واضح کیا گیا ہے کہ قافلۂ ایمان کو اللہ کے راستے میں کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ پھر سورت کے خاتمے کے طور پر رسول اللہؐ اور عموماً اہل ایمان سے نہایت جامع خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ . وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ. وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ . وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ...... وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ. إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ . وَكُلًّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ .... وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ.

(سورۂ ہود: آیات ۱۱۲ تا ۱۲۳)

ان آیات میں دی گئی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ تم راہ حق پر ٹھیک ٹھیک جم جاؤ اور اس سے ذرا انحراف نہ کرو۔ خدائے بزرگ و برتر تمہارے اعمال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔اور خبردار! ان ظالموں کی طرف مائل نہ ہو جانا اور ان کی بات نہ ماننا، ورنہ جہنم کی آگ میں ڈال دیے جاؤ گے۔اور نماز قائم کرو دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے پہروں میں ......اور جم جاؤ، اس لیے کہ اللہ اچھے کام کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ پھر اہل ایمان کی تسلی کے لیے ان کو بتلایا گیا کہ ہدایت وضلالت اللہ

کے ہاتھ میں ہے، وہ ان لوگوں کے ہدایت یاب نہ ہونے اور ان کی مخالفت سے دل برداشتہ اور غم گین نہ ہوں۔ یہ اللہ کا منصوبہ اور تقدیر ہے کہ ہدایت سب کو نہیں ملتی۔ یہ ظالم اپنے ظلم وسرکشی کی بنا پر جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔ قرآن میں تم کو رسولوں کی تاریخ اور ان کی داستان اسی لیے سنائی جاتی ہے تاکہ وہ تمہارے لیے ثابت قدمی اور تسلّیِ خاطر کا ذریعہ بنے۔ جان لو کہ حق کی شاہ راہ سدا ان ہی مرحلوں سے گذرتی ہے۔ پھر اہل ایمان کو اللہ کے وعدوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ سب کچھ اللہ کی بادشاہی کے تحت ہے، وہ جو چاہے گا وہی ہوگا۔ مستقبل نے اپنی چادر میں کیا چھپا رکھا ہے یہ بس اسی کے علم میں ہے۔ لہٰذا تم اس کی عبادت کیے جاؤ اور اپنے دین کے بارے میں اسی پر بھروسہ رکھو۔ وہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔

اس مشن کو قرآن ایسے حالات اور اس دور کا اصل مشن قرار دیتا ہے اور اس کو جہاد ہی کا نام دیتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں رسول اللہ کو حکم ہوا کہ:

"فلا تطع الکافرین و جاھدھم بہ جھاداً کبیراً" (الفرقان ۵۲)

"تم ان اللہ کے منکروں اور باغیوں کی بات نہ ماننا، اور قرآن کے ذریعہ ان سے بڑا جہاد کرنا۔"

مکہ ہی کے دور میں سورۂ عنکبوت کی یہ آیات نازل ہوئیں:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (۲) وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (۳) ..... وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (۶)

یعنی کیا لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ ایمان کا زبان سے اقرار کر لینے کے بعد کام پورا ہو جائے گا۔ اور اللہ ان کو پرکھے بغیر جنت میں داخل کر دے گا؟ ہرگز نہیں، سنت اللہ یہ قائم ہے کہ اللہ نے پچھلی امتوں کے ایمان والوں کی بھی آزمائش کی ہے اور

حالات کی کسوٹی پر ان کو پرکھا ہے۔ اب تم کو بھی پرکھا جا رہا ہے۔ اس طرح اللہ دیکھتا ہے کہ کون ایمان کے دعوے میں سچا اور اللہ کا اور اس کے دین کا وفادار ہے اور کون جھوٹا۔ آگے اسی صورت حال کے حوالے سے ان مشکلات کے باوجود دین پر جمنے اور استقامت اختیار کرنے والوں کے طرز عمل کو "جہاد" قرار دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ جو اس زمانے میں جہاد کرتا ہے اور راہ حق پر ثابت قدم رہتا ہے وہ اپنے ہی لیے ایسا کرتا ہے، اللہ پر اس کا کوئی احسان نہیں۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیرؒ نے امام حسن بصریؒ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

ان الرجل لیجاھد وما ضرب	بلاشک ایسا آدمی بھی بسا اوقات جہاد کرتا
یوماً من الدھر بسیف	ہے جس نے کبھی تلوار نہیں چلائی ہوتی۔

دین پر ثابت قدم نہ رہنا نفاق ہے:

اور جس طرح اُس دور میں جب رسول اللہؐ اپنے دشمنوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھے، جنگ میں شرکت سے پہلوتہی کرنے والے کو "نفاق" کے مرض کا روگی جانا جاتا تھا، بالکل اسی طرح اِس دور میں جو لوگ مکہ کے حالات میں اپنی سہولت اور مفادات کے لیے راہ سے پلٹ جاتے تھے اور اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں پورے طور پر شامل کرنے سے بچتے تھے تاکہ وہ محفوظ رہیں، ایسے لوگوں کو ڈرایا جاتا تھا کہ یہ طرز عمل "نفاق" ہے۔ اوپر سورۂ عنکبوت کی جو آیتیں نقل کی گئی ہیں، اور جن میں بتلایا گیا ہے کہ مشکل حالات میں آزمائشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والے مجاہد ہیں۔ اسی سلسلۂ کلام میں ان مجاہدوں کے برعکس ایسی جماعت کا تذکرہ ہے جس کا حال یہ ہے کہ جب اس کو اللہ کے راستے میں ستایا جاتا ہے تو وہ اپنا شمار خالص اہل ایمان کے ساتھ کروانے سے بچتی ہے تاکہ وہ مسائل و مشکلات سے بچ سکے۔ مگر جب اللہ کے مدد کے نتیجہ میں اہل ایمان سرخ رو اور باعزت ہوں گے تو وہ

آگے بڑھ بڑھ کر کہے گی کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ اللہ دل کے بھیدوں سے واقف ہے، وہ ضرور بالضرور ان منافقوں کو بھی جانتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ، فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ، وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ، أَوَ لَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ. وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ [العنکبوت]

پھر آگے چل کر اسی سورۂ عنکبوت میں (اور مکہ میں ہی) ایک مرتبہ پھر ہمیں جہاد و مجاہدین کا تذکرہ ملتا ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبلنا (العنکبوت ۶۹)	اور جو لوگ ہمارے راستے میں جہاد کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھادیں گے۔

سورۂ عنکبوت کی ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے زمانے کے خاص حالات کی وجہ سے اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت جہاد وشہادت کی اُس معروف راہ کو مسدود پاتی ہے، تو اس کے لیے راہِ عمل یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے دین کی سچی وفاداری اور اس راہ میں عزیمت اور صبر کے ساتھ اقامت صلاۃ اور نیک عملی پر کاربند ہو جائیں، اور اسی ایمانی زندگی کو فروغ دینے کو اپنی زندگیوں کا اصل مشن اور مقصد بنالیں، یہی ان کا فرض ہے اور یہی ان کا جہاد۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کا عظیم عمل ان لوگوں کے لیے بھی ممکن ہے جو زمانے کے حالات کی وجہ سے جنگ کرنے سے قاصر ہیں۔ اگر وہ نصرت دین کی ممکن کوششیں کرتے ہیں اور راہِ حق پر ثابت قدم رہتے ہیں تو وہ بھی مجاہد کا ثواب پاسکتے ہیں۔

یقیناً ان آیات میں ان بے شمار اہل ایمان کے لیے بڑا پیغام ہے جو اپنے زمانے اور گردوپیش کے مخصوص حال اور امت کے انتشار واضمحلال کے پیشِ نظر مسلح جہاد کو ممکن نہیں پاتے۔ وہ پیغام یہ ہے کہ ان کے لیے بھی جہاد وشہادت کی راہ کھلی ہے۔ اور وہ اس پر چل کر

شہادت کا مقام پاسکتے ہیں۔ اللہ اور رسول پر سچے ایمان رکھنے اور ان کی مخلصانہ اطاعت کرنے والے راہ حق کے ایسے ہی مجاہدوں اور دین کے ایسے ہی خادموں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ عنداللہ وہ صدیق اور شہید ہیں:

وَالَّذِيْنَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ أُوْلٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَاءُ
عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ (الحدید: ۱۹)

باب ششم

مجاہدین کے لئے اللہ کی غیبی مدد کا وعدہ

اور اس سلسلے میں اللہ کی سنت اور قانون

فصل اول

جہاد میں اللہ کی غیبی مدد کا وعدہ

جہاد کے ان قوانین کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدین کے لئے ان کی جہادی مہم میں اللہ کی طرف سے جس غیر معمولی مدد اور غیبی تائید کے وعدے قرآن مجید میں آئے ہیں ان پر نہ صرف ایک نظر ڈال لی جائے، بلکہ اس پر اس نقطۂ نظر سے بھی غور کیا جائے کہ اس سلسلے میں اللہ کی سنت اور دائمی قانون کیا ہے؟ کب اور کن لوگوں پر یہ مدد آتی ہے؟ اور کب مسلمان اس سے محروم رہتے ہیں؟ اور کب اس کے برعکس، اپنی سنت ہی کے طور پر، اللہ ان کو ذلیل، کمزور اور ظالموں کا تختۂ مشق بنا دیتا ہے؟ اور یہ کہ موجودہ زمانے میں کس طرح اللہ کی ان سنتوں کا ظہور ہو رہا ہے؟۔ بلاشبہ دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے ہم مسلمانوں کے لئے یہ موجودہ زمانہ کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔

قرآن مجید نے اللہ کی طرف سے بار بار اس یقینی وعدے کا ذکر کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھنے والی امت جب مؤمنانہ زندگی کے ساتھ دنیا میں خدا پرستی اور صلاح و خیر کے فروغ کے لئے کوشاں ہو، اور اس راہ میں اس کو اللہ کے باغی مفسدین کی مزاحمتوں اور شرارتوں کا سامنا کرنا پڑے تو اللہ ضرور بالضرور آسمان سے ان کی مدد و نصرت کے انتظام کریگا۔ یہ اس کی لازمی سنت ہے کہ وہ حق کے جانبازوں کی مدد کرے۔ اور ظاہری اسباب میں ان کی کمزوری اور کمی کے باوجود غیب سے ان

کی فتح کے سامان مہیا فرمائے۔

جنگ احد میں مسلمانوں کو فاش شکست ہوئی۔ اس کے باوجود قرآن نے یقین دہانی کرائی کہ:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران ۱۳۹)	اور مت کمزور پڑو تم، اور نہ غم کرو، تم ہی غالب آؤ گے اگر تم ایمان والے ہو۔

سورۂ حج میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت و ترغیب دی گئی ہے، وہیں اللہ کی اس اٹل سنت اور قانون کا بھی واشگاف اعلان کیا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا.....أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ	اللہ یقیناً دفاع کریگا اپنے ایمان والے بندوں کی طرف سے۔ ...... اجازت دی جاتی ہے (اب) ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی ہے (کہ وہ بھی ہتھیار اٹھالیں) یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

اور پھر فرمایا گیا:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (سورہ حج آیات ۳۸۔۴۰)	اور اللہ ضرور مدد فرمائیگا ان کی جو اس (کے دین) کی مدد کریں گے۔ بیشک اللہ قوت اور غلبہ والا ہے۔

پھر اس خاص صورت حال کے پس منظر میں کہ مسلمان مکہ اور دیگر عرب کفار کی چھیڑی ہوئی جنگ کا سامنا کر رہے تھے، اس سورت کا خاتمہ ان ہدایات پر ہوتا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ. وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ

اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِن قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔

یعنی اے اہل ایمان رکوع وسجود بجالاؤ، عبادت اور نیکوکاری کی زندگی اختیار کرو۔تم کامیاب رہو گے۔ اور اللہ کی راہ میں اس طرح جہاد (جدوجہد) کروجیسا کہ اس کا حق ہے...... اللہ کا منصوبہ یہ ہے کہ تم دنیا کے سامنے دین حق کے گواہ بن جاؤ۔

لہٰذا اس فرض کی ادائیگی کے لیے تم کو حکم ہے کہ:

فَأَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ	تم نماز قایم کرو، اور زکوۃ دو، اور مضبوطی
وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ	سے اللہ کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ،

اس کے بعد اللہ کی بھرپور اور شان دار مدد کا وعدہ اس طرح کیا جاتا ہے:

هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ	وہ تمہارے کام بنانے والا ہے۔ اور کیا
النَّصِيْرُ (الحج:۷۸)	اچھا کارساز ہے اور کیا اچھا مددگار۔

ایک اور مقام پر اللہ ورسول پر ایمان لانے اور راہ خداوندی میں جان و مال کو داؤں پر لگا کر جہاد کرنے والوں کو خوشخبری دی گئی ہے کہ:

نَصْرٌ مِنَ اللهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ	اللہ کی طرف سے مدد ہے اور قریب ہے
الْمُؤْمِنِيْنَ. (الصف:۱۳)	فتح اور جیت۔ اور خوش خبری دے دو
	مومنوں کو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اللہ کی اس مدد کے نظارے دنیا کو نظر آئے۔ مسلمان ظاہری تیاری کے اعتبار سے اپنے دشمنوں سے کم ہونے کے باوجود فتح یاب ہوتے چلے گئے۔ میدان جنگ میں قرآن کی تصریح کے مطابق ان کے لئے فرشتے اترے۔ اللہ نے غیب سے ان کے غلبہ کے انتظامات کیے۔ ان کی دل

بستگی فرمائی اور ان کے دشمنوں کے دل رعب سے بھر دیئے۔

قرآن مجید نے سچے اہل ایمان کے لئے مدد و نصرت اور فتح و غلبہ سے سرفراز کرنے اور واضح الفاظ میں دنیا کی حکومت و عزت کو ان کے حوالے کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور اس میں جس صراحت وقطعیت کو اختیار فرمایا ہے، اس کے بعد اہل ایمان کے لئے یہ بات قطعاً ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو جاتی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اگر صحیح اصولوں کے ساتھ دین کی مدد کرے اور اللہ کی مدد و نصرت کی وہ خاص شرطیں پوری کرے جن پر قرآن نے یہ وعدے فرمائے ہیں، تو آخرت کی سرخروئی اور ابدی کامیابی سے پیشتر، اللہ ان کو دنیا میں بھی باعزت کرے گا اور ان کے دشمنوں پر ان کو فتح عطا فرمائے گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا. (النور: ۵۵)

یعنی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے وعدہ کیا ہے کہ ان کو اسی طرح زمین میں حاکم بنائے گا جس طرح ان سے پہلے ایمان والوں کے ساتھ اس نے ایسا ہی کیا تھا اور ان کے اس دین کو بھی دنیا میں غلبہ عطا فرمائے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، اور ان کے خوف کو امن و اطمینان سے بدل دے گا۔

ایک مایوس کن غلطی:

کچھ نئے افکار کے حامل دانشوروں نے یہ (مایوس کن بات) باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ قرآن میں کیے گئے یہ وعدے صرف "رسول" کی بعثت کے ساتھ خاص ہیں۔ اور یہ مدد انہی دشمنوں کے خلاف آئی جن پر خود رسول نے "اتمام حجت" کیا

تھا۔ جب دنیا میں اللہ کا رسول موجود نہ ہو اس وقت مسلمانوں کے لیے اللہ کی یقینی مدد کے یہ وعدے نہیں ہیں۔ پاکستان کے ایک مشہور دانشور جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی طرف سے یہ رائے پیش کی گئی ہے۔ اور اس نے کچھ سطح بیں دانشوروں کو متاثر بھی کیا ہے۔ لیکن قرآن کی آیات اس خیال کا ساتھ نہیں دیتیں۔ قرآن میں اہل ایمان کی مدد سے متعلق بہت سی آیات ہیں۔ ہم نے اوپر ان میں سے جو آیات ذکر کی ہیں ان کے انتخاب میں خاص کر یہ بات پیش نظر رہی ہے کہ ان میں اس غلط تاویل کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ ان میں اللہ کی اس خاص نصرت و مدد کو مطلقاً ایمان، ایمان والی زندگی اور اللہ کے دین کی مدد و نصرت پر قائم و منحصر بتایا گیا ہے، رسول کے ذریعے ''اتمام حجت'' پر نہیں۔

مذکورہ آیات کے علاوہ اسی سلسلے کی یہ آیت پڑھیے:

وکان حقا علینا نصر المؤمنین۔ اور حق ہے ہم پر مدد مومنوں کی۔

(الروم ۴۷)

یہ مدد کن لوگوں کے لیے ہے؟

مگر یہ بات ضرور مدنظر رہے کہ اس سلسلے کی قرآن کی آیات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ فتح و نصرت کی یہ خوش خبریاں ایک خاص عقیدہ و مسلک اور سیرت و کردار کی حامل امت کے لئے ہیں، جس کے قلب و نظر کو ایمان باللہ روشن کر چکا ہو اور پھر اس کی پوری زندگی اس ایمان کے رنگ میں رنگ گئی ہو۔ قرآن کی اس سلسلے کی آیات میں جن لوگوں کے لئے اللہ کی مدد کے یہ وعدے ہیں ان کی اہم خصوصیات یہ بتائی گئی ہیں کہ: اللہ کی عبادت اور یاد ان کا خاص مشغلہ ہو۔ نیکوکاری، دنیا میں بھلائی کا فروغ اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایات کی نشر و اشاعت ان کا مشن ہو۔ ان کی عام زندگی تقویٰ سے مزین ہو۔ اور زکوٰۃ کے اصول پر وہ دنیا کے غریبوں کی مدد کرنے کی

عادت رکھتے ہوں اور اس سلسلے میں ان کی ایسی تربیت ہو چکی ہو کہ اگر اللہ اپنی مدد کے ذریعہ دنیا کی حکومت و دولت کو ان کے حوالے کرے تو وہ اپنے اسی مزاج و صفات اور اسی مشن پر قائم رہیں، اور راستہ نہ بدلیں[1]۔

یہاں کسی کو اس سے دھوکہ نہ ہو کہ ان آیات میں جن اللہ کے بندوں کے لیے اس خاص مدد کا وعدہ کیا گیا ہے ان کی صفت بس یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ایمان والے ہوں گے۔ ایمان کے معنی صرف اللہ و رسول پر یقین رکھنا نہیں ہیں۔ قرآن میں **"ایمان باللہ"** کی اصطلاح کے معنی اکثر و بیشتر یہ ہوتے ہیں کہ ایمان جس حقیقت کا نام ہے وہ دل میں اتر جائے اور زندگی میں ایسی رچ بس جائے کہ ایک مومنانہ زندگی وجود میں آجائے۔ اور اس کا حامل کچے مسلمانوں اور منافقین سے بالکل الگ اور ممتاز نظر آنے لگے۔ ایک مثال سے قرآن کے اس مفہوم کو سمجھنا آسان ہوگا۔ سورۂ حجرات میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ

بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے، کہہ دو نہیں، تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ

---

[1] یہاں یہ بات بھی خاص طور سے مطمح نظر رکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی اپنی مدد کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ 'المؤمنین' سے فرمایا ہے نہ کہ مسلمانوں سے۔ اور اہل علم قرآن کی زبان میں دونوں کا فرق جانتے ہیں۔ حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مضمون میں اس آیت کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: واضح رہے کہ قرآن و سنت کی خاص اصطلاح میں مؤمنین سے مراد اللہ کے وہ خاص بندے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی لاشریک الوہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لائیں اور اسی ایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گذاریں...... پس موجودہ مسلمان قوم کو "مؤمنین" کا مصداق سمجھ کر اس جیسی آیات کے وعدہ کا مستحق سمجھنا قرآنی محاورات سے ناواقفی ہے۔ (الفرقان جمادی الاولی ۱۳۹۶ھ)

کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں۔ اس لیے کہ ابھی تک ایمان جس حقیقت کا
نام ہے وہ تمہارے دلوں کے اندر نہیں اتری ہے۔

اس کے علاوہ سورۂ نساء کی آیت ۳۸، ۳۹ اور ۶۵ سے بھی یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔

اللہ کے باغیوں اور نافرمانوں کے لیے مدد نہیں، قہر و غضب کا اندیشہ ہے:

اگر صورت حال اس کے برعکس ہو، یعنی اگر کوئی قوم اللہ اور اس کے رسول کو ماننے اور تسلیم کرنے کے بعد نافرمان ہو جائے اور اللہ سے کئے ہوئے وعدوں اور میثاقوں کو توڑ ڈالے، تو قرآن مجید میں بیان کی گئی اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کے غیبی قانون کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے قہر و غضب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے اوپر دنیا کی ذلت و رسوائی اور بے چارگی و مظلومیت لکھ دیتا ہے۔ پھر یہی اس کا مقدر ہوتا ہے کہ وہ آفتوں اور مصیبتوں یا دشمنوں کے مظالم و خونریزی کی شکل میں خدائی تنبیہات کا سامنا کرے۔

اس زمانے میں اس سنت کا ظہور کس طرح ہو رہا ہے؟

گذشتہ دو صدیوں سے مسلمانوں کے حصہ میں دنیا بھر میں جو ذلت و مظلومیت آئی ہوئی ہے وہ قرآن پر نظر رکھنے والے کی نگاہ میں اسی سنت اللہ کا نتیجہ ہے۔ اور یہی اس عام اشکال کا جواب ہے کہ اہل ایمان اور خصوصاً مجاہدین مخلصین کے لئے اللہ کی جس مدد کے وعدوں سے قرآن بھرا ہوا ہے ہم اس دور میں اس کا مشاہدہ کیوں نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت اور قانون کی مثال بنی اسرائیل کی تاریخ کے آئینہ

میں تفصیل دکھائی ہے۔ یہ بنی اسرائیل انبیاء علیہم السلام کی اولاد تھے۔ اپنے زمانے میں اللہ کی کتاب اور آسمانی ہدایت کے امین تھے۔ ان کی حیثیت صدیوں وہی رہی جو اب امت مسلمہ کی ہے۔ قرآن نے ان کی نافرمانیوں کی پوری تاریخ بیان کی ہے، اور بتایا ہے کہ اپنی تاریخ کے ایک بڑے حصہ میں آسمانی آفتوں اور اس سے زیادہ دشمنوں کی خونریزیوں کی شکار رہے۔ قرآن نے بارہا کہا ہے کہ ان کے اوپر ذلت ورسوائی اور لاچارگی بطور عذاب خداوندی مسلط کردی گئی تھی۔

ان ہی مقامات میں سے ایک موقعہ پر ان کے ایک گروہ کا یہ حال بتلانے کے بعد کہ وہ اللہ اور اس کے احکام کو تسلیم کر لینے کے بعد اپنی خواہشات کے ایسے تابع ہو گئے کہ جن احکام میں ان کو اپنی خواہشات کی مخالفت نہیں کرنی پڑتی تھی وہ ان کو تو مان لیتے تھے اور جو احکام ان کی ناجائز خواہشات یا ان کے تعصبات اور منفی جذبات کی راہ میں رکاوٹ بنتے وہ ان کو پامال کر ڈالتے، ان کی یہ روداد عمل سنانے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے قانون میں اس جرم کی یہی سزا ہے کہ دنیا میں ذلت ہو اور آخرت میں سخت عذاب۔

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ
إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ
الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ
(البقرۃ ۸۵)

تو جو لوگ تم میں ایسا کریں تو ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں ذلیل اور خوار کیے جائیں اور آخرت میں ان کو سخت ترین عذاب میں ڈھکیل دیا جائے۔

یعنی یہی اس جرم کی سزا ہے۔ جب بھی کوئی قوم ایمان لانے کے بعد اس کردار کا مظاہرہ کرے گی اس کو یہی سزا دی جائے گی۔

قرآن نے بتلایا ہے کہ اس عذاب کی شکل یہ بھی ہوتی تھی کہ ان کے دشمن ان

کے ملکوں میں داخل ہو ہو کر خونریزیاں کرتے تھے، اور ان کو اپنے وطنوں سے نکل کر خانماں بربادی کی حالت میں رہنا پڑتا تھا۔ اللّٰھم ارحمنا۔

بنی اسرائیل نے جب اپنی نادانی کی انتہا کرتے ہوئے شرک بھی کر ڈالا تو اللہ نے اعلان فرمایا کہ ان کو ضرور اللہ کا غضب آ پکڑے گا اور ان کو دنیا میں رسوائی میں مبتلا کیا جائے گا۔ پھر اس کے بعد واشگاف انداز میں خداوند عالم اعلان کرتا ہے کہ:

وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُفْتَرِيْنَ (البقرہ ۱۵۲)

اور ہم اسی طرح (اللہ پر) افتراء کرنے والوں کو سزا دیا کرتے ہیں۔

یہ الفاظ صاف کہتے ہیں کہ اللہ کی مستقل سنت اور اٹل قانون ہے کہ اس کے دین میں داخل ہونے اور وقت کے نبی کو مان لینے کے بعد جو لوگ دین میں ایسی تحریف کریں اور بدعتیں ایجاد کریں کہ شرک تک کر ڈالیں تو وہ ضرور دنیا کی رسوائی کا مزہ چکھیں گے اور اللہ کے غضب کا شکار ہونگے۔ عبرت کا مقام ہے، سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ایک بڑی تعداد جس طرح کھلے شرک میں اور وہ بھی اسلام ہی کے نام پر مبتلا ہے اس کے دیکھتے ہوئے اس آیت پر غور کیجیے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

انبیاء علیہم السلام کی امتوں کے سلسلہ میں اللہ کی اس سنت کا علم جہاد کے موضوع سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کی بصیرت کے بغیر مجاہدین کے لئے اللہ کی مدد کے اصول اور ضابطوں کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ افسوس کہ مسلمانوں کی موجودہ اجتماعی سیرت اس خوش فہمی کا کوئی امکان نہیں چھوڑتی کہ ان کی موجودہ رسوائیاں اور خونچکاں نکبتیں اللہ کے غضب کا نتیجہ نہیں ہیں۔

کیوں نہیں آئی اللہ کی مدد؟

بلکہ ہمت کر کے یہ بھی کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ حالت کے باقی

رہتے، اگر اللہ کے دین سے وفاداری اور اپنے خلوص وقربانی میں ممتاز مقام کا حامل مجاہدین کا کوئی گروہ کھڑا بھی ہوتا ہے تو بھی بظاہر (سنت اللہ کے مطابق) اس کی اللہ کی طرف سے ایسی مدد کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے جس سے کفر وظلم کے شکنجے مکمل طور پر ٹوٹ سکیں، اور امت مکمل عزت وغلبہ کے مقام پر دوبارہ آسکے۔ اس لیے کہ جو حالات ہیں وہ پوری امت کے بحیثیتِ مجموعی اللہ کے دین سے بے وفائی اور روگردانی اور ایمان کے ذریعے اللہ سے کیے ہوئے عہد ومیثاق کو توڑنے کا نتیجہ ہیں۔ ان کو کسی ایک گروہ کا ایمان واصلاح نہیں بدل سکتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اپنی غیر معمولی قربانی یا اسباب کی قوت سے وہ کچھ معرکے سر کرلے۔ لیکن بحیثیت مجموعی امت کی حالت بدلنے کی اس کے سوا کوئی صورت اللہ کی سنت کی روشنی میں نہیں ہے کہ یہ امت اللہ سے کیے ہوئے عہد ایمانی کو پھر سے جوڑے۔ لیکن بہر حال، کسی خاص گروہ کا خلوص وقربانی اور جہاد وشہادت کے کارنامے آخرت کی زندگی میں اس کے لئے اسی غیر معمولی اجر وثواب کا ذریعہ ہونگے جس کا اللہ کی طرف سے وعدہ ہے۔

ماضی قریب میں دنیا کی بدترین ظالم وکافر حکومت کے سامنے افغانستان کی اسلامی مجاہد فوجوں کو جب ابتداءً پسپائی اور ہزیمت اٹھانی پڑی، تو اس نے بہت سوں کی طرح اس راقم کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا کیا کہ: کیوں نہیں آئی اللہ کی مدد؟ اگرچہ اس کا ایک اطمینان بخش جواب یہ بھی ملا کہ احد کی جنگ میں رسول اللہ کی موجودگی میں بعض لوگوں نے دنیا کی خواہش میں پڑ کر جو اللہ کے رسول کی نافرمانی کی، تو اللہ کی آئی ہوئی مدد واپس چلی گئی اور جیتی ہوئی جنگ ایسی شکست میں تبدیل ہو گئی کہ ستر (۷۰) صحابہ شہید اور رسول اللہ سخت زخمی ہوئے۔

قرآن نے اس ہزیمت کے سبب کو بیان کیا ہے اور تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ سب متاع دنیا کی خواہش کے زیر اثر کی گئی ایک غلطی کا نتیجہ ہے، تمہارے کچھ لوگ دنیا طلبی

کے شکار ہو گئے، انہوں نے مال غنیمت لوٹنے کے لیے اللہ کے رسولؐ کے احکام کو نظر انداز کیا۔ اس لیے اللہ کی مدد تم سے روٹھ گئی۔ مگر قرآن نے وہیں یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر ایمان کی راہ پر آئندہ استقامت اختیار کی گئی تو یہ شکست وقتی ثابت ہو سکتی ہے، اور پھر مستقل و پائیدار غلبہ تمہارے حصہ ہی میں آئے گا۔ تو جب اللہ کے رسول کے بیچ میں ہوتے ہوئے متاع دنیا کی خواہش میں کی گئی ایک غلطی سے اللہ کی مدد روٹھ سکتی ہے، تو اس زمانے میں ہماری غلطیاں کہاں ہمیں کوئی یقینی و فوری مدد کی امید قائم کرنے دے سکتی ہیں۔

لیکن اسی موقعے پر یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ	اور مت کمزور پڑو تم، اور نہ غم کرو، تم ہی
الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ	غالب آؤ گے اگر تم ایمان والے ہو۔

(آل عمران ۱۳۹)

اس سے امید بندھتی ہے کہ ان شاء اللہ ہماری حالیہ شکستیں فتح و انتصار سے بدل سکتی ہیں۔

لیکن اس سے بھی زیادہ جو بات علمی اطمینان کا باعث ہوئی وہ یہ کہ قرآن کی ان آیات میں تدبر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی خاص غیبی اور غیر معمولی مدد جو اسباب و وسائل میں کمی اور کمزوری کے باوجود کسی قوم کو غالب اور برتر کر دیتی ہے اس کا اصل دارومدار اس بات پر ہے کہ مجموعی طور پر پوری قوم کی عمومی ایمانی و اخلاقی حالت کیسی ہے؟ اور یہ کہ وہ کس درجے میں ''حزب اللہ'' یعنی دنیا میں خیر و فلاح پھیلانے کو اپنا مشن قرار دینے والی اللہ کی خاص جماعت بن گئی ہے؟ اور من حیث القوم اس قوم کی اجتماعی حالت کیا اس درجہ کی مؤمنانہ ہے کہ اس کے قدموں میں اگر دنیا کی حکومت اور دولت کے خزانے ڈال دے جائیں تو یہ بات طے ہو کہ اس سے

دنیا میں خدا پرستی اور عدل و غریب پروری کا نظام قائم ہوگا؟ یا یہ ہوگا کہ ایک قوم کی بالا دستی و سطوت کی جگہ اسی جیسی یا قومی کردار میں اس سے کم وبیش مشابہت رکھنے والی کسی دوسری قوم کی سطوت و حکومت قائم ہو جائے گی؟؟؟

ہمارے سامنے اللہ کی طرف سے یقینی و فوری مدد کی امید قائم کرنے والی حالت کچھ مخصوص گروہوں یا کسی ایسی خاص سپاہ کی تو شاید ہو سکی ہو جو اپنے کردار اور سیرت کے اعتبار سے ممتاز ہوں اور اپنے دشمنوں سے مقابلہ آرا ہوں۔ باقی ہر خطۂ زمین میں ہماری اجتماعی اور عوامی حالت اللہ سے بغاوت و سرکشی کی ہی رہی ہے۔ والعیاذ باللہ۔

بہرحال اس نکتہ نے سارا اشکال حل کر دیا کہ اللہ کی اس مخصوص مدد کا دارومدار قوم کے اجتماعی حال پر ہوتا ہے نہ کہ کسی خاص گروہ اور مجاہد جماعت کے ایمانی کردار اور جہادی خلوص و قربانی پر۔ والحمد للہ۔

باب ہفتم

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات

اسلامی شریعت کی روشنی میں

فصل اول

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں

کچھ سنگین غلط فہمیاں اور الزامات

موجودہ زمانے میں اس سلسلہ میں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مسلم دشمن پروپیگنڈہ مشنریز نے بڑا شور مچایا ہے کہ اسلام نفرت و دشمنی کی تبلیغ کرنے والا دین ہے۔ اس کی کتاب قرآن امن عالم کے لئے خطرہ ہے۔ جب تک وہ دنیا میں موجود رہے گا دنیا امن سے محروم رہے گی۔ انہوں نے اپنے اس پروپیگنڈے کی ترویج کے لئے قرآن کی بعض آیات کو غلط مفہوم پہنا کر پیش کیا ہے۔ اور حقیقت حال سے ناواقف لوگوں کے لئے تلبیس کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ کتابوں اور اخبارات و رسائل کے علاوہ انٹرنیٹ پر تو اس پروپیگنڈے کا ایک تلاطم خیز سمندر ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ اعتراف ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک تعداد کے اندر اس سلسلہ میں ایسی غلط فہمیاں اور غلو آمیز تصورات پائے جاتے ہیں، جن کی بنیاد قرآن وسنت کے نصوص کی سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر مکمل اور واضح گفتگو کی جائے، تلبیسات کا پردہ چاک اور غلط فہمیوں اور غلو آمیز نظریات کی بنیاد شکنی کی جائے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام کی یہ تاکید ہے کہ مسلمان اپنے دینی مزاج وخصوصیات اور اخلاقی صفات میں غیر مسلموں سے کھلے طور پر ممتاز رہیں، ان کی نقالی سے پرہیز

کریں، اور خاص طور پر ان کی ان مذہبی نشانیوں اور رسموں سے (جن کو اسلام غلط کہتا ہے) علیحدگی کا ضرور اظہار کریں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن نے اسلام کے دشمنوں اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے والوں سے ساز باز کرنے سے سختی سے منع کیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ رحمدلی، ہمدردی، حسن سلوک، نرمی اور اچھوں سے محبت کی تعلیم دیتا ہے، تفصیل ذیل میں ہے۔

انسانی برادری کا احترام:

اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے یہ تعلیم بھی ہے کہ سارے انسان چاہے وہ جس قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں وہ ایک ماں باپ کی اولاد، اور ایک انسانی برادری کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں [سورہ حجرات ۱۳]۔ اسلام نے ساری انسانیت کو ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کا جو تصور دیا ہے اور جس کو قرآن وحدیث میں بار بار یاد دلایا گیا ہے اس کا بھی تقاضا ہے کہ ایک وسیع تر انسانی برادری کا احساس اور سارے انسانوں کے بھائی بھائی ہونے کا شعور پیدا ہو۔

اسی لئے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد دعا و حمد کے کلمات کے دوران اللہ کی ربوبیت اور اپنی رسالت کی گواہی کے ساتھ یہ شہادت بھی دیا کرتے تھے کہ:

اللھم ربنا و رب کل شیء انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ

اے اللہ! اے ہمارے اور ہر چیز کے رب۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے بندے بھائی بھائی ہیں۔

قرآن کی نظر میں نوع انسانی ایک قابل تکریم واحترام مخلوق ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ......	اور ہم نے بنی آدم کو تکریم سے نوازا۔
وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيْرٍ مِّمَّنْ	......اور ان کو اپنی بہت ساری مخلوقات

---

۱ ابوداؤد ۱۵۰۸، مسند احمد ۱۸۸۰۷ اسنادہ ضعیف

خَلَقْنَا تَفْضِيْلاً [اسراء۷۰] پر فضیلت بخشی۔

اسلام انسان کو بنیادی طور پر اپنی انسانیت کی بنا پر قابل اکرام ومحبت اور ہمدردی کا مستحق بتاتا ہے۔ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کچھ صحابہ حاضر تھے کہ ایک جنازہ گذرا۔ آپ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے (یہ دیکھ کر کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنازے کے اکرام میں کھڑے ہوئے ہیں) آپ کو بتلایا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا یہ جان (یعنی انسان) نہیں؟ "أليست نفساً" آپؐ کے بعد کچھ صحابہ بھی اس پر عمل بھی کیا کرتے تھے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری مخلوق کے ساتھ رحم دلی کی فاتح زمانہ تعلیم دی ہے، ارشاد ہے۔

الراحمون يرحمهم الرحمٰن. ارحموا من في الارض يرحمكم من في السماء.[2]

رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے، تم زمین والوں کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ کیا کرو، آسمان والا تمہارے ساتھ رحم کا معاملہ کرے گا۔

یہ دراصل قرآن کی رحم کی عام تعلیم ہی کی تشریح ہے۔ قرآن نے رحمت وہمدردی کی پرجوش ترغیب دیتے ہوئے کہا ہے: کہ افسوس انسان کو ساری نعمتیں بھی نجات کی گھاٹی پار کرنے پر آمادہ نہیں کرتیں۔ پھر نجات کی گھاٹی پار کیسے ہوتی ہے؟ اس کی یہ تفصیل ارشاد ہوتی ہے:

"غلام آزاد کرنا، قحط کے دنوں میں کھانا کھلانا یتیم رشتہ دار کو، یا ایسے غریب کو جو غربت سے خاک میں ملا جارہا ہے۔ پھر اس کے بعد ان لوگوں میں سے ہونا جو ایمان لائے اور آپس میں ایک دوسرے کو تحمل وبرداشت اور رحم

---

[1] ملاحظہ ہو: صحیح بخاری ۱۳۱۲ و صحیح مسلم ۹۶۱

[2] سنن ترمذی ۱۹۲۴، سنن ابوداود ۴۹۴۱

کی تاکید کرتے رہے۔'' [سورۃ البلد، ۱۱، تا ۱۷]

یہ ہے نجات کا راستہ: خود ہی رحم دل نہ ہونا، بلکہ رحم دلی اور ترس کھانے کے تبلیغی مشن میں لگنا۔ ایسوں ہی کے قدم شاہراہ نجات پر ہیں۔

اسلام نے انسان تو انسان ہر جاندار کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے۔

فی کل کبد رطبۃ اجر[1] ہر جاندار کے ساتھ حسن سلوک میں ثواب ہے۔

قومی اخوت کا رشتہ:

اسلام ایک قوم و نسل کے لوگوں میں ایک طرح کی اخوت اور اس پر مبنی اپنائیت کے رشتے کو ایک ثابت شدہ قدر کہتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار قرآن نے جا بجا اس طرح کیا ہے کہ حضرت ہود، حضرت صالح، اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کو اپنی غیر مسلم قوموں کا بھائی قرار دیا ہے، اور اس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان قومی اخوت کو تسلیم کیا ہے۔ والی عاد اخاھم ھودا. والیٰ ثمود اخاھم صالحا. والیٰ مدین اخاھم شعیبا (الاعراف) ۔ یہ اللہ کے نبی جب اپنی دعوت لے کر ان قوموں کے پاس جاتے تھے تو ان کو ''یا قوم، یا قوم، اے میری قوم اے میری قوم'' کے دل نواز انداز میں مخاطب کرتے اور اسی قومی اخوت کی دہائیاں دیتے تھے۔ یہ آیات بڑی واضح رہنمائی دیتی ہیں کہ مسلمان اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کس قسم کی خیر خواہانہ محبت کا طرز خطاب اختیار کریں۔

اس زمانے میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی یہ اہم ترین بنیاد ہے۔ اسی کی بنا پر ایک ملک یا ایک معاشرتی اکائی میں بسنے والے مسلمانوں کے درمیان رشتے قائم ہونے چاہئیں۔

---

[1] صحیح بخاری، ۶۰۰۹

نسلی رشتے کی بنیاد پر پوری قوم کس طرح ہمدردی اور محبت کی مستحق ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اس بنا پر مصریوں کا خیال تھا کہ حضرت اسماعیل کی والدہ وہاں کی تھیں، آپ عربوں کو اس قدیم نسلی رشتے کا خیال رکھنے کی وصیت کر کے گئے۔ آپ نے فرمایا:

انکم ستفتحون ارضاً یذکر فیہا القیراط، فاستوصوا باھلہا خیراً، فان لہم ذمۃ ورحماً[1]	تم لوگ عن قریب مصر فتح کروگے۔ میری وصیت ہے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ اس لیے کہ ان کو حق ذمہ ہو گا، اور ان سے تمہارا نسلی رشتہ بھی ہے۔

اس سے سبق ملتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ملکی ونسلی بھائیوں کے ساتھ کیسے ہمدردانہ معاملے کی تعلیم دی گئی ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور ہمدردانہ معاملے کی کچھ مثالیں:

بحیثیت انسان غیر مسلم جس ہمدردی وحسن سلوک کے مستحق ہیں اس کی مثالیں مختلف اسلامی تعلیمات اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کے آئینہ میں ہم کو بکثرت ملتی ہیں:

۱- مالی مدد: قرآن مجید میں ایک جگہ حکم دیا گیا ہے کہ غیر مسلم ضرورت مند بھی تمہاری مالی مدد کا مستحق ہے۔ اس کی مالی مدد کی جانی چاہیے۔ سورۂ بقرہ میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ کسی کو ہدایت دینا یا نہ دینا یہ تمہارا کام نہیں، اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، تم اس خیال سے کسی کی مالی مدد سے ہاتھ نہ روکو کہ وہ اسلام قبول نہیں کرتا، تم اللہ کے راستے میں جو خرچ کروگے اس کا بدلہ پاؤ گے۔

---

[1] صحیح مسلم ۲۵۴۳

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (البقرة: ۲۷۲)

اس آیت کا سیاق بتلاتا ہے کہ انسانوں کی مالی مدد کے وقت یہ دیکھنا ضروری نہیں کہ کون اسلام کو قبول کرتا ہے کون نہیں۔ ہر ضرورت مند مستحق ہے۔

امام ابن جریر طبری اس آیت کی تشریح میں کہتے ہیں کہ اس آیت میں حکم دیا گیا کہ غیر مسلموں کو صدقے سے محروم نہ رکھا جائے۔ طبری نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ علماء صحابہ و تابعین نے اس آیت سے یہی معنی اخذ کیے ہیں[۱]۔

خلفائے راشدین کا یہی طرز عمل رہا، حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر کے نام خط لکھ کر حکم دیا کہ غیر مسلم رعایا میں جو غریب اور ضرورت مند ہو اس کی اور اس کے عیال کی کفالت مسلمانوں کے مال میں سے کی جائے[۲]۔

۴۔صلہ رحمی: اسلامی زندگی کی بنیاد جن چیزوں پر رکھی گئی ہے، ان میں سے ایک رشتہ داروں (خصوصاً قریبی رشتہ داروں) کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے، جو 'صلہ رحمی' کہلاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ صاف اعلان کر دیا گیا کہ جو رشتہ داروں کے ساتھ رشتہ نہیں نباہتا اللہ کا اس سے اعلان جنگ ہے۔ "**ومن قطعها بتته**"[۳] اور صاف اعلان کر دیا گیا کہ جنت میں رشتوں کو کاٹنے والے کی کوئی جگہ نہیں ہے[۴]۔

یہ صلہ رحمی ہر مسلم و غیر مسلم رشتہ دار کا حق ہے، اسلام رشتوں کو جوڑتا ہے، توڑتا نہیں۔ رشتہ داری کے اس حق میں غیر مسلم کو بھی رشتے کے تمام حقوق حاصل ہوں گے،

---

۱ تفسیر طبری، ۳/۶۳

۲ کتاب الخراج، ابو یوسف، ص ۱۵۷

۳ مسند احمد ۱۶۸۴، نیز صحیح بخاری ۵۹۸۷-۵۹۸۹

۴ مسلم ۲۵۵۶

یہاں تک کہ قرآن نے یہ تک کہہ دیا کہ اگر ماں باپ غیر مسلم ہوں اور اولاد پر اسلام ترک کرنے کا دباؤ ڈالتے ہوں، تب بھی اگرچہ ان کی بات ہرگز نہ مانی جائے، لیکن اچھا سلوک ہر حال میں کیا جائے (سورۂ لقمان ۱۵)۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی والدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہتیں، اور وہ صبر کرتے تھے، انہوں نے آں حضرتؐ سے شکایت کی تو بجائے نفرت کے دعا ملی، اور دعا سے ہدایت یاب ہوئیں۔ پھر آپؐ نے ان کے لیے مزید دعا کی کہ: اے اللہ ابو ہریرہ اور ان کی ماں کی محبت اپنے مومن بندوں کے دل میں ڈال دے۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں: بس! اب ہر ایمان والا مجھ سے محبت کرتا ہے[۱]۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی والدہ مشرک تھیں، صلح حدیبیہ کے بعد جب دونوں طرف کے رشتے داروں کو آپس میں ملنے کا موقعہ ملا تو وہ اپنی بیٹی حضرت اسماء کے پاس آئیں، ساتھ میں کچھ ہدیے تحائف بھی تھے، حضرت اسماء کو بھی خیال ہوا کہ والدہ کو کچھ تحفوں کے ساتھ رخصت کیا جائے، مگر شبہ ہوا کہ اسلام کہیں غیر مسلم رشتہ داروں کو تحفے دینے سے منع تو نہیں کرتا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کیا جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کرو اور ان کو تحائف کے ساتھ رخصت کرو[۲]۔

اس روایت کے الفاظ "وهي راغبة" سے کچھ لوگوں نے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ وہ کسی طلب کے ارادہ سے مدینہ آئیں تھیں، اور ضرورت مند تھیں۔ لیکن وہ تو ایک خوشحال خاتون تھیں، حافظ ابن حجر نے دیگر مآخذ کی یہ تصریح بیان کی ہے کہ وہ تو خود ہدیے تحائف لائیں تھیں۔ عربی زبان کی رو سے ان الفاظ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا

---

[۱] صحیح مسلم ۲۴۹۱

[۲] صحیح بخاری، ص ۲۶۰۲، نیز فتح الباری

ہے کہ وہ اس رشتے کو بحال کرنا چاہتی تھیں جس کو حالات کی ستم ظریفیوں نے کاٹ ڈالا تھا۔ لہٰذا حضرت اسماء کے ہدیے کا مقصد بظاہر ضرورت مند ماں کی مدد نہیں، بلکہ خاندانی رشتہ محبت کے حق کی ادائیگی تھی۔

دیگر سماجی تعلقات:

مسلمانوں کو اگرچہ غیر مسلموں کے ساتھ ایسے اختلاط سے منع کیا گیا ہے جس سے ان کی دینی خصوصیات کے مٹنے کا ڈر ہو، لیکن اس کے باوجود اسلام غیر مسلموں کے ساتھ اعلیٰ درجے کی خیر خواہی اور بہتر معاشرت کی ہدایت کرتا ہے۔ پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک اسلام کی ایسی تاکیدی تعلیم ہے کہ احادیث میں اس میں کوتاہی پر ایمان تک کے سلب کئے جانے کا خطرہ بتلایا گیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سراپا رحمت ولطف ہونے کے باوجود تین تین مرتبہ قسمیں کھا کر کہا ہے کہ جو پڑوسی کے لئے بے اطمینانی کا سبب بنے وہ مومن نہیں[1]۔

یہ پڑوس کا تعلق مسلم وغیر مسلم سب کا ہو سکتا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو کے گھر ایک بکری ذبح کی گئی۔ گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے پوچھا: ہمارے یہودی پڑوسی کے گھر میں کچھ بھیجا؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید کرتے سنا ہے[2]۔

مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کی ایک حسین تعلیم یہ بھی ہے کہ دشمن بھی اگر کسی مصیبت میں ہو تو اس کے لئے اللہ سے نیک دعا کی جائے، اگر ایک طرف آپؐ اللہ سے کبھی ظلم واستبداد کے خوگروں کو سزا دینے کی دعا کرتے تھے (بخاری ۲۸۵۴)، تو دوسری طرف یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ مکہ کے لوگ جو ظلم و دشمنی میں

---

1. صحیح بخاری، ۶۰۱۶

2. ابوداؤد، ص ۵۱۵۲

ہرنا کردنی کرتے آرہے ہیں، شدید قحط میں مبتلا ہوتے ہیں، اب ان کو محمدؐ یاد آتا ہے۔ ابوسفیان آتے ہیں اور رشتے داری کی دہائی دے کر کہتے ہیں کہ آپ کی قوم مری جارہی ہے دعا کردیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے ہیں، بالآخر آپ کی دعا سے ہی یہ عذاب ٹلا ہے[1]

کسی یہودی کو آپ کی مجلس میں چھینک آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح مسلمانوں کو دعا دیتے اسی طرح ان کو بھی دیتے: **یهدیکم الله ویصلح بالکم**[2]۔ اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارا حال اچھا کرے۔ روایت میں ہے کہ اس دعا کے شوق میں یہود بن بن کر چھینکتے، مگر رسول اللہؐ ان کو پھر بھی اس دعا سے نوازتے۔

مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں (اور بخاری میں بھی) غیر مسلم کو دعا دینے سے متعلق کئی روایات کو باقاعدہ ایک باب کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی کیسی خیرخواہی کی تعلیم دی ہے کہ ان کے لیے نیک دعا کرنا ایک سنت نبوی قرار پاتا ہے۔

پریشان و مصیبت زدہ سے اظہار ہمدردی سماجی رشتوں کی تعمیر کرنے والی چیز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اس پر کاربند تھے۔ غیر مسلموں کی عیادت کرتے اور ان کے گھر جاتے تھے[3]۔

غیر مسلموں کو ہدیے اور تحفے دینا، اور ان کے ہدیوں کو قدر کے ساتھ قبول کرنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی۔ حدیث کی کتابوں میں اس سلسلے کے متعدد واقعات مروی ہیں۔ ایک غیر مسلم فرماں روا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک

---

1. صحیح بخاری ۴۸۲۴
2. سنن ابوداؤد ۵۰۴۰
3. صحیح بخاری، ص ۵۶۵۷

بڑا حسین ریشمی کام دار جبہ بھیجا، آپ نے قبول فرمایا[1]۔ اور حضرت جعفر بن ابی طالب کو یہ کہہ کر دے دیا کہ وہ اس کو ''اپنے بھائی'' نجاشی کے پاس بھیج دیں[2]۔ حضرت عمرؓ نے ''اپنے ایک مشرک بھائی'' کو ایک قیمتی کپڑا ہدیے میں بھیجا جو رسول اللہؐ کے علم میں آیا[3]۔ ایلہ کے بادشاہ نے آپ کو کپڑے اور سواری بھیجی جو استعمال کیے گئے[4]۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت امت کو اور خصوصاً اپنے خلفاء کو جو وصیت فرمائی اس میں یہ ہدایت بھی تھی کہ آنے والے مہمان وفود کو (جو عموماً غیر مسلم ہوتے تھے) انعام و ہدایا دے کر رخصت کیا کرنا، جیسا کہ میرا معمول تھا[5]۔

ہم طعامی حسن تعلق کا خاص مقام ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کو کھانے پر بھی مدعو کرتے۔ مکہ کے ابتدائی دور میں آپ نے ۴۰ ر افراد کی دعوت کی تھی[6]۔

شریعت وسنت کے ان نہایت مختصر حوالوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام کی اصل ہدایت غیر مسلموں کے ساتھ عام انسانی محبت، ہمدردی اور ہر قسم کے حسن سلوک کی ہے۔ یعنی اگر غیر مسلم صرف غیر مسلم ہے، ظالم، اسلام کا دشمن، مسلمانوں سے جنگ آزما اور فسادی سازشوں کا مرتکب نہیں ہے تو اسلام اس کو انسانی برادری کے رشتہ کے اکرام، مدد اور تعاون کا مستحق جانتا ہے۔

---

1. صحیح بخاری، ص ۲۶۱۶
2. مسند احمد، ص ۱۳۲۱۴
3. مسلم ۲۰۶۸
4. صحیح بخاری ۳۱۶۱
5. صحیح بخاری ۳۰۵۳، نیز صحیح مسلم ۱۶۳۷
6. مسند احمد ۸۸۵

فصل دوم

اسلام کی تاکید کہ

مسلمانوں کا دینی امتیاز اور فرق قائم رہے

ہمدردی و مدد کی اس تعلیم کا اصل حسن اس وقت آشکارا ہوتا ہے جب اس حقیقت کو بھی یاد رکھا جائے کہ دنیا کی بے اصول قومیتوں کے بالکل برعکس اسلام مسلمانوں کو اس کی پرزور تاکید کرتا ہے کہ وہ دنیا میں مخصوص اصول وافکار اور اخلاق وکردار کے داعی ہیں، دوسروں کی طرح صرف عیش وآرام ان کا مقصد نہیں، لہٰذا اپنی اصولی حیثیت اور اخلاقی امتیاز Identity کو غیر مسلموں کے ساتھ ملنے جلنے میں ہرگز تحلیل نہ ہونے دیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں میں اس سلسلے میں بڑی حساسیت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر ایسی ہدایات دی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ عام تہذیب و زندگی میں غیر مسلموں سے (باوجود ہمدردی وتعاون کے) مشابہت اختیار نہ کی جائے۔

جب مختلف عقیدہ ومسلک کے لوگ ایک ساتھ رہیں گے تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ ساتھ رہنے کے نتیجے میں قومیں ایک دوسرے کا اثر قبول کریں، اور دھیرے دھیرے ایک دوسرے میں ایسے ضم ہو جائیں کہ ان میں کوئی امتیاز باقی ہی نہ رہے۔ دنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے اسلام اس امکانی خطرے کی روک تھام کے لئے سارے انتظامات کرتا ہے۔

کسی فرد یا جماعت کے مسلم ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اسلامی طرز زندگی اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کو برحق مانا جائے، اور اس کے خلاف ہر طریقہ و عمل کو بالکل غلط اور لائق پرہیز سمجھا جائے، اور اس سے دلی بُعد اور دوری بھی ہو۔ آج کی دنیا عقیدہ و اخلاق کی حس کھو چکی ہے، اس لیے لوگوں کو اس اصول پسند موقف میں شدت پسندی نظر آنے لگتی ہے۔ حالانکہ کسی عقیدۂ و نظریے پر ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے۔ اسلام ہی نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ دنیاوی مقاصد کے لئے قائم ہونے والی مشنری مزاج والی تحریکات کے کارکنوں میں اپنے مشن سے مخلصانہ وفاداری کے نتیجہ میں یہی مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے کہ جس کا ظہور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی شکل میں ہوا ہے، جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے یہ بات قطعاً ناقابل قبول قرار دی ہے کہ اسلام اور اسلامیت پر ان کا یقین ایسا کمزور اور ان کے اعتماد کا درجہ اتنا پست ہو کہ غیر مسلموں سے مرعوب ہو کر ان کی نقالی کرتے پھریں۔ کوئی مسلمان اگر غیر مسلم قوموں کی (چاہے ظاہری لباس اور ظاہری طرز معاشرت ہی میں سہی) نقل کرتا اور مشابہت اختیار کرتا ہے تو یہ سوائے احساس کہتری کے اعلان کے اور کچھ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کو ذلیل و پست سمجھتا ہے، اس کو قطعاً یہ یقین نہیں کہ اس کے پاس دنیا کو دینے کے لئے کوئی پیغام اور اصول و مسلک بھی ہے۔

اسلام مسلمانوں کے لئے اس پوزیشن کو کیسے قبول کر سکتا تھا؟ جب کہ اس کا منشا یہ ہے کہ ہر ہر مسلمان اپنے دین و مسلک کے بارے میں نہ صرف یقین و اعتماد سے بھرا ہوا ہو، بلکہ اس کی زندگی سے دنیا کے سامنے ان حقائق اور اصولوں کی عملاً گواہی قائم ہوتی ہو۔ یہی مطلب اشهد ان لا الٰه الا الله واشهد ان محمداً

رسول اللہ کا ہے۔اور یہی نہیں، بلکہ اسلام کا اپنے ماننے والوں سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ جس دین کو انہوں نے یہ سمجھ کر قبول کیا ہے کہ وہی دنیا وآخرت کے خیر وفلاح کا راستہ ہے،اور اس کے خلاف سب کچھ گمراہی وفساد ہے، وہ اس دین کے خیر وسعادت کو پوری دنیا میں پھیلانے اور اس کے چلن کو عام کرنے کیلئے ہر ممکن حد تک جدوجہد کریں اور اس میں کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔یہی سبب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیروں کی مرعوبیت اور نقالی کو اسلامیت پر اعتماد کے لئے قاتل کہا ہے۔

من تشبہ بقوم فھو منھم[1]

جس نے کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ انہی میں سے ہو گیا۔

واقعۃً مسلمانوں کے اندر اسلامی طرز زندگی پر اور اسلامی اصول واخلاق پر ایسا اعتماد باقی رہنا ان کی ملّی بقاء کے لئے اور اسلام کی اصولی سرحدوں کی حفاظت کے لئے ایسا ہی ضروری تھا۔

قوموں کی زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے ہی ہیں کہ ان کی اخلاقی، معاشرتی اور تہذیبی شناختیں (Identities) ایک دوسرے میں ضم (Integrate) اور تحلیل ہوتی رہتی ہیں۔یہ عمرانیات کا طے شدہ اصول ہے کہ غالب قوم کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ مغلوب قوم کو اپنے اندر ضم کرلے اور اس کے تشخصات کو تحلیل کردے۔ہم اس زمانے کی غالب تہذیب کی طرف سے ایسی ہی کوششوں کا مقابلہ پوری دنیا میں کر رہے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ احکام انسانی فطرت اور اصول اجتماع کے بڑے گہرے فہم پر مبنی تھے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف چیزوں میں غیر مسلموں سے امتیازی طرز اختیار کرنے کو ضروری قرار دیا ہے۔

مشہور آسٹرین نو مسلم مصنف ومفکر محمد اسد (سابق LEOPOLD WEISS)

---

[1] ابوداؤد، ص ۴۰۳۲

اپنی کتاب Islam at the Crossroad میں لکھتے ہیں:

> صرف نہایت سادہ لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ وہ کسی تہذیب کی ظاہری چیزیں اس کی روح سے متاثر ہوئے بغیر اختیار کر سکتے ہیں۔ تہذیب کوئی کھوکھلا وجود نہیں ہوتی ہے۔ ہم اس کے ظاہر کو جب لیتے ہیں اس کی روح اسی وقت ہمارے اندر داخل ہو کر اپنا کام کرنے لگتی ہے۔ ہم محسوس بھی نہیں کرتے اور وہ ہماری عقلوں پر قبضہ جمالیتی ہے۔ ہم یورپ کی تہذیب کی خارجی شکلوں لباس، عادات واطوار اور اسلوب زندگی کو لیں گے تو اس کی اس روح سے بھی متاثر ہوں گے جو دین کی دشمن ہے"[1]

شریعت نے داڑھی بڑھانے کا اور مونچھیں چھوٹی رکھنے کا جو حکم دیا یا ظاہری ہیئت کے بعض خاص طریقوں کے اختیار کرنے سے منع کیا ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکام کے دیے جانے کا مقصد ہی یہ بتایا کہ دوسری ملتوں سے اختلاف کا اظہار کیا جائے۔ اور اس کے علاوہ بھی بعض چیزوں سے روکنے میں یا ان کا حکم دینے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے اندر اس خاص مزاج کو پیدا کرنا چاہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے الگ جماعت سمجھیں۔ اتحاد و بھائی چارگی کے باوجود وہ کسی جماعت کا ضمیمہ بننے یا کسی اور میں مطلق ضم ہونے کو تیار نہ ہوں اور ان میں اپنے امتیازات کے تحفظ پر اصرار پیدا ہو۔

جس شخص کی اس حقیقت پر ذرا بھی نظر ہوگی کہ آزادی وجمہوریت کے اس دور میں بھی حکومتیں اور حکمراں قومیں تعلیم وتہذیبی تبلیغ کے ذریعہ جس طرح مذہبی وتہذیبی اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کو "قومی دھارے" اور Mainstream میں اس طور پر ضم Integrate کرنے کی کوششیں کررہی ہیں کہ ان کے سارے امتیازات ختم ہوجائیں، وہ یقیناً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات کی معنویت اور اس میں

---

[1] Islam at the Crossroad p.81-83) باختصار)۔

پوشیدہ حکمت کو بآسانی سمجھ لے گا۔ بلکہ یہی چیز اس کے لیے غور وفکر کے نئے دروازے کھولے گی اور اس کے ایمان میں اضافہ ہوگا۔ اپنی اخلاقیات وخصوصیات کے تحفظ کے لیے ایسے انتظامات بتلاتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں مسلمانوں کی دینی واخلاقی پوزیشن کیا ہے اور اس کا تحفظ کس قدر مطلوب ہے۔ دنیا میں کسی اور قوم وملت کی سوچ کا طائر پرواز ان انتظامات تک نہیں پہنچتا۔

غرض ان احکام کا مقصد ومطلوب مسلمانوں کے دلوں میں اپنے اصول ومسلک پر اعتماد قائم کرنا، دوسروں کی مرعوبیت ونقالی سے ان کو روکنا، انکی اصولی حیثیت کے بقا اور دوسری قوموں میں اخلاقی وتہذیبی طور پر تحلیل ہونے سے بچانا ہے۔ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کی اصل حکمت ہے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو عبادات میں غیر مسلموں سے مشابہت اختیار کرنے سے روکا یا بعض معاشرتی طریقوں سے منع کرتے ہوئے یہ کہا کہ ''ایسا مت کرو اور یہود ونصاریٰ یا مشرکین یا مجوس کی مخالفت کرو''۔

اگر کوئی سمجھتا ہے کہ ان ہدایات کا مقصد مسلمانوں کو غیر مسلموں سے بلاوجہ کی ضد وکد یا مخالفت برائے مخالفت کی تعلیم دینا ہے، تو اس کی اس غلط فہمی کی اصلاح کے لئے پچھلے صفحات میں درج کی گئی وہ تفصیل کافی ہے جس میں غیر مسلموں کے ساتھ خیر میں تعاون اور ہمدردی وحسن سلوک کی بھرپور تعلیم دی گئی ہے۔

ہمارے علماء نے اس کی تصریح کی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ جنہوں نے اسی مسئلۂ تشبہ پر بڑی مفصل کتاب لکھی ہے (اور جس کے بارے میں بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس میں غیر مسلموں سے اختلاف کے اظہار پر مبالغہ آمیز تاکید کی گئی ہے، وہ بھی) لکھتے ہیں: ان احکام کی حکمت یہی ہے کہ ظاہری ہیئت میں کسی درجہ کی مشابہت سے فطری مناسبت وقربت پیدا ہوتی ہے، اور اسی سے غیر مسلموں کی ان چیزوں میں اشتراک کا

دروازہ کھلتا ہے جو ان کی ملّی خصوصیتیں ہیں اور جن میں وہ مسلمانوں سے الگ ہیں، اور یہیں سے مسلمانوں میں بڑا بگاڑ آتا ہے"۔

(لان المشابهة في بعض الهدى الظاهر يوجب المقاربة ونوعا من المناسبة، ويفضي الى المشاركة في خصائصهم التي انفردوا بها عن المسلمين..... وذلک يجر الى فساد عريض)[1]

یعنی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے نزدیک بھی غیر مسلموں سے تشبہ کی ممانعت کا جو حکم دیا گیا ہے اور احادیث نبویہ میں اس کے لئے "مخالفت کرنے" کے جو الفاظ اختیار کیے گئے ہیں، ان کی اصل حکمت یہی ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کی وہ چیزیں اختیار نہ کریں جو ان کی (مذہبی و معاشرتی) خصوصیتوں اور انفرادیتوں کی حیثیت رکھتی ہیں، اور جن میں وہ مسلمانوں سے بالکل الگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی چیزوں کو اختیار کرنے کا مطلب یہی ہے کہ قوم مرعوبیت کا شکار ہو چکی ہے، اور اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کی اسلامیت اور ان کی دینی و ملّی خصوصیات و امتیازات دھیرے دھیرے تحلیل ہو جائیں۔ اور وہ دوسروں میں ضم ہو کر قوموں میں گم ہو جائیں۔

کنز الدقائق میں ہے: اہل کتاب سے تشبہ ہر چیز میں منع نہیں ہے۔ ہمارا کھانا پینا انہی کی طرح ہے۔ تشبہ انہی چیزوں میں منع ہے جو حرام یا مذموم ہیں، یا جن میں نقالی یا ان جیسا بننے کی نیت کی جائے[2]۔ البحر الرائق اور ردالمحتار میں امام ابو یوسف سے بھی ایسا ہی نقل کیا گیا ہے[3]۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی ایک اور عبارت سے بھی اس حکیمانہ رہنمائی کی

---

1. الفتاوی الکبری لابن تیمیہ ۲/۷۱،منقول از ڈی وی ڈی المکتبۃ الشاملہ
2. اب ما یفسد الصلاۃ وما یکرہ
3. باب ما یفسد الصلاۃ وما یکرہ

حقیقت ومقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ اقتضاء الصراط المستقیم[1] میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں کو ظاہری طور طریقوں میں بھی غیر مسلموں سے اختلاف کے اظہار کا جو حکم دیا گیا اس کی حکمت بہت سے لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتی، اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ ظاہری طور طریقوں میں یکسانیت کا نتیجہ طبعی ومزاجی مناسبت کی شکل میں نکلتا ہے، اور پھر اس کا نتیجے میں اخلاق واعمال کی یکسانیت پیدا ضرور ہوتی ہے۔ یہ ایک محسوس حقیقت ہے۔ تجربہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ جو اہل علم (علماء) کا لباس اختیار کرتا ہے، اپنے اندر ان کی طرف میلان ضرور پانے لگتا ہے۔ فوجیوں کا ڈریس پہننے سے فوجیوں کی سی صفات عموماً پیدا ہونے لگتی ہیں، الا یہ کہ کوئی مانع ایسا پایا جائے جو ان صفات کو نہ پیدا ہونے دے"۔

یعنی "مخالفت اور مشابہت سے پرہیز نفرت وبغض پیدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے نظریاتی، اصولی اور اخلاقی تحفظ کے لئے ہے[2]۔

---

[1] (۹۳/۱)

[2] (۱) بلکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے ایک ایسی بات کہی ہے جو انہی جیسا حکمت شریعت کا راز داں کہہ سکتا ہے اور جو غالباً بہت سوں کے لئے حیران کن ہوگی۔

ابن تیمیہ نے ان احادیث کا تذکرہ کیا ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ابتدائی طرز عمل کا تذکرہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابتدائے ہجرت کے دور میں ان معاملات میں جن میں اسلامی شریعت کا کوئی حکم نہیں تھا، اہل کتاب کی موافقت اختیار کیا کرتے تھے، یہ دراصل دعوتی مصلحت کے بطور اس امید پر اختیار کیا گیا طرز عمل تھا کہ اہل کتاب مشترکہ دینی وراثت کی بنیاد پر قبول وتائید کا رویہ اختیار کرلیں۔ اس کے تذکرے کے بعد ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"اصل بات یہ ہے کہ غیر مسلموں سے امتیاز کے اظہار (مخالفت) کا حکم صرف دین کے ظہور وغلبہ کی حالت میں ہی ہے۔ جب مسلمان کمزور تھے اس وقت یہ حکم نہیں تھا"۔

اس کے بعد ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

یہ اس کتاب کی عبارت ہے جو تاریخ اسلام میں غیر مسلموں سے ممتاز و منفرد طرز وطور اختیار کرنے کی سب سے پرزور تاکید کرنے والی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کے مؤلف کا اس سلسلہ میں سب سے مضبوط موقف کہا جاتا ہے۔ اور جس میں یہ لکھا گیا ہے کہ: غیر مسلموں سے مخالفت کی حیثیت شریعت میں ایک فی نفسہ مطلوب چیز کی ہے"۔ (کم علم مصنف کو اس تعبیر سے اختلاف ہے، ہمارے نزدیک مخالفت فی نفسہ مطلوب نہیں، بلکہ اصل مقصود مرعوبیت ونقالی سے بچانا اور دینی واخلاقی امتیاز کی سرحدیں قائم کرنا ہے۔ اوپر کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ابن تیمیہؒ کی مراد بھی غالباً یہی ہے۔)۔

بہرحال اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کرنے سے جو منع کیا گیا ہے وہ محض ضداً ضداً قسم کی مخالفت برائے مخالفت کا حکم نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے مندرجہ ذیل حکمتیں ہیں:

(۱) اسلام کسی ملکی یا نسلی قومیت کا نام نہیں ہے، بلکہ بنی نوع انسان کی ہدایت واصلاح کا دین ہے۔ لہٰذا اس کا مطالبہ ہے کہ ہر ایمان والا اس دین کا یقین

"ومثل ذلك اليوم، لو ان المسلم بدار حرب، او دار كفر غير حرب، لم يكن ماموراً بالمخالفة لهم في هديهم الظاهر، لما عليه في ذلك من الضرر، بل قد يستحب للرجل أو يجب عليه، ان يشاركهم أحياناً في هديهم الظاهر، اذا كان في ذلك مصلحة دينية ...... ونحو ذلك من المقاصد الصالحة". (کتاب مذکور، ۱/۴۷۰)۔

واضح رہے کہ مشابہت کے جواز کی یہ رائے اسی صورت میں ہے جب کہ ایسا نہ کرنے میں منفی نتائج کا خطرہ ہو، یا دینی، نہ کہ دنیوی، مصالح کا تقاضہ ہو۔ ورنہ صرف دنیا کی عزت ومنصب یا مال ومنال کی خواہش سے اگر ایسا کیا جائے گا تو وہ بدستور ممنوع ہوگا۔

سے لبریز داعی ہونا چاہئے۔ اس لئے ان کو غیر مسلموں کی نقالی سے منع کیا گیا ہے (جن کے مسلک زندگی اور عقیدہ وفکر سے مسلمانوں کو شدید اختلاف ہے)۔ نقال مرعوب ہوتا ہے۔ اور مرعوبیت اپنے اصولوں کا قتل ہے۔

(۴) عبادت واخلاق بلکہ تہذیب ومعاشرت میں بھی ایک محسوس اور واضح فرق کی تعلیم اپنے عقیدہ ومسلک پر اعتماد کے اظہار کے مقصد سے دی گئی ہے۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ دنیا کی دیگر جماعتوں سے الگ قسم کی ایک جماعت ہیں، اور ان کو اپنی دینی خصوصیات اور مخصوص فکر ومزاج پر اصرار ہے۔

آخر میں ایک ضروری وضاحتی نکتہ کو ذہن میں تازہ کر لینے کی ضرورت ہے کہ یہ تعلیم قومی فخر وغرور کو غذا دینے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس کو اس تناظر Perspective میں دیکھیے کہ اسلام نے مسلمانوں کو دینی اصول اور اخلاقی ہدایات کا ایک مجموعہ دیا، ان کو بعض عقائد وحقائق پر ایمان لانے اور اس ایمان پر اپنی زندگی کی تشکیل کی تعلیم دی ہے۔ اور پھر اس کے بعد اس مخصوص قلبی ایمان ویقین، اور طرز زندگی کے تحفظ کے لئے دوسروں سے اختلاف کے اظہار کی یہ تعلیم دی ہے۔ انسان دوستی اور سارے ہی انسانوں سے ہمدردی کی جو تعلیم اسلام نے دی ہے اس پر فراخ دلانہ عمل کے ساتھ دوسری جماعتوں اور مختلف فکری واخلاقی تہذیبوں کے ساتھ اختلاط ومعاشرت اور معاملت کے نتیجہ میں اس کا حقیقی خطرہ یقیناً موجود ہے کہ اگر تحفظ کا خیال نہ رکھا جائے، تو مسلمان دھیرے دھیرے اپنی خصوصیات کھو کر قوموں میں رل مل جائیں گے۔ اور دنیا میں تہذیب وتمدن اور اخلاقیات کے ارتقا کی تاریخ کا ایک حصہ بن جائیں گے۔ حق کی ایک ابدی دعوت اپنے لیے اس خطرے سے تحفظ کا انتظام کیوں نہ کرے؟۔

فصل سوم

اسلام کے دشمنوں سے ساز باز ایمان کے منافی ہے مگر
اس کا مطلب سارے غیر مسلموں سے دشمنی نہیں

غیر مسلموں سے حسن تعلق اور انسانی رشتوں کی تعلیم کے ساتھ ہی قرآن نے شدید تاکید کی ہے کہ اسلام کے وہ دشمن جو اسلام کو مٹانے کے درپے ہوں، مسلمانوں سے جنگ کر رہے ہوں یا ان کے خلاف خطرناک سازشوں کے جال بن رہے ہیں ایسے دشمنوں سے سیاسی ساز باز رکھنا اور ان سے پینگیں بڑھانا نہ صرف ناجائز بلکہ ایمان کے منافی ہیں۔

اگر یہ دشمن طاقت ور ہوں تو بڑا خطرہ اس بات کا ہوتا ہے کہ کمزور عزم و ایمان کے مسلمان مفادات کی خاطر ان سے ساز باز کرنے لگیں۔ یا رشتہ داری اور دیگر سماجی رشتوں کے زیر اثر ان کی در پردہ مدد کرنے لگیں۔ یہ چیز دنیا کی کوئی جماعت برداشت نہیں کر سکتی۔ سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر سے اپنی ہی صفوں کے اندر ایسے لوگوں کا وجود آستین کے سانپ جیسی خطرناک چیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ خطرہ منافقین کی شکل میں بھرپور طور پر ظاہر ہوا۔ اس لئے اس سلسلے میں بڑے واضح اور تاکیدی احکام اترے کہ دشمنوں سے در پردہ ساز باز یا ان کی علانیہ حمایت و مدد ایمان کے قطعاً منافی

ہے۔اس سلسلے کی سب سے صاف اور سخت لہجہ کی آیات یہ اتریں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا
عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ
إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا
جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ
الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَن تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ
رَبِّكُمْ إِن كُنتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي
سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ
إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا
أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنتُمْ وَمَن يَفْعَلْهُ
مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۔
إِن يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً
وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ
وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ
تَكْفُرُونَ ○ (الممتحنۃ:۱-۲)

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو
''ولی'' مت بناؤ، تم ان سے محبت کے
رشتے قائم کرتے ہو، اور وہ اس حق کا جو
تمہارے پاس آیا ہے انکار کرتے ہیں۔
نکالتے ہیں اللہ کے رسول کو اور تم کو اپنے
گھروں سے صرف اس کی پاداش میں کہ
تم ایک اللہ پر ایمان لاتے ہو، اگر تم نے
میرے راستے میں جہاد کے لئے اور
میری رضا حاصل کرنے کے لئے ہجرت
کی ہے (تو ہرگز ان کو ولی و ہمدم نہ بناؤ)
تم چپکے چپکے ان سے محبت کے رشتے قائم
کرتے ہو۔ (خبردار) میں تمہارے
ڈھکے کھلے سب معاملات سے واقف
ہوں۔ اور تم میں جو ایسا کرے گا وہ
سیدھے راستے سے ہٹ گیا۔ یہ دشمن
ایسے ہیں کہ اگر وہ تم کو پاجائیں اور ان کا
بس چلے تو وہ دشمن ہی ثابت ہوں گے اور
تم پر حملے کرنے کے لئے ضرور زبان اور
دست درازی کریں گے۔ اور ان کی تمنا
یہ ہے کہ تم کو کافر بنا ڈالیں۔

یہ آیات مکہ کے ان دشمنان اسلام سے متعلق تھیں جو مکہ میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے ظالم دشمن تھے اور مسلمانوں کے جان و ایمان بچا کے مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد

بھی ان کے سینوں کے تنور میں دشمنی کی آگ شعلہ زن تھی۔

اسی طرح کی دوسری آیات میں اُن یہود دشمنوں سے ساز باز، مخفی روابط اور ان کی درپردہ مدد سے منع کیا گیا ہے جو مدینہ میں اسلام کے خلاف سازشوں میں لگے ہوئے تھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا	اے ایمان والو! اپنوں کو چھوڑ کر دوسروں کو
بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ	اپنا قریبی رازدار نہ بناؤ، وہ تمہاری تباہی
خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ	میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، ان کے منہ
الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا	سے دشمنی نکلی آرہی ہے۔ اور جو سینوں
تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ أَكْبَرُ	میں چھپا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

(آل عمران: ۱۱۸)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ	ایمان والے مومنین کے خلاف
أَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ	کافروں کو "ولی" نہ بنائیں، اور تم میں
يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ	سے جو ایسا کرے گا اللہ سے اس کا
شَيْءٍ (آل عمران: ۲۸)	کوئی رشتہ نہیں۔

<u>یہ اسلام کی سیاسی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم ہے، جس نے سیاست کو مکمل طور پر ایمان کے تابع بنا دیا ہے۔ اور ہمیشہ کے لیے طے کر دیا ہے کہ جس کی سیاست اس کے ایمان کے تابع نہیں اس کا ایمان کھوٹا ہے۔ افسوس کہ اس زمانہ میں اس کو صحیح طور سے سمجھنے والے اور اس پر مضبوطی سے عمل کرنے والے بہت کم ہیں۔</u>

بہت سوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ سیاست کے سمندر میں اسلام و کفر دونوں کے جہازوں پر بیک وقت سواری کر سکتے ہیں۔ ایک طرف وہ اسلام کا دم بھرتے ہیں، مسلمانوں کی ہمدردی بلکہ ان کی اجتماعی نمائندگی کے دعوے بھی کرتے ہیں، اور دوسری

طرف اسلام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والی طاقتوں سے پینگیں بھی بڑھاتے ہیں اور ان کے درباروں میں خلوص ووفا کی قسمیں بھی کھاتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے حامی ومددگار نہیں بلکہ سماج میں اپنے سیاسی آقاؤں کے مفادات کے نگراں ہوتے ہیں۔ ان کا کام ان آقاؤں کے ڈھول پیٹنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ انہی کے سہارے اپنے لئے عہدے، مناصب اور طاقت وناموری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ "یبتغون عندھم العزۃ"۔

ایک بڑی غلط فہمی:

اسلام کی ان تعلیمات کے بارے میں ایک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ مسلمان دعویٰ تو کرتے ہیں غیر مسلموں کے ساتھ پرامن بقاء باہم، ہمدردی اور حسن سلوک کا، مگر حقیقت اس کے خلاف ہے، اس لئے کہ قرآن نے مسلمانوں کو کافروں سے بے تعلقی کا حکم دیا ہے اور ان سے دوستی[1]

کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اس مغالطہ کی بنیاد دراصل دو غلط فہمیوں پر ہے:

۱— ولی کسے کہتے ہیں؟ اور "ولاء" کے جس تعلق سے منع کیا گیا ہے وہ کس قسم کا تعلق ہوتا ہے؟؟

۲— یہ کن کفار کے متعلق بات ہو رہی ہے؟ اس موقع پر یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ خود قرآن نے متعدد جگہ ایسی قیدیں لگائی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ احکام عام غیر مسلموں سے متعلق نہیں ہیں بلکہ کچھ خاص کفار سے متعلق ہیں۔ صرف قیدیں ہی نہیں بلکہ ایک اور جگہ پوری صراحت سے یہ بھی بتلا دیا ہے کہ جن لوگوں کے بارے میں یہ احکام دیئے گئے ہیں وہ غیر مسلموں میں سے کچھ خاص گروہ ہیں، باقی دوسرے

---

[1] "دوستی" یہ موالات اور ولی بنانے کا غلط ترجمہ ہے۔ ہم اس کا صحیح مفہوم آگے واضح کریں گے۔

افراد اور گروہ اس دائرۂ ''بے تعلقی و براءت'' میں نہیں آتے ہیں۔

پہلی غلطی:

اس سلسلے میں پہلی غلطی یہ ہوتی ہے کہ قرآن نے ان آیات میں کفار کو ''ولی'' بنانے سے منع کیا ہے (اولیاء اس کی جمع ہے) اس کو ''دوستی'' یا حسن تعلق کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان کے ''الولی'' یا اس کے مشتقات (Derivatives) کے لئے کوئی مفرد لفظ اردو بلکہ شاید انگریزی سمیت بہت سی زبانوں میں نہیں ملتا۔ اس لئے اس کا ترجمہ لوگ ''دوست'' اور "Friend" جیسے لفظ سے سے کر دیتے ہیں۔ اور یہی چیز اعتراضات کے تیر چلانے والوں کے ترکش کو سامان فراہم کرتی ہے۔

''ولی'' کے معنی ایسے قرب و تعلق[1]

کے ہیں جس کے ساتھ حمایت و مدد کرنا اور ساتھ دینا شامل ہو۔ لسان العرب میں جو عربی کی معتبر ترین لغت ہے لکھا ہے:

الولاية: النصرة. — ولایت کے معنی مدد کے ہیں۔

آگے ہے:

هم علي ولاية اي مجتمعون في النصرة — ان میں ولایت کا تعلق ہے، یعنی مل کر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

ابن منظور ابن الاعرابی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ: موالات یہ ہے کہ دو فریقوں میں اختلاف ہو، تو کوئی تیسرا ثالثی کے لئے داخل ہو اور اس کا میلان کسی ایک فریق کی طرف ہو، پھر وہ اس کی جانبداری کرے[2]۔ امام ابن جریر طبری جو لغت دانی میں ہمارے متقدم مفسرین میں اہم ترین مقام رکھتے ہیں، سورہ آل عمران کی آیت ۲۸ کی

---

[1] معجم مقاییس اللغۃ اور دیگر لغوی ماخذ میں اس لفظ کا بنیادی تصور قرب و تعلق بتایا گیا ہے۔

[2] لسان العرب: ۱۵/۴۰۵

تشریح میں کہتے ہیں:

ھذا نھی من اللہ عزوجل	اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے
المومنین ان یتخذوا الکفار	مؤمنین کو روکا گیا ہے کہ وہ کفار کو اپنا
أعواناً و انصاراً و ظھوراً	معین ومددگار اور پشت پناہ بنائیں
ومعنی ذالک: لا تتخذوا	......یعنی کہا گیا ہے کہ کفار کو پشت پناہ
الکفار ظھراً وانصاراً توالونھم	ومددگار سمجھ کر ان کے دین کے معاملہ
علی دینھم وتظاھرونھم علی	میں ان کا ساتھ مت دو کہ مسلمانوں
المسلمین من دون المومنین	اور مؤمنین کے خلاف ان کی مدد کرو اور
وتدلونھم علی عوراتھم.	مسلمانوں کے راز ان کو بتاؤ۔

سورہ توبہ کی آیت ۲۳ میں ''ولایۃ'' کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

المعروف فی کلام العرب من	کلام عرب میں ولی کے معروف معنی
معنی الولی انہ النصیر والمعین	مددگار اور اعانت کرنے والے کے ہیں

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ ان آیات کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ اہل ایمان کو منع کیا گیا ہے کہ وہ دشمنوں سے رازدارانہ پینگیں نہ بڑھائیں اور ان کی مخفی مدد نہ کریں۔ ان آیات کا کوئی تعلق دوستی یا اچھے سلوک سے نہیں ہے۔

اس مراد ومعنی کی مزید وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ قرآن نے خود جابجا اس صورت حال کی طرف اشارہ کر دیا کہ جس ''ولاء'' کے تعلق سے منع کیا جارہا ہے وہ ''من دون المومنین'' یعنی ''مؤمنین کے خلاف مدد'' کا تعلق تھا، (مثلاً سورہ آل عمران ۲۸۔ النساء ۱۳۹ اور ۱۴۴)۔ یہ ''مؤمنین کے خلاف'' کی قید خود بتارہی ہے کہ جن حالات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے ان میں مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمنوں کی مدد کی جارہی تھی۔

ان تعلیمات کا پس منظر:

ان آیات کا پس منظر (جو آیات کے اندر سے صاف جھلکتا ہے) یہ ہے کہ اسلام کے مخالفین شجرۂ اسلام کو اکھاڑ پھینکنے کی زبردست دشمنانہ مہموں میں مصروف ہیں۔ جنگوں کے سیلاب اُمڈ رہے ہیں۔ مشرکین کی علانیہ جنگوں کے ساتھ ساتھ مدینہ میں بسنے والے وہ یہودی قبائل جنہوں نے معاہدے کر رکھے ہیں وہ بھی سازشوں میں لگے ہیں۔ جنگوں کے علاوہ داخلی بدامنی پھیلانا، مسلمانوں میں قبائلی اور جاہلی عصبیت جگا کر اتحاد کو توڑنا، اسلام کو بدنام کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی اس سازش کے خاص اہداف ہیں۔ مسلمانوں میں دونوں ہی یعنی مشرکین مکہ اور یہود مدینہ کی رشتہ داریاں اور قرابتیں ہیں، دوستیاں ہیں، تعلقات اور معاملات ہیں۔ منافقین کے گروہ کی ہمدردیاں ان دشمنوں کے ساتھ ہیں۔ موقعہ بموقعہ وہ دشمنوں کی فساد انگیز سازشوں کے لئے بہترین ایجنٹ اور آلۂ کار ثابت ہو رہے ہیں۔

قرآن نے اس گروہ کی ان خطرناک سرگرمیوں کی پوری پردہ دری کی ہے۔ یہ سرگرمیاں کس خطرناک حد تک پہنچی ہوئی تھیں اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ۹ھ میں انہوں نے مسجد کے نام پر قبا میں اپنا ایک باقاعدہ مرکز بنالیا، قرآن نے اس مرکز کی سرگرمیوں کا پردہ چاک کیا کہ اس مرکز کا مقصد مسلم ریاست کو نقصان پہنچانا، کفر کرنا، مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا، اور باہر سے ایک دشمن فوج کو حملہ کرنے کی دعوت دینا اور اندر کی بغاوت کے ذریعہ اس کی اسٹریٹجک مدد کرنا تھا (سورہ توبہ آیت ۱۰۷)۔

ان خالص منافقین کے علاوہ ایک تعداد ایسے کمزور ایمان والوں کی بھی تھی جو حالات کے ہر نازک موڑ پر اپنی وفاداریوں کو لے کر دونوں طرف حاضری دیتے تھے۔ منافقین کا گروہ زیادہ تر یہود کے زیر اثر تھا، اور اس کی ان سے وفاداری کا یہ حال

تھا کہ ان دشمنوں کے ایجنڈے پر سرگرمی کے ساتھ کام کرتا تھا، اسی سلسلے میں "فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم (یعنی تم دیکھتے ہو دل کے روگی منافقوں کو کہ وہ ان یہودیوں میں تیزی سے دوڑ بھاگ کرتے ہیں، المائدہ ۵۲) کہہ کر قرآن نے ان کی ان ہی سرگرمیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایسے احکام دیتے وقت قرآن میں جا بجا یہ صورت حال صاف بیان کی گئی ہے۔ سورہ نساء میں ارشاد ہوتا ہے:

بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَاباً أَلِيماً. الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاء مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ العِزَّةَ لِلّهِ جَمِيعاً. وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللّهِ يُكَفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلاَ تَقْعُدُواْ مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُواْ فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذاً مِّثْلُهُمْ إِنَّ اللّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعاً). الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِن كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّهِ قَالُواْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ وَإِن كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُواْ أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُم مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاللّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَن يَجْعَلَ اللّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلاً. إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُواْ إِلَى الصَّلاَةِ قَامُواْ كُسَالَى يُرَآؤُونَ النَّاسَ وَلاَ يَذْكُرُونَ اللّهَ إِلاَّ قَلِيلاً. مُّذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَلِكَ لاَ إِلَى هَـؤُلاء وَلاَ إِلَى هَـؤُلاء وَمَن يُضْلِلِ اللّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلاً۔

(النساء: ۱۳۷-۱۴۱)

ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان منافقوں کو آگاہ کر دیں کہ انہوں نے اسلام کے دشمنوں سے جو مخفی تعلقات قائم کر رکھے ہیں، ان کی سزا کے طور پر وہ جہنم میں ڈالے جانے کے لئے تیار رہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہ منافقین مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا "ولی" بناتے ہیں، ان کا گمان یہ ہے کہ یہ ان کا

ساتھ دے کر عزت وغلبہ حاصل کرلیں گے؟ یہ جن کافر لیڈروں کی مجلسوں میں حاضری دیتے ہیں وہاں اسلام اور رسول اسلام کا مذاق اڑایا جاتا ہے، اور یہ وہاں خوشی خوشی بیٹھے رہتے ہیں۔ ان منافقوں کا یہ حال بھی بتلایا گیا ہے کہ یہ انتظار میں رہتے ہیں، نہ اِدھر پورے طور پر نہ اُدھر پورے طور پر، تاکہ اگر مسلمانوں کو فتح وغلبہ نصیب ہو تو آکر کہیں ہم تو آپ کے ساتھ ہیں، اور اگر کافروں کا پلہ بھاری رہے تو یہ ان کے پاس یہ کہتے ہوئے پہنچیں کہ "کیا ہم نے تمہاری مسلمانوں سے مدافعت کرنے میں کوئی کسر چھوڑی تھی؟"۔

یہ ہے موالاۃ الکفار، یعنی منافقوں کا وہ طرز عمل جس کو اختیار کرنے سے اس وقت منع کیا جارہا تھا۔

جیسا کہ اوپر اشارہ گذر چکا ہے کہ منافقین کا یہ گروہ سیاسی اور سماجی طور پر بری طرح یہودیوں کے زیر اثر تھا۔ اور ان کے ہر فتنہ انگیز پروپیگنڈے میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔ یہود کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیاسی طور پر نقصان پہنچانے کے لئے مستقل تہمتوں اور پروپیگنڈوں کے طوفان اٹھائے جاتے رہتے تھے۔ یہ منافقین اس جنگ کے ہر اول دستے ثابت ہوتے تھے۔ قرآن میں جابجا (مثلاً خصوصاً سورۂ احزاب اور سورۂ نور میں) اس صورت حال کی طرف اشارے ہیں۔ یہودی سردار اسلام کا مذاق اڑاتے، ان کی مجلسوں میں عوام مسلمان بھی حاضر ہوتے۔ عرب کے مشرکین بھی اس مہم میں تائید کرتے تھے۔ یہ یہود ومشرکین عام مسلمان لوگوں کو اس پر ابھارتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے باہر آجائیں اور بغاوت کردیں۔

اسی سلسلۂ بیان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس اسلام دشمن مہم کے دوران تم دیکھو گے کہ جن لوگوں کے دل روگی ہیں (نفاق کے مرض کے) وہ دوڑ دوڑ کر ان کفار سے

پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔

یہ ہے ولاء کا وہ منافقانہ تعلق جس کے بارے میں کہا گیا کہ مسلمان اپنے ان دشمنوں کے ساتھ ایسا تعلق ہرگز قائم نہ کریں جو ان کے دین کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تعلقات ایمان کے منافی ہونے کے علاوہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سیاسی اور سماجی طور پر نہایت خطرناک تھے۔ اس سے روکنا بہر حال ضروری تھا اور اب بھی ہے۔

مغالطے کی دوسری بنیاد:

اس مغالطے کی دوسری بنیاد یہ ہے اس تاکیدی تعلیم کو عام غیر مسلموں سے متعلق سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ، جیسا کہ گزشتہ آیات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حکم اسلام اور مسلمانوں کے ان دشمنوں کے سلسلے میں ہے، جو اسلام کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ مزید ذیل کی آیت پر غور کیجیے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو! اپنوں کو چھوڑ دوسروں کو
بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ	خاص رازدار مت بناؤ وہ تم کو نقصان
خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ	پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ان
الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي	کی بڑی خواہش ہے کہ تم برباد ہو جاؤ۔
صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ	ان کے منھ سے دشمنی نکلی آرہی ہے اور جو
الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ. هَا أَنتُمْ	سینہ میں چھپا ہے وہ اس سے بھی زیادہ
أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ	ہے۔ ہم نے تمہارے لئے اپنے احکام
وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا	کھول کر بیان کر دیے ہیں اگر تم عقل
لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا	سے کام لو۔ دیکھو! تم تو ان سے محبت
عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ	کر رہے ہو اور وہ تم سے دشمنی۔ تم تمام
قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ	آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہو، وہ تم

عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ.

آل عمران: ۱۱۸-۱۱۹)

سے جب ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ اور جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ مارے نفرت اور غصے کے انگلیاں چبانے لگیں۔ کہہ دو، تم اپنے غصہ میں مرجاؤ، اللہ سینوں کے بھید جانتا ہے۔ تم اچھے حال میں ہو تو ان کو برا لگتا ہے، اور نقصان پہنچے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی سازشیں تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔

ان آیات میں جن دشمنوں کا تذکرہ ہے ان کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ انکے سینوں میں دشمنی کی بھٹیاں ہیں۔ اور ان کی مجلسوں میں مسلمانوں کی بربادیوں کے منصوبے ہیں۔

یہاں جو "بطانة" کا لفظ بولا گیا ہے اس کے معنی ایسے خاص رازدار کے ہیں جو ہر معاملے میں دخیل ہو (لسان العرب)۔

ان احکام کی صحیح نوعیت وحقیقت اس سے واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہجرت کی نہایت رازدارانہ، نازک اور اہم مہم میں ایک غیر مسلم عبداللہ ابن ارقد کو شریک و رازدار ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے اوپر مکمل اعتماد بھی کیا۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان آیات کا مطلب دشمنوں کو رازدار اور اپنے معاملات میں دخیل بنانے سے روکنا ہے۔ یقیناً نفاق واغراض پرستی کے شکار نام کے مسلمانوں سے زیادہ

اعتماد کے لائق شریف اور اصول پسند غیر مسلم ہوتے ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے تاکیدی اور مکمل تعلیم سورۂ ممتحنہ میں دی گئی ہے۔ یہ آیات گذر چکی ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ان کے آہنگ و انداز پر غور کیجیے:

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّی وَعَدُوَّکُمْ أَوْلِیَاءَ تُلْقُونَ إِلَیْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ کَفَرُوا بِمَا جَاءَکُم مِّنَ الْحَقِّ یُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِیَّاکُمْ أَن تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّکُمْ إِن کُنتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِی سَبِیلِی وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِی تُسِرُّونَ إِلَیْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَیْتُمْ وَمَا أَعْلَنتُمْ وَمَن یَفْعَلْهُ مِنکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِیلِ. إِن یَثْقَفُوکُمْ یَکُونُوا لَکُمْ أَعْدَاءً وَیَبْسُطُوا إِلَیْکُمْ أَیْدِیَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَکْفُرُونَ ۝

(الممتحنۃ: ۱-۲)

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو "ولی" مت بناؤ، تم ان سے محبت کے رشتے قائم کرتے ہو، اور وہ اس حق کا جو تمہارے پاس آیا ہے انکار کرتے ہیں۔ نکالتے ہیں اللہ کے رسول کو اور تم کو اپنے گھروں سے صرف اس کی پاداش میں کہ تم ایک اللہ پر ایمان لاتے ہو، اگر تم نے میرے راستے میں جہاد کے لئے اور میری رضا حاصل کرنے کے لئے ہجرت کی ہے (تو ہرگز ان کو ولی و ہمدم نہ بناؤ) تم چپکے چپکے ان سے محبت کے رشتے قائم کرتے ہو۔ (خبردار) میں تمہارے ڈھکے کھلے سب معاملات سے واقف ہوں۔ اور تم میں جو ایسا کرے گا وہ سیدھے راستے سے ہٹ گیا۔ یہ دشمن ایسے ہیں کہ اگر وہ تم کو پا جائیں اور ان کا بس چلے تو وہ دشمن ہی ثابت ہوں گے اور تم پر حملے کرنے کے لئے ضرور زبان اور دست درازی کریں گے۔ اور ان کی تمنا یہ ہے کہ تم کو کافر بنا ڈالیں۔

"کفار کو اولیا بنانے" کی ممانعت کے سلسلے میں یہ قرآن کی سب سے شدید

آہنگ وانداز کی آیات ہیں۔مگر دیکھیے یہاں بھی عام غیر مسلموں کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ "عدوّی وعدوّکم" کہا گیا ہے۔کہا گیا ہے کہ یہ تمہارے ایسے دشمن ہیں جو تمہارے دین اور تمہارے خدا کے بھی دشمن ہیں۔اور ایسے دشمن کہ صرف دینی دشمنی میں تم کو تمہارے دیس سے نکال ڈالا۔

قرآن کی صراحت کہ یہ احکام کن لوگوں کے بارے میں ہیں:

مزید غور طلب ہے کہ اس موضوع پر قرآن کی ان سب سے سخت آیات میں،صراحت کے ساتھ یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ "کفار کو اولیاء بنانے" کی ممانعت کن "کفار" سے متعلق ہے،اور کون سے غیر مسلم ان آیات کے اطلاق سے باہر ہیں۔ یہاں بتا دیا گیا ہے کہ یہ ممانعت ان عام غیر مسلموں کے بارے میں نہیں ہے جو تمہارے ساتھ امن باہمی اور صلح کا رویہ رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ حکم صرف ان کے بارے میں ہے جو تمہارے دشمن ہیں دین کے سلسلے میں اور تم سے برسرپیکار ہیں۔

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. (الممتحنہ ۸-۹)

اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جنہوں نے دین کی وجہ سے تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تم کو اپنے گھروں سے نہیں نکالا ہے کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرو۔ اللہ کو انصاف کا معاملہ کرنے والے پسند ہیں۔ اللہ تو بس ان لوگوں کو ولی بنانے سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے جنگ کی ہے دین کی وجہ سے (یعنی وہ تمہارے دین کو مٹانا چاہتے ہیں)

اور تم کو تمہارے گھروں سے نکال دیا ہے اور تمہارے نکالے جانے
میں مدد کی ہے، کہ تم ان کو ولی و مددگار بناؤ۔ جو ان کو ولی و مددگار بنائیں
گے وہی ظلم کرنے والے ہیں۔

یہ آیت اس موضوع و مضمون کی ساری آیات کی قطعی وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے کہ قرآن میں جن "کفار" سے موالات کے تعلق کو منع کیا گیا ہے ان سے کس قسم کے لوگ مراد ہیں اور کس قسم کے نہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہوجاتا ہے کہ "ولاء" کے جس تعلق سے منع کیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اور یہ بھی صاف ہوجاتا ہے کہ وہ عام غیر مسلم جو مسلمانوں اور اسلام سے دشمنی نہیں رکھتے اور دشمنانہ کارروائیوں میں مصروف نہیں ہیں ان کا ان آیات میں کوئی ذکر نہیں۔

ایک غلو آمیز بات:

اس تفصیل سے اس غلو آمیز طرز فکر کی بھی نفی ہوجاتی ہے جو مختلف اہل علم کے یہاں نظر آتا ہے، ان کے مقام کے اعتراف کے باوجود یہ کہے بنا چارہ نہیں کہ انہوں نے ان آیات پر مجموعی نظر نہیں کی۔ مثلاً مشہور داعی توحید و مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب فرماتے ہیں:

ان الانسان لا یستقیم له اسلام ولو وحد الله وترک الشرک إلا بعداوة المشرکین[1]	کسی انسان کا اسلام اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتا چاہے وہ توحید کا قائل ہو اور شرک کو چھوڑ دے جب تک کہ وہ مشرکین سے دشمنی نہ رکھے۔

ایک معاصر سعودی عالم ڈاکٹر سہل بن رفاع العتیبی (استاذ العقیدۃ الاسلامیہ والمذاہب المعاصرۃ، جامعۃ الملک سعود ریاض) اپنے نزدیک اس کو ایک معتدل

---

[1] (بحوالہ: الولاء والبراء محمد بن سعید القحطانی ۱/۸)

موقف مانتے ہیں کہ "اسلام نے غیر مسلم سے محبت (مودت) کو حرام قرار دیا ہے مگر اس کے ساتھ نیکی و حسن سلوک کا حکم دیا ہے[1]"

ان حضرات کا استدلال ان دو آیتوں سے ہے:

(۱) لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ (المجادلة: ۲۲)

تم نہیں پاؤگے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے عناد اور دشمنی کرنے والوں سے محبت کا معاملہ کرتے ہیں، چاہے وہ ان کے باپ بیٹے یا بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔

(۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَن تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ (الممتحنة: ۱)

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو اپنا "ولی" نہ بناؤ کہ تم ان سے محبت کے رشتے رکھو اور وہ انکار و کفر کریں تمہارے پاس آنے والے حق کا، نکالتے ہیں تم کو (اپنے وطن سے) صرف اس وجہ سے کہ تم ایمان لائے اللہ اپنے رب پر۔

مگر ذرا سا غور کرنے سے اس استدلال کا بے محل ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ دونوں جگہ عام غیر مسلموں کی بات چل ہی نہیں رہی ہے۔ عناد، ظلم، اور جارحیت کے مرتکب دشمن

---

[1] دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حضرات پہلے تو مطلقاً غیر مسلم سے محبت کو حرام لکھتے ہیں، پھر انسانی رشتے سے طبعی و فطری محبت کی اجازت بھی دیتے ہیں۔ (کتاب مذکور ص ۸)۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حضرات بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ ایک غیر مسلم اپنے انسانی اور دیگر قومی یا نسلی رشتہ کی بنیاد پر فطری محبت و تکریم اور ہمدردی کا مستحق ہے، الا یہ کہ وہ اسلام دشمنی یا مسلمانوں سے لڑائی کی بنا پر بغض کا حق دار بنے۔ گویا اصل غلطی کم سے کم بڑی حد تک صرف تعبیر کی ہی ہے۔ (ملاحظہ ہو ان کی کتاب الفرق والبیان بین مودۃ الکافر والاحسان الیہ)

کی بات چل رہی ہے۔ پہلی آیت میں تصریح ہے کہ یہ ان لوگوں سے متعلق ہے جو اللہ اور رسول یعنی ان کے دین سے دشمنی اور جنگ کریں من حاد الله و رسوله کا یہی مطلب ہے۔ دوسری آیت میں بھی اللہ اور مسلمانوں کے دشمنوں کی اور جنگ وقتال کرنے والوں کی صراحت ہے۔ لفظی صراحت کے علاوہ سیاق کلام دونوں جگہ اس سلسلے میں اتنا صریح ہے کہ اس سے زیادہ صریح کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ان صراحتوں سے نظر نہ پھیری جائے تو بات واضح ہے۔

خود قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلا دیا ہے کہ:

قل لا اسالکم علیه اجراً إلا المودة في القربیٰ (الشوریٰ: ۲۳)	(کہہ دو! میں تم سے اس (دعوت) کا کوئی بدلہ نہیں مانگتا، مانگتا ہوں تو بس رشتہ داری کی محبت۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ سلم ان سے یک طرفہ محبت مانگتے تھے۔ اور معاذ اللہ اس کے بدلے میں رشتہ داری کی محبت دینے کے بجائے بغض وعداوت رکھتے تھے؟

اور کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حفاظت کرنے والے چچا ابوطالب سے نفرت اور دشمنی تھی؟ ہرگز نہیں! ابوطالب یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب چچا تھے۔

اس سے بالکل اتفاق ہے کہ اسلام وایمان کا بنیادی تقاضا شرک وکفر اور ان کے طریقہ وملت سے اختلاف اور ناپسندیدگی ہے۔ اور کسی مسلمان کے لئے اس کو برحق یا صحیح سمجھنا، یا معاذ اللہ اس سے محبت رکھنا قطعاً اسلام کے منافی ہے۔ مگر یہ بالکل دوسری بات ہے اور اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ہر غیر مسلم سے چاہے وہ صلح جو اور امن پسند ہو قومی یا عام انسانی رشتے کی محبت رکھنا منع ہو۔ بلکہ ان آیات ہی سے یہ بھی پتہ

چلتا ہے کہ جو امن وصلح پسند غیر مسلم تعدی وظلم کے مرتکب نہ ہوں ان کے ساتھ قرآن اچھے جذبات رکھنے، خیر خواہی کرنے اور بھلائی اور ہمدردی ومدد کا حکم دیتا ہے۔ اس کی ترغیب سورۂ ممتحنہ میں یہ کہہ کر دی گئی ہے کہ: ان اللہ یحب المقسطین" اللہ انصاف اور عدل کا معاملہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اوپر شیخ محمد بن عبدالوہاب کی جو عبارت ذکر کی گئی ہے اور جس میں اس ہیچ مداں کو غلو نظر آتا ہے، اس جیسی تعبیر دوسرے نہایت قابل احترام ومحبت عالم وداعی شیخ عبدالعزیز ابن بازؒ کے ایک مقالے میں بھی نظر آئی ہے۔ یہ مقالہ دراصل سابق شیخ الازہر شیخ جادالحق علی جادالحق کے ایک مقالے پر استدراک کے مقصد سے خط کے بطور لکھا گیا تھا۔ شیخ الازہر کے مقالے میں واقعۂ اسلام اور دیگر ادیان کے درمیان باہمی تعاون واتفاق، بلکہ اشتراک تک کی بات کہی گئی تھی۔ شیخ الازہر کی عبارت پڑھیے:

فنظرة المسلمین اذن الی غیرهم من اتباع الیهودیة و النصرانیة هی نظرة الشریک الی شرکائه فی الایمان بالله والعمل بالرسالة الإلٰهیة التی لا تختلف فی اصولها العامة.

مسلمان یہودیت اور نصرانیت کے متبعین کو ایمان باللہ اور آسمانی دین میں شریک کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کے درمیان اس آسمانی پیغام کے عام اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

استغفر اللہ۔ یہ یقیناً واقعہ کے خلاف بات تھی، غیر مسلموں کے ساتھ ہر خیر میں تعاون، اور ہمدردی وحسن سلوک کے باوجود دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام اپنے اختلاف کو چھپانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس وقت یہود اور نصاریٰ کا دین بنیادی طور پر کفر ہے، نہ کہ اسلام کے ساتھ بنیادی اصولوں میں مشترک پیغام۔ شیخ ابن بازؒ نے اس پر استدراک کیا، مگر اس میں ایک غلو آمیز بات (ہمارے نزدیک غلو آمیز بات) کہہ گئے۔ تحریر فرماتے ہیں:

ان اللہ سبحانہ قد اوجب علی المومنین بغض الکفار ومعاداتهم و علم مودتهم[1]

یقیناً اللہ نے اہل ایمان پر کفار سے بغض و دشمنی ضروری قرار دی ہے، اور یہ کہ ان سے محبت نہ رکھی جائے۔

بہر حال مسئلہ کی یہ تعبیر اس اطلاق کے ساتھ غلط ہے۔ قرآن میں اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ اس کے خلاف دلیل موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان غلو آمیز تعبیرات کی اصلاح کی جائے۔

مسلمانوں کا اصل ولی صرف مخلص اہل ایمان کو ہونا چاہیے:

دراصل اسلام یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جو اللہ کا بندہ انبیاء علیہم السلام کے دین کو برحق جان کر قبول کرے، اور یہ یقین کرے کہ وہی ایک حق کا راستہ ہے جس میں ساری انسانیت کی دنیا اور آخرت میں فلاح ہے، تو اسلام کا اس سے بنیادی مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس حق کے فروغ کے لیے اپنے تن من دھن کو لگانے کا تہیہ کرلے، اور اسی کو اپنا اصل مشن بنالے۔ انسان جب کسی مقصد کو اپنی زندگی کا مشن بنالیتا ہے اور اس کا عشق اس پر چھا جاتا ہے تو اس کا اپنے مشن کے ساتھیوں سے ایک خاص قسم کا تعاون اور مدد گاری کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ محبت اور حسن سلوک تو سب سے کرتا ہے مگر یگانگت اور دمسازی و ہمسازی کا جو تعلق اپنے مشن کے مخلص اور وفادار ساتھیوں سے اس کو ہوتا ہے وہ کسی اور سے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ مسئلہ اس کے لیے کسی تعلیم و تلقین کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ اس کے مشن کا فطری تقاضہ اور اس کے دل کی اندر کی آواز ہوتا ہے۔

مسلمانوں سے بھی اسلام کا اصل مطالبہ یہی ہے کہ وہ ایمان اور مشنری جذبے

---

[1] مجموع فتاویٰ ومقالات ۹۱/۸

میں ایسے ہوں کہ ان کا مخلصانہ جدوجہد میں شرکت کا تعلق ان مخلص اہل ایمان سے ہونا چاہیے جو اسلام اور ایمان کی راہ کے مردمیدان ہوں۔

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِيْنَ	تمہارے ولی تو بس اللہ، اس کا رسول اور
آمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ	وہ (حقیقی) ایمان والے ہیں جو نماز قائم
وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْن	کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو
(المائدة: ۵۵)	(اللہ کے سامنے) جھکے رہتے ہیں۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم قومیت اور گروہ بندی سے کس قدر دور ہے! اس نے عام مسلمانوں تک کو اس ولایت کا مستحق نہیں قرار دیا ہے بلکہ تعلیم دی ہے کہ کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ ایک مسلمان کا یہ ولاء کا تعلق مخلص اور سچے اہل ایمان کے ساتھ ہی ہو۔ ایک اور جگہ اور واضح ہو کر یہ پہلو آ گیا ہے اور صاف کہا گیا ہے کہ ایمان و اسلام کی راہ میں جدوجہد اور ہجرت و نصرت کی قربانیوں کی راہ میں جو لوگ شریک ہیں وہی تمہارے حقیقی اولیاء ہیں، اور جو لوگ اس درجے کے نہیں وہ نہیں ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا	جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے
وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ	ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں مال
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ آوَوْا وَّنَصَرُوْا	اور جان سے مجاہدے اور محنتیں کیں، اور
أُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ	جن لوگوں نے ان کو (اپنے گھروں
وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا	میں) بسایا اور ان کی مدد کی (یعنی
لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ	انصار) یہ لوگ باہم ایک دوسرے کے
(الانفال: ۷۲)	ولی ہیں۔ اور جن لوگوں نے ہجرت نہیں
	کی تمہارا ان کے ساتھ "ولایت" کا
	کوئی تعلق نہیں۔

الحمدللہ، امید ہے کہ اس تفصیل کے ذریعے اسلام کی ایک اہم تعلیم جس پر براہ راست ایمان اور اللہ ورسول کے ساتھ خلوص ووفا کے رشتے کا دارومدار ہے پورے طور پر سامنے آگئی ہوگی۔ اور بحمد اللہ یہ بھی امید ہے کہ اس سلسلے میں جو شبہے اور اشکالات ذہنوں میں آتے ہیں اور جنہیں اس زمانے کے مخصوص حالات نے بہت بڑھادیا ہے، ان کی بھی پوری اطمینان بخش وضاحت ہوگئی ہوگی۔